نور محل

هیرلڈ لیم

ترجمہ : شبلی ایم کام / حکیم حبیب اشعر دہلوی

نورمحل

ہیرلڈلیم

ترجمہ : شبلی ایم کام/ حکیم حبیب اشعر دہلوی

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور

This is an Urdu Translation of

NUR MAHAL by Harold Lamb

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = نور محل
مصنف = ہیرلڈ لیم
مترجم = شبلی ایم۔ کام / حکیم حبیب اشعر دہلوی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ' لاہور
فون :7249218, 7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹرز = پریمیر پرنٹرز' لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1997ء
قیمت = -/160 روپے

فہرست

ایشیاء کے دو عظیم پرستاران محبت	5
عرض مصنف	7
نور محل کی کہانی	263
نور محل کی شب سواریاں	268
شعر و شاعری	270
نور محل کی حوصلہ مندی	272
تاخذ و شواہد	276
حوالہ جات	280

ایشیا کے دو عظیم پرستاران محبت

جہانگیر اور نور محل (نور جہاں) کا شمار دنیا کے عظیم ترین عشاق میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانوی زندگی انطونی اور قلوبطرہ اور ابیلارڈ اور ہیلوئی کی تاریخی داستانوں کے ہم قدم ہے' لیکن ابھی تک جدید انگریزی ادب میں اس کا تذکرہ نہیں آیا۔

تیمور اور چنگیز خان پر مطالعے کے دوران میں ہیرلڈلیم کو نور محل کی ذات میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہوئی۔ وہ حسین و جمیل ایرانی لڑکی جو صحرا میں پیدا ہوئی اور سلطنت مغلیہ کے عین عروج کے زمانے میں' اس کی بے تاج فرماں روا بن گئی۔ وہ شہزادہ سلیم کی سب سے پہلی محبوبہ تھی۔

شہنشاہ اکبر کے حکم سے' وہ بہت دور بھیج دی گئی تھی اور جہانگیر سے اس کی دوبارہ ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ادھیڑ عمر کا مطلق العنان فرماں روا تھا' جسے شراب اور دوسری منشیات کا استعمال اور جسمانی قوت اور تن آسانی نے عشرت کار بنا دیا تھا۔

حرم سرائے شاہی کی رقابتوں اور دربار کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک طرف اس نے جہانگیر کے سال خوردہ جسم میں زندگی کا آخری شعلہ روشن رکھا اور دوسری طرف وہ اس کے نام پر سلطنت کا کاروبار چلاتی رہی۔

"نور محل" اسی خاتون کی تاریخی سرگزشت ہے "جو صلیبی جنگوں" کے مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے۔

ظہور احمد خاں
رانا عبدالرحمٰن

عرض مصنف

اس کتاب میں نور محل کی تاریخی داستان پیش کی گئی ہے۔ یہ تاریخ یا سوانح حیات نہیں کیونکہ جس عورت کی ساری عمر پردے میں گزری ہو' اس کی زندگی' نام جیسی چیزوں سے زیادہ' محققین کی کتابوں میں بار نہیں پا سکتی۔

تاہم جہاں تک ایک فرد واحد کے بس کی بات تھی اس قصے کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نور محل کی زندگی تین مغل شہنشاہوں کے عہد حکومت پر پھیلی ہوئی ہے۔ کہانی کے اہم کردار اور بڑے واقعات بھی تاریخی ہیں۔

بایں ہمہ اگر نور محل کی شخصیت' اس کی زندگی کے کارناموں سے زیادہ جاذب توجہ دکھائی دے تو اسے ایران کی اس ساحرہ جمال کی ذاتی کشش پر محمول کرنا چاہئے۔ جس نے تین سو برس قبل ایک بادشاہ کے نام پر حکومت کی۔

اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تالیف دراصل اس سکوت میں سے جو پردہ نشین خواتین کی زندگیوں کے ارد گرد طاری رہتا ہے' ایک ہنستی بولتی عورت کو ڈھونڈ کر لانے کی ایک کوشش ہے۔

ہیرلڈ لیم

(۱)

۱۶۰۵ء کی بات ہے!

معلوم ہوتا ہے: یہ دور تحقیق و تلاش کا دور تھا۔ تشنج کے دوروں نے ملکہ انگلستان الزبتھ کاست نکال دیا تھا اور کچھ ہی دنوں پہلے وہ فرش پر تڑپ تڑپ کے جان دے چکی تھی۔ شیکسپیئر ہنوز لکھنے لکھانے میں مصروف تھا اور اس زمانے میں انطونی اور قلوبطرہ کے ڈرامے کا مسودہ مکمل کر رہا تھا۔

عظیم ہسپانوی سلطنت نئی دنیا میں میکسیکو اور پیرو کی فتح اور آرمیڈا کی تباہی کے بعد' فلپ دوم کی حکومت کے عہد زریں سے گزر چکی تھی------ دور' مشرقی جانب' زاروں کی سلطنت اپنے برفانی جنگلوں کے حصار میں' دنیا سے الگ تھلگ------ بلند حوصلہ بوریس گارونوف کی فرماں روائی سے شمر اندوز ہو چکی تھی' جو اس وقت بستر مرگ پر اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہا تھا۔

مہم پسند بحری بیڑے' شمالی اور جنوبی امریکہ کے ساحلوں پر نئی نئی بستیاں بسا رہے تھے' دو چھوٹے بادبانی جہاز کرہ ارض کا طواف کر چکے تھے اور برسوں کی غیر حاضری کے بعد' اپنے ساتھ نہ صرف مال غنیمت' بلکہ ایسی شگفت آمیز کہانیاں بھی لائے تھے' جنہوں نے مسیحی دنیا کے بچے کھچے متشککین پر بھی ثابت کر دیا تھا کہ زمین واقعی گول ہے اور مشرق کے غیر متعارف گوشوں میں ایسے ایسے عجائب و نوادر پائے جاتے ہیں۔ جو کبھی فلسفیوں کے خواب خیال میں بھی نہ آئے ہوں گے۔

ان عجائب و نوادر میں سب سے بڑا عجوبہ عظیم مغلوں کی سلطنت تھی!

بعض سیاح اسے "انڈیا" کہتے تھے۔ یورپی ممالک کے مقابلے میں یہ سلطنت اتنی وسیع تھی کہ دور دور کی منزلیں مارنے والے پرتگیز پادری بھی اس کے پھیلاؤ کا دھندلا ہی سا خاکہ پیش کر سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ مغرب میں اس کی حدیں' بلوچستان کے صحراؤں اور افغانستان کی پہاڑیوں کو پھاند گئی ہیں اور شمال میں وہ وسط ایشاء کی سطح مرتفع کے ان علاقوں

تک پھیلی ہوئی ہے' جن سے انسان کے قدم آشنا ہو سکے ہیں۔ اس سلطنت میں کشمیر کی جنت ارضی بھی شامل ہے' جو ہمالیہ کی تاریکیوں سے ہوتی ہوئی ان برف پوش پہاڑوں تک چلی گئی ہے' جنہیں ضعیف الاعتقاد لوگ متبرک سمجھتے ہیں اور اس نے گنگ جمن کے ڈیلٹا کو پار کرکے برما کے دور دراز جنگل تک اپنے پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔

ایشیا کا یہ شمالی خطہ' اپنے دارالحکومت لاہور سمیت' گویا سلطنت مغلیہ کا دل تھا۔

یہی نہیں' یہ سلطنت' جنوب کی سمت بھی ایک ہزار میل تک یا اس کے قریب قریب وسیع تھی' جو مغلوں کے پایہ تخت آگرہ اور راجپوتانے کی پہاڑیوں کو پائے سپر کرتی ہوئی اس زور آور جزیرہ نما کے زیریں کنارے------ ہند قدیم----- پر تمام ہوتی تھی۔

یہ تھا سیاحوں کا بیان اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ سلطنت مغلیہ ایک درجن مختلف قوموں پر مشتمل تھی' جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتی اور پیغمبر اسلام کے خدائے واحد سے لے کر لکڑی اور پتھر کے ہزاروں سال پرانے دیوتاؤں تک ہر چیز کی پرستش کرتی تھیں۔ ان کے قول کے مطابق سلطنت مغلیہ کی آبادی دس کروڑ تھی اور سارے ایشیاء کی دولت سمٹ سمٹا کر مغل اعظم کے دربار میں جمع ہو گئی تھی' جس کی طرف یورپ کے تاجروں کی نگاہیں اٹھنے لگی تھیں۔

اس کے باوجود ہندوستان مسیحی دنیا کے معاملات سے بے پروا تھا۔ وہ مغرب کے لوگوں کو صرف وحشی جہازرانوں کی حیثیت سے جانتا تھا' جو کپڑے کے تاجروں اور سیاہ عباؤں میں ملبوس پادریوں کو اس کی مختلف بندرگاہوں پر اتارتے تھے۔ سمندر کے رستے آنے والے یہ لوگ پہلے صرف پرتگالی تھے' جو بڑے زیرک اور تھوڑے بہت قابل فہم تھے لیکن اب انگریزی جہازوں نے بھی اس طرف آنا شروع کر دیا تھا۔

۱۶۰۵ء میں جہانگیر نے تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اس کا تخت' سنگ سیاہ کا تھا' جس پر ایک عجیب سرخی مائل دھبا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ دھبا ماضی کی خوں ریزیوں کی یادگار ہے۔ بالآخر شہنشاہ بن کر اسے خوشی ہوئی۔ فرماں روائی ایک نیا تفریحی مشغلہ ہو گا اور نئے نئے کھلونوں پر جہاں گیر کی جان جاتی تھی۔ زندگی کو سنجیدگی سے بسر کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

اس کا ڈیل بھاری اور اعضاء طویل تھے۔ چہرے سے آرام طلبی جھلکتی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی' آنکھیں سیاہ اور گہری۔ اپنے کشادہ جسم سے وہ ایک نفیس پرست انسان معلوم

ہوتا تھا۔ اس عظمت و جلال کا اس میں ادنیٰ شائبہ تک نہ تھا' جس سے اس کی ذات متصف کی جاتی تھی۔ کیا وہ ظل الٰہی' حامئ دین مبین' شہنشاہ دادگستر اور فاتح عالم نہیں تھا۔

اس کے علاوہ اس کے آباواجداد فاتح تھے۔ پہلا مغل اعظم' چنگیز خان تھا' جس کی تلوار نے نصف سے زائد ایشیا کو مطیع و مسخر کر لیا تھا۔ اس کے بعد تیمورلنگ نے----- جسے مغل' تیمور اعظم کہتے تھے------ اپنی سلطنت سمرقند کے ارد گرد تعمیر کی۔ اسی تیموری نسل کا ایک سپوت : بابر' سمرقند سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا۔ پہاڑوں سے گزر کر ہندوستان پہنچا۔ شہنشاہ بن گیا۔

جہاں گیر نے "تزک بابری" پڑھ کر اسے بہت پسند کیا تھا۔ اس کا پردادا ایک غیر معمولی انسان تھا' جو اپنی دونوں بغلوں میں ایک ایک آدمی کو دبا کر قلعے کی فصیل پر دوڑ سکتا تھا اور اس شان کا بلانوش تھا کہ مختلف قسم کی تیز شرابیں ملا کر رات رات بھر پیتا رہتا اور ذرا نہ بہکتا۔ وہ شعر کا بھی بہت اچھا نقاد تھا۔ جہاں گیر اس کی ان تمام خوبیوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔

اپنے دادا : ہمایوں میں جہاں گیر کو نسبتاً کم جاذبیت نظر آئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمایوں ایک نئی سلطنت کی شیرازہ بندی میں مصروف رہا تھا۔ اس کے علاوہ نفیس و نادر شرابوں کے بجائے اس نے اپنے لئے افیون پسند کی تھی۔

البتہ خود اس کا باپ : اکبر واقعی عدیم المثال خوبیوں کا جامع تھا۔ وہ غیر معمولی ذاتی جوہر رکھتا تھا' جسے نصف درجن دماغوں کا کام کرنے کے لئے چوبیس(۲۴) گھنٹوں میں' تین گھنٹے سے زیادہ سونے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ اس کے متعلق جہاں گیر کہا کرتا تھا کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے وہ اس دنیا کے انسانوں سے مختلف تھا۔

اکبر نے سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا تھا۔ اسے وسعت دی تھی اور فیل بانی سے لے کر باغ بانی تک ہر کام کے لئے قاعدے اور قانون بنا دیئے تھے' جو چیز اس کے مشاہدے میں آئی' وہ اسے خود جانچتا پرکھتا : یہاں تک کہ اس نے تمباکو اور تصوف کا بھی تجربہ کیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری چند سال' نسوانی خلوتوں سے کنارہ کش ہو کر' تجرد میں گزارے تھے اور اپنا ایک الگ مذہب------ دین الٰہی------ ایجاد کیا تھا۔ اس نے اپنے منگول آباواجداد کی توانائی برقرار رکھتے ہوئے ہندو ذہانت و فراست کو اپنا لیا تھا۔

اس کے عہد میں ہندوستان کی گرمی نے وحشی فاتح کی قوت برداشت کو ہنوز ختم نہیں کیا تھا۔

جسمانی طاقت اور ذوق نشہ و رنگ اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا اور تن آسانی و عشرت پسندی اپنی راجپوت ماں سے! وہ دودمان مغلیہ کا پہلا تاج ور تھا' جو حرم سرائے شاہی میں پروان چڑھا تھا۔ اسے نہ کسی زندگی کی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا تھا' نہ جنگ کی ہلاک خیزیوں سے۔ اپنی پیدائش کے وقت ہی سے وہ تسلیم شدہ وارث تخت تھا۔ جب اکبر کے وزیراعظم نے اس کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا' تو جہاں گیر نے اسے قتل کروا دیا۔ ایک بار اس نے اپنے باپ کو زہر دینے کی سازش کی لیکن کچھ دن کی ہچکچاہٹ کے بعد آخر بغاوت پر قانع ہو گیا۔ اکبر نے حکمت عملی سے کام لے کر اپنے لخت جگر کو رام کر لیا۔ تنہائی میں اس کے منہ پر طمانچہ مارا کہ وہ کیوں فریب کھا گیا اور دس دن تک اس کی افیون اس لئے بند رکھی کہ وہ اپنی ناخلفی پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکے۔ اکبر کو اپنے بے راہ رو لڑکے سے ہمیشہ دلی محبت رہی۔

اکبر کے آسودہ لحد ہو جانے کے بعد جہاں گیر تخت پر بیٹھا اور یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے باپ نے حکومت کو اس قدر منظم اور مستحکم کر دیا ہے کہ اس پر اب مزید توجہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اس نے ایک شہنشاہ کی حیثیت سے زندگی کی طرب افزائیوں سے لطف اندوز ہونے کا خوش گوار کام شروع کر دیا۔ اس تلاش میں اسے اپنے اسلاف کی جسمانی توانائی اور ایک لذتیت پسند فلسفی کی نکتہ چینی سی حاصل تھی۔

تاج شاہی سر پر رکھنے کے بعد اس کا غالباً سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے ایک "زنجیر عدل" لٹکانے کا حکم دیا۔ اس مقصد کے لئے آگرہ کے قلعے کی دیوار کے قریب' دریا کے کنارے لکڑی کا ایک کھمبا گاڑا گیا' کھمبے کے سہارے ایک سنہری زنجیر محل کے ایک دریچے تک لٹکائی گئی اور زنجیر کے سرے پر طلائی گھنٹیوں کا ایک گچھا باندھ کر' شبستان جہاں گیری کے قریب' آویزاں کر دیا گیا' جہاں گیر نے اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص فریاد کرنی چاہے' تو وہ بیرونی زنجیر کھینچ کر اس کے حضور گھنٹیاں بجا دے۔ بظاہر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی' لیکن جہاں گیر اس خود بینی پر مسرور تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کا ایک بہت ستھرا احساس رکھتا تھا۔

تخت نشینی کے بعد، چھ سال تک وہ مختلف مشغلوں کے تجربے کرتا رہا۔ اس میں صرف اس کے بڑے لڑکے کی مختصر بغاوت سے خلل پڑا۔ اس کی بیشتر توجہ شاہد و شکار نے جذب کر لی تھی، اگرچہ وہ قیمتی پتھروں، بالخصوص یاقوت جمع کرنے کا بے انتہا شوقین تھا اور شعرگوئی سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی۔ اپنے عہد حکومت کے شروع ہی سے اس نے اپنی آپ بیتی خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔

۲۱ مارچ ۱۶۱۱ء کو عین جشن نوروز کے دن، اس نے حکمراں برادری کے ایک اور رکن: ایران کے شاہ عباس کا تہنیتی خط سن کر اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا:

"..... اعلیٰ حضرت، فلک مرتبت، خورشید منزلت، بادشاہ جواں بخت، کیواں وقار، شہریار، نام دار، سپہراقتدار، خدیو جہاں گیر کشور کشا، خسرو سکندر شکوہ دارالو، مسند نشین بارگاہ عظمت و جلال، صاحب سریر اقلیم دولت و اقبال، نزہت افزائے ریاض کامرانی، چمن آرائے گلشن صاحبقرانی، چہرہ کشائے جمال جہاں بانی، مبین رموز آسمانی، زیور چہرہ دانش و بینش، فہرست کتاب آفرینش، مجموعہ کمالات انسانی، مرات تجلیات یزدانی....."

جہاں گیر نے خیال کیا کہ شاہ کے درباری منشی، انشا پردازی کا بہت عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ خود پسند نہیں تھا بلکہ تعریف کو ایک معمول سمجھ کر قبول کر لیتا تھا۔

بہار کے پہلے دن اور صبح نوروز کی طویل ساعتوں میں، وہ ان راحتوں کے تصور سے لذت اندوز ہو رہا تھا، جو شام کو حاصل ہوں گی۔ قیصر شاہی کے باغ میں عورتیں جشن منائیں گی اور اس میں جہاں گیر، ہندوستان کے شہنشاہ کی حیثیت سے نہیں، سیر و تفریح کے ایک رسیا کی حیثیت سے شامل ہو گا۔

یہ شمعیں روشن کرنے کا وقت تھا، دریا کے کنارے، صاف آسمان پر چاند ابھر رہا تھا، ریتلے میدان سے گرم ہوا کا ایک جھونکا، باڑھوں کی قنات سے گزرتا ہوا، دریا کے کنارے، باغ میں آیا۔ تنومند افغان قلما قنیاں نیمچے اور ڈھالیں لئے، ایک عجیب شان بے نیازی سے باڑھ کے کنارے کنارے کھڑی تھیں اور ان عارضی دوکانوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں، جن پر نارنگی کے پھول اور انار کے غنچے لٹکے ہوئے تھے، پھلوں کے درختوں پر رنگین قندیلیں ٹمٹما رہی تھیں سبزہ زار پر قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر کنیزیں اٹھکیلیاں کرتی

پھر رہی تھیں۔

قہقہوں کی لہریں اور دھیمی اور نرم سرگوشیوں کی آوازیں ایک دوکان سے دوسری دوکان میں سرسرا رہی تھیں۔ امراء کی بیویاں اور بیٹیاں' نقاب کے بغیر' وہاں ایک مینا بازار لگائے' چند گھنٹوں کے لئے جمع ہوئی تھیں۔ ان کے پاس زر دوزی کے جوڑے اور ہیرے جواہرات رکھے تھے۔ اس بیش قیمت لمحے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنے رتبے اور حیثیت کو فراموش کر دیا تھا اور اس سے بے پروا ہو کر کہ ان کے خدام ان کی باتیں سن لیں گے' آزادی کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھیں۔

محل کے تاریک حصے سے' جو دور تک پھیلا ہوا تھا' موسیقی کی دل دوز آواز آ رہی تھی' شاہی بیگمات' محل سرا سے نکل کر باغ میں مٹر گشت کرنے لگیں۔ ان کی نظریں عمدہ لباس اور امیر زادیوں کے طور طریق کا بڑی تیزی سے جائزہ لیتی تھیں' اس وقت بھی حسب معمول وہ سودا خریدنے کے لئے مول تول کا بہانہ کرتی تھیں۔

"یہ بازو بند میں تحفہ دینے کے لئے خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس روپے بہت کم ہیں۔"

یہ الفاظ ایک ایسی خاتون نے کہے تھے' جو چاہتی تو پورے قالین کو اشرفیوں سے ڈھک دیتی۔

"اور میں نے جو قیمت بتائی ہے' وہ بھی بہت کم ہے' میں نے آپ' اس کے چالیس روپے ادا کئے ہیں' ذرا یہ موتی دیکھئے : رنگ بالکل مل گیا ہے اور چاندی پر ملمع کیا گیا ہے۔"

دوکان والی نے الفاظ میں جواب دیا' جس کی نقرئی پالکی باہر کے صحن میں کھڑی تھی۔

"کیا میں اتنی گئی گزری ہوں کہ ایسی چیزوں کی صحیح قیمت بھی نہ انک سکوں میں تمہیں اس کے بارہ روپے دے دوں گی!"

"نوج! چونکہ آپ اسے تحفہ میں دینے کے لئے خرید رہی ہیں اس لئے میں اس کی قیمت پینتیس روپے کر دوں گی!"

"پھر تو میں ٹوٹی محراب کے نیچے احمد بخاری کی دکان سے' اس سے اچھا بازو بند خرید لوں گی۔ اس کے موتی بھی سچے ہوں گے اور قیمت بھی کم۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا' کیونکہ کسی عالی نسب خاتون نے اپنی زندگی میں آج تک آگرے

کے بازار میں قدم نہیں رکھا تھا۔ البتہ ان سب نے احمد جوہری کا نام سن رکھا تھا۔

"اس کے علاوہ آپ کو معلوم ہو گا' اس کی چاندی دراصل جست ہے۔ ذرا بازو بند پر یہ نشان ملاحظہ کیجئے۔ بلند آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے اچھا تو میں اس کی قیمت، آپ سے تیس روپے لے لوں گی۔"

"منہ دھو کر آؤ!"

مہمان اور محل سرائے شاہی کی خاتون میں یہ مول تول جاری رہا' یہاں تک کہ بائیس روپے میں سودا طے ہو گیا۔

بیچنے والی نے جب اس سودے میں حلاوت پیدا کرنے کے لئے "بخشیش" مانگی اور کھرا کھوٹا دیکھنے کے لئے سکوں پر نظر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ سودا کتنے نفع کا رہا ہے۔ خریدار کے نوکروں نے اسے چاندی کے بجائے سونے کے سکے دیئے تھے۔

ایک ایک پائی کے لئے مول تول کرنا پھر قیمت زیادہ دے دینا! یہ تھی اس بازار کی روح' جب ایک نازک بدن راجپوتنی نے' جس کا دعوی تھا کہ اس کی رگوں میں اس صدی کا خالص راجپوت خون ہے' بازار کی اس خوبی کو' تلاتے ہوئے' چوروں کے اخلاق سے تشبیہ دی' تو اس پر خوب خوب!" کا شور بلند ہوا۔

ایک نوخیز تاتاری حسینہ' جس کی ترچھی آنکھیں اس کی رگوں میں قتلوتی خون کی موجودگی ظاہر کرتی تھیں' اورک کی مٹھائی اس طرح کتر کتر کے کھا رہی تھی' جیسے اس کو اپنے دانتوں کی مضبوطی پر پورا اعتماد ہو اور ایک چغتائی ترک خاتون' جو کسی زمانے میں ایک بادشاہ کی منظور نظر رہ چکی تھی' ہاتھی دانت کی طرح سفید رنگت کی نمائش کر رہی تھی۔ اس کی صباحت غازے سے بے نیاز تھی اور رقاصائیں بھی اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔

بیرونی دنیا کے یہ درباری' باغ میں جہاں گیر کی عنایت سے موجود تھے۔ اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ یہ "سنہری پرندے" بھی محل میں پرورش پانے والوں کے عیش و طرب میں شریک ہو لیں یا شاید وہ امیر زادیوں کو بے چین کر دینا چاہتا تھا۔ کوئی شخص وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس ترنگ میں آ کر بعض اوقات ایسی حرکتیں کرتا تھا۔ لیکن رقاصاؤں کو دوسروں سے بات کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ وہ خاموشی سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں' دمکتے ہوئے بازو بند پازیب اور موتیوں کی بل کھاتی ہوئی لچھیاں پہنے'

مسرت آمیز چہچہے سنتی تھیں۔ اپنی بہنوں کی طرح وہ اتار چڑھاؤ کے ساتھ بولی جانے والی فارسی اور کرخت لہجے میں بولی جانے والی ترکی کو بھی اتنی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتی تھیں' جتنی آسانی کے ساتھ اپنی مادری زبان ہندی کو سمجھتی تھیں اس لئے کہ وہ بہت سی چیزوں میں ماہر تھیں۔

دوکانوں سے اٹھنے والی عود و عنبر کی خوشبو' نارنگی کے پھولوں کی مہک سے ہم آغوش ہو گئی تھی۔ حوض کے سرے پر ایک رقاصہ بانسری کی دھیمی لے پر حرکت کر رہی تھی اور اس کی صورت' نیچے تاریک پانی میں نظر آ رہی تھی۔

جہاں گیر نے لطف کوشیوں کے بند کھول دیئے تھے اور طفلانہ چاؤ کے ساتھ خریداری کی تھی۔ حبشی خواجہ سرا' اشرفیوں کی تھیلیوں میں ہاتھ ڈالے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ چلتے چلتے اس نے حوض کے کنارے والی لڑکی کو ایک نظر دیکھا اور اچانک کسی ترنگ میں آ کر تمام خدام کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔ باغ میں صرف وہی ایک مرد تھا اور اس کی خوشی تھی کہ وہ ایک طرف سائے میں جا کر اس طرح دیکھے اور سنے کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔

لیکن وہ پوری طرح نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ کیونکہ ٹولی نے اپنا رقص ختم کر دیا اور یہ سمجھ کر کہ اس نے اسے طلب کیا ہے' ایک عجیب الشان استفسار کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گئی' اس پر جھنجلا کے جہاں گیر نے اسے چلے جانے کا اشارہ کیا اور کہیں جانے کے لئے مڑا۔

ایک دوکان' دوسری دوکانوں سے ذرا ہٹ کر تھی' جس میں زر کار کپڑے صرف ایک لالٹین کی روشنی میں پھیلے ہوئے تھے' لالٹین سے رستہ رک گیا تھا۔ جہاں گیر نے معذرت کرتے ہوئے اسے اٹھا لیا!

"معاف کیجئے گا! شہزادی صاحبہ....."

اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جہاں گیر نے ایک عورت کی تاریک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا' جو سفید ماتمی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھتے ہی اس کے ذہن میں چند یادیں ابھر آئیں۔ وہ آنکھیں اس کو کئی برس پیچھے لے گئیں' یہاں تک کہ وہ باغ اور اس کے تمام ہجوم کو بھول گیا۔ وہ ایک خوفزدہ نوخیز لڑکی کی آنکھیں بن گئیں' جن سے وہ سنگ سرخ کے بنے ہوئے ایک اور

شہر ---- فتح پور کے باغ میں دو چار ہوا تھا' جب اس نے بہ مشکل شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا' جب وہ صرف شہزادہ تھا اور اکبر کا نور نظر!

دوسرے باغ میں بھی ایک حوض تھا' جس کے گھنے سرو کے درختوں نے حرم سرائے شاہی کی جالی دار کھڑکیوں کو چھپا دیا تھا۔ حوض کے ایک سرے پر پانی کنول کے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ انیس سال گزرنے کے بعد بھی جہاں گیر کے ذہن میں ان پھولوں کی یاد بالکل تازہ تھی : ڈوبتے سورج کے پہلے سائے اور تپتے آسمان کی تمازت کم ہوئی اور وہ وقت گزارنے کے لئے زنانہ باغ میں کسی کو تلاش کرنے لگا۔

روشوں پر اسے کوئی عورت نہیں ملی۔ اس زمانے میں وہ اس کی راہ سے دور دور رہتی تھیں۔ جب وہ بچہ تھا' تو نوخیز کنیزیں اسے چھیڑتیں۔ محبت کے ساتھ اس سے کھیلتیں اور اس کی حاضر جوابی پر قہقہے لگاتیں---- البتہ اس کی ماں' ملکہ عالم کے کمروں میں انہیں سنجیدگی اختیار کرنی پڑتی۔ پھر جب اس کی تعلیم و تربیت' حرم سرا کے باہر' اس کے اتالیقوں کے سپرد کی گئی۔ تو بعض غیر ملکی کنیزوں کو اس پر ہاتھ پھیرنے اور اس کے جذبات بیدار کرنے کا موقع مل گیا' ان میں سے ایک کے متعلق اکبر نے حکم دیا تھا کہ اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ انار کلی اس کا نام تھا۔ وہ سانولی سلونی ہندو لڑکی تھی' خطرات سے بے پروا! اس کے بعد سے نوجوان کنیزوں کو اس سے کھلے بندوں بے تکلفی کا خطرہ مول لینے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ شہزادہ بھی اس وقت ان کی پیش قدمیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کیا وہ تسلیم شدہ وارث تخت نہیں تھا؟ جس کی کمان میں ایک چھوٹی سی فوج تھی اور اس کے باپ کے سوا' اس پر کسی کو بالادستی حاصل نہ تھی۔

چلتے چلتے اس نے جھاڑیوں سے پھول توڑے اور ان کی پنکھڑیاں نوچ نوچ کر زمین پر بکھیر دیں۔ جب وہ حوض کے سرے پر پہنچا' تو اس نے کنکریاں اٹھائیں اور انہیں کنول کے پھولوں پر مارنے لگا۔ اس کا نشانہ سچا اور بازو طاقت ور تھے۔ جلد ہی اس نے پنکھڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کر دیا اور یہ ٹکڑے پانی کی سطح پر تیرنے لگے :

"خبردار! یہ کیا کرتے ہو؟"

اس اچانک اور سخت حکم نے جس میں شدت احساس کی گونج تھی' اسے متحیر کر دیا۔ سرو کے گھنے سائے میں ایک لڑکی دوزانو بیٹھی تھی۔ جب وہ اس کے پاس چل کر گیا تو اس

نے منہ پھیر لیا' لیکن بھاگنے کی کوشش نہیں کی' اس کا نازک جسم' متوازن اور جیسے کسی کا منتظر تھا' وہ حیرت سے اس کے لمبے بال دیکھنے لگا جن سے اس کا گلا چھپا ہوا تھا۔ یہ قریب قریب سیاہ تھے بہ ظاہر اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔

"منہ موڑو اور ادھر دیکھو۔"

اس نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔

اس نے ایک پتھر اٹھایا' پھر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اسے توقع تھی کہ وہ اس کے پہلو پر نظر ڈالے گی یا جھوٹ موٹ کا خوف ظاہر کرنے کے لئے چیخ اٹھے گی۔ اس کے بجائے لڑکی اس کی طرف تیزی سے مڑ گئی۔ اس کی آنکھیں مارے غصہ کے لال تھیں' اس کے عہد شباب جس پر غازے کا رنگ نہیں تھا۔ اس کی جلد بالکل شفاف تھی' جو کسی داخلی روشنی سے دمک رہی تھی۔

"میں اکبر کے لڑکے کو بیل کے ایک چرواہے کی سی حرکت کرتے دیکھ رہی ہوں۔ ذرا دیکھو تو!"

اس نے پانی کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا :۔

"میرے پھول!"

جہاں گیر نے دوبارہ پھینکنے کے لئے پتھر اٹھایا۔ پھر اسے گرا دیا۔ اس نے شاہانہ انداز میں اسے سرزنش کرنی چاہی کہ اس نے "تم" کہہ کر اسے خطاب کیا ہے۔ وہ اس کا مذاق اڑانا چاہتا تھا کہ اس نے شہنشاہ کے باغ کو اپنا کہا تھا۔

اس کے بجائے اس نے سوال کیا:

"کیا یہ پھول تیرے ہیں؟"

اس کا جواب اس نے صرف سر کی جنبش سے دیا۔ مغل ولی عہد نے اس پر حقیقی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ تعظیماً" کھڑی نہیں ہوئی' حالانکہ وہ کھڑا تھا۔ اس نے اس سے آنکھیں چار کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی' اس کے بجائے وہ اس پر کافی مطمئن معلوم ہوتی تھی کہ حوض کو تاراج کرنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا' جب وہ اس کے برابر بیٹھا اور اس کے متعلق سوالات کئے' تو اسے معلوم ہوا کہ وہ غیر ملکی ہے اور ایک ایرانی کی لڑکی' جس نے شاہی دربار میں ملازمت کر لی ہے۔ وہ چودہ سال کی تھی اور اس کے والدین اسے مہرو کہتے تھے۔

"تم پیدا کہاں ہوئی تھیں؟"

"ریگستان میں! قندھار کے قریب!"

جہاں گیر کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی' اگر وہ اس کا مذاق نہیں اڑا رہی تھی۔ ایسی لڑکیاں' جو مہرو کی طرح حسین ہوں' حرم سرائے شاہی میں پیدا ہوتی ہیں۔

"لیکن کیوں--------- تمہاری ماں ریگستان میں جانے پر کیوں مجبور ہو گئی تھی؟"

"ایک کارواں------- ہم ہندوستان آ رہے تھے! کیونکہ میرے والد کی یہ خواہش تھی۔ ہمارے پاس تین اونٹ تھے' لیکن روپیہ یا سامان نہیں تھا۔"

جہاں گیر کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ لڑکی اس سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ کہ اس کے خیالات کیا تھے۔ وہ اپنے ہاتھ پر اپنی ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ اور نیچی پلکوں سے پانی کی سطح دیکھ رہی تھی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا "اور کس طرح تمہاری دیکھ بھال کی گئی؟"

"کارواں آگے بڑھتا گیا" اس نے بے رخی سے جواب دیا "اور میں بھی اس کے ساتھ ہی!"

کتنی عجیب بات ہے یہ! صحرائے وحشت پناہ کے سفر میں مردوں اور چوپالوں کے درمیان ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے اور اتنے اہم مرحلے کے لئے صرف مختصر سا قیام کافی سمجھا جاتا ہے۔ جہاں گیر کو معلوم تھا کہ اس کی ولادت کے وقت "نو خطروں" کو دور رکھنے کے لئے پجاریوں نے مندر میں پوجا پاٹ کی تھی۔ شہزادیوں نے اس کی راجپوت ماں کے لئے دعائیں مانگی تھیں کہ خدا اسے چتا کی آگ سے بچائے اور اکبر نے اپنے ہاتھوں سے' سنگ سرخ کے بنے ہوئے شہر کی سڑکوں پر اشرفیاں لٹائی تھیں۔

"اچھا! تمہارا گھر اب کہاں ہے؟"

اس کا چہرہ ایک حیران کن تبسم سے دمک اٹھا: "ہماری پہاڑیوں پر!"

جہاں گیر اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ معلوم ہوتا ہے: مہرو کے باپ نے اسے خراسان کی پہاڑیوں کی باتیں بتائیں تھیں' جہاں وہ ایک زمانے میں رہا کرتے تھے اور اس وقت مہرو کو اپنے حقیقی وطن کے ذکر پر وہ پہاڑیاں یاد آ گئیں' جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہندوستان اسے پسند نہیں تھا۔ ایک لمحہ قبل وہ انتہائی حقیقت پسند انسان تھی۔ لیکن اس وقت اپنے تصورات سے کھیل رہی تھی----- جہاں گیر کو شبہ ہوا کہ ان لمبی

پلکوں کی اوٹ سے نگاہیں اسے چوری چوری پڑھ رہی ہیں۔ نازک گلے پر بکھرے ہوئے گھنے سیاہ بالوں سے ہاتھی دانت کی سی سفیدی کس طرح جھلک رہی تھی۔ اس وقت وہ کیا باتیں سوچ رہی ہو گی کہ اسے اس کی موجودگی کا اتنا احساس بھی ہے' اس کے باوجود اتنی دور ہے؟ جذبات سے اتنی خالی' پھر بھی اتنی چاق و چوبند! جب وہ حرکت کرتی تھی' تو بالکل ایک چڑیا معلوم ہوتی تھی۔

ہاں! وہ ایک چڑیا سے یقیناً مماثل تھی' جو اس کے قریب زمین پر' حوض کے کنارے بیٹھی تھی۔ جسے نہ کوئی چھو سکتا تھا' نہ رام کر سکتا تھا' اور جو صرف ایک لمحے کے لئے خاموش تھی۔ اگر وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے لے' تو ایسا معلوم ہو گا' جیسے اس نے کوئی جنگلی کبوتری پکڑ لی ہے' اگر اس نے اس کو ہاتھ لگایا' تو------

وہ اسے واقعی کنکھیوں سے دیکھتی رہی تھی۔ جب اس نے اپنے ہاتھ بڑھائے' تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر نام کو مسکراہٹ نہ تھی۔

"صاحب عالم: دونوں وقت مل رہے ہیں۔ مجھے اب محل میں جانا چاہئے۔"

"وقت تو آپس میں ملیں اور ہم جدا ہو جائیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" جہاں گیر نے کہا' اس کی رگوں میں ایک عجیب و غریب غصہ ابل پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں کے نیچے گرم اشکوں کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی انگلیاں مہرو کے ہاتھ میں گاڑ دیں اور اس کو یہ کہتے سنا؟

"یہ کیا ہے؟"

جہاں گیر کے ہاتھ' اس کے نرم و نازک شانوں کے گرد حمائل ہو گئے' اس نے اپنا چہرہ اس کالے بادل کی لٹوں میں گم کر دیا..... جنگلی کبوتری اس طرح اس کے چنگل میں پھڑ پھڑاتی رہی' اس کے بازو آہستہ آہستہ بچ نکلنے کی کوشش کرتے رہے' مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا' خوفزدہ دل' اس کے جسم سے لگا ہوا' دھڑک رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی آستین کا سرا اپنے چہرے پر ڈال لیا'

اتنے میں مسجد کے مینار سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔

"حی علی الصلوۃ۔ حی علی الصلوۃ۔ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر۔"

اور جہاں گیر نے فوراً اسے چھوڑ دیا۔ لڑکی اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر لڑکھڑائی۔ وہ

حوض کے کنارے سے اندھوں کی طرح مڑی اور سرو کے ایک درخت سے ٹھوکر کھا گئی۔

جہاں گیر کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے چوٹ لگ گئی۔ "مہرو" کہہ کر اس نے پکارا اور اس کے پیچھے گیا۔ لیکن یہ شفاف جسم اس سے بچ کر نکل گیا اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ حوض کے کنارے واپس گیا' جہاں اس کا خلعت پڑا تھا۔ ایک لمحے تک وہ پانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یہ پھول کے ٹکڑوں سے کیوں ڈھکا ہوا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا اور اپنی جلتی ہوئی پیشانی پر چھینٹے مارے.....

اس رات اسے اچھی طرح نیند نہیں آئی' جس کے متعلق اس نے اپنے دل کو یقین دلایا کہ یہ شام گزرنے کے بعد بے تحاشا شراب نوشی کا نتیجہ ہے۔ اسے رہ رہ کر مہرو کی آنکھوں کا خیال آتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس کے دل میں کوئی غزل کہنے کی تحریک پیدا کر دے گی۔ سورج نکلنے کے بعد وہ اپنے باپ کے محل سرا میں یہ معلوم کرنے گیا کہ محل کی عورتوں میں اس لڑکی کی کیا حیثیت ہے؟ اسے خود اپنے حرم میں داخل کر لینا ایک معمولی سی بات ہو گی۔

یہ جہاں گیر نے سوچا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ------ محل سرا میں پرورش پانے والا لڑکا پردوں میں لپٹے ہوئے کمروں کے اسرار کبھی نہیں بھول سکتا------ کوئی ایسی بات پیش آئی ہے جس نے دریافت کے دریچے بند کر دیئے ہیں۔ خادمائیں اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتیں اور بڑی ہوشیاری سے ایسے سوالات کا جواب بھی ٹال جاتیں جو بالکل بے ضرر معلوم ہوتے تھے۔ اگر مہرو نام کی کسی ایرانی لڑکی کا وجود تھا بھی' تو وہ بڑی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے لاعلمی کا اظہار کرتیں۔ مہرو اس کے لئے' جنوں کے کسی بچہ کی طرح' چھلاوا ہو گئی تھی۔ جہاں گیر نے شروع میں بے صبری ظاہر کی۔ پھر اسے غصہ آیا اور اس کے بعد اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اسے تلاش کر کے رہے گا۔ اسے محسوس ہوا کہ ان تمام عورتوں نے اس کے خلاف ایکا کر لیا ہے اور وہ سلطنت کے ولی عہد کو اس کی محبوب ترین چیز سے محروم رکھنا چاہتی ہیں۔

آخر کار اسے اکبر کی ایک بیگم' رقیہ سے معلوم ہوا کہ مہرو کو اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔ اس شام کو وہ بعض سن رسیدہ عورتوں کے پاس سسکیاں لیتی دیکھی گئی تھی' جو اسے تنہا کھلی چھت پر لے گئیں اور وہاں اس سے باتیں کیں۔ اب اکبر کو یہ داستان معلوم ہو

گئی ہے اور شہنشاہ کے خوف نے محل والوں کے ہونٹوں پر اتنی شدید مہر لگا دی ہے کہ جہاں گیر بھی اپنے تمام تر اصرار کے باوجود اسے نہیں توڑ سکتا۔

کئی مہینے گزر گئے' مگر اس ایرانی لڑکی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ سرگوشیوں کے ذریعے یہ بات محل میں پھیل گئی اور جہاں گیر کو معلوم ہوا کہ شہنشاہ نے اس سے گلو خلاصی حاصل کر لینے کا حکم دیا اور مہرو کی شادی ایک نوجوان ایرانی سے کر دی گئی' جو ایک سپاہی ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی دارالحکومت سے سفر کرکے شاید خراسان کی دور دراز پہاڑیوں پر چلے گئے ہیں۔ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ مگر جہاں گیر نے سمجھ لیا کہ لڑکی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر کوئی معمولی شادی ہوتی' تو وہ اس کی کوئی پروا نہ کرتا۔ لیکن یہ شادی اکبر کے واضح حکم سے کی گئی تھی اور وہ اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو اس ایرانی کا نام بھی معلوم ہو گیا------ علی قلی------ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ اس کے مزاج کے عین مطابق تھا' اسے چونکہ اس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے دل سے مہرو کی خواہش نہیں نکل سکی اور پھر اس کی عزت نفس کے سوا بھی کوئی چیز تھی' جسے صدمہ پہنچا تھا۔ حرام سرا کے دربانوں نے حامیوں سے کہا جن سے ہوتے ہوتے یہ بات' بیگمات کے خدام تک پہنچی کہ اکبر کا بیٹا دوبارہ باغ کے اس گوشے میں' نیلے کنول کے حوض کے کنارے نہیں گیا' لیکن جو سپاہی' راتوں کو اس کے بستر کے قریب پہرہ دیتے تھے' اس کا علم انہیں بھی نہ تھا کہ اس لڑکی کا چہرہ کس طرح اس کے حافظے کو برماتا رہتا ہے۔ حالانکہ کئی سال آئے اور گزر گئے۔ اس کی دوسری عورتوں سے شادی کر دی گئی اور ان سے بچے بھی پیدا ہوئے۔

تا آنکہ آگرہ کے قلعے کے باغ میں' انیس (۱۹) سال بعد' نو روز کے اس جشن کے موقع پر' اپنے ہاتھ میں لالٹین لے کر' اس کی دھیمی روشنی میں' اس نے مہرو کی آنکھوں میں دوبارہ جھانکا اور جیسے ہی اس کی زبان سے یہ احمقانہ الفاظ نکلے :۔

"معاف کیجئے گا! شہزادی صاحبہ ....."

اس نے اسے پہچان لیا۔

کم لوگ تھے' جنہوں نے مہرو کو بے پردہ دیکھا تھا' لیکن ان کا بیان بھی' اس کے بارے

میں بہت تشنہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ہی اسے اپنی ہم چشموں سے ممتاز کرنے کے لئے کافی تھا۔ ایک وقائع نگار سرسری طور پر اس کی گہری نیلی آنکھوں کا ذکر کرتا ہے' لیکن دوسرا یقین کے ساتھ انہیں سیاہ بتاتا ہے' اس معاملے میں شاہی دربار کے مصور بھی باہم اختلاف رکھتے ہیں۔

راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خیال میں وہ ایک مورتی کی مثال تھی' جس میں جان پڑ گئی ہو۔ تاہم وہ اس کے مخالف تھے' اس لئے کہ پیغمبرؐ اسلام نے بتوں کو ان کے ہر روپ میں "طاغوت" سے تعبیر فرمایا تھا۔ بہر صورت اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس نے ان لوگوں کو ایک ایسی عورت کی حیثیت سے متاثر کیا تھا' جس کی بعض ناقابل فہم خصوصیات اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتی تھیں اور وہ سب کے سب ـــــ ماسوا ایک کے ـــــ اسے ہدف طعن بنانے کے لئے بے چین رہتے تھے۔

غرض نو روز کے اس جشن میں جہاں گیر نے جس عورت کو دیکھا تھا' وہی پہلی ملاقات والی نازک اندام مہرو تھی۔ لیکن اب اس کی عمر تیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سائے لرز رہے تھے اور اس کے رخساروں کا نازک خم اس کی صراحی دار گردن میں تحلیل ہو گیا تھا۔

"جہاں پناہ! قندیل رکھ دیجئے۔"

اس کی آواز میں بڑی حد تک نرمی اور نغمگی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں گیر کو اب احساس ہوا کہ اس نے قندیل اس قدر اس کے منہ کے قریب کر دی ہے کہ اس کا دھواں اس کے منہ' ناک اور آنکھوں میں گھسا جا رہا ہے۔ خود اس کا ہاتھ کپکپا رہا ہے اور پیتل کی قندیل کے سوراخوں سے ننھے ننھے شعلے باہر نکل رہے ہیں۔

"مہرو!" اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے؟"

وہ جہاں گیر کو دیکھ کر متبسمانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"جہاں پناہ! میں تو کئی برس سے یہاں ہوں!"

"لیکن تیرے ـــــ تمہارے کپڑے؟" اس کی گفتگو میں بے ڈھنگا پن پیدا ہو گیا۔

"تم کس کا سوگ منا رہی ہو؟"

"جہاں پناہ! اپنے شوہر کا! وہ چار برس ہوئے : اللہ کو پیارے ہو گئے!"

"اللہ کو پیارے ہو گئے؟ وہ کیسے؟"

جواب دینے سے پہلے خاتون نے اس کی آنکھوں پر ایک تجسس آمیز طائرانہ نظر ڈالی پھر کہا؟

"تلوار سے!"

اور سامنے سے ایک زرکار جوڑا اٹھا کر بولی۔

"کیا نگاہ خسروانہ اس کپڑے کو اپنی توجہ سے نہیں نوازے گی؟ اس کے تار سونے کے ہیں!"

وہ ان سایوں سے بے خبر نہ تھی' جو اس کے قریب ہی سر سرا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی باتوں پر کان لگے ہیں اور ان کا ایک ایک حرف بڑے غور سے سنا جا رہا ہے مہرو کی دعوت ذوق آزمائی نے جہاں گیر کو چونکا دیا!

"نہیں! نہیں! دوکان دار صاحبہ!" وہ نہیں جانتا تھا' اسے کس نام سے پکارے!! یہ تو بازاری کپڑا ہے اور دیکھو! سامنے کا یہ سرا گھس کر پھٹ بھی گیا ہے۔ ہاں! اس کا رنگ خوب ہے اور مابدولت اسے پسند کر سکتے ہیں۔"

مہرو نے آسمانی رنگ کا ایک کپڑا اٹھایا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی:

"اس کپڑے کا رنگ' شام کے آسمان کی طرح' نیلا ہے' جس پر نقرئی ستارے جگمگا رہے ہیں۔ کیا لکھنے والوں نے جھٹ پٹے کے حسن کو نازک و ناپائیدار نہیں لکھا۔ پھر کیا ہے اگر یہ کہیں کہیں سے خنک گیا ہے' یا اس میں معمولی سے چھید ہو گئے ہیں۔ جہاں پناہ اس کا کیا مرحمت فرمائیں گے؟"

"قیمت تو دوکان دار ہی کو بتانی ہو گی!"

"کپڑا تو واقعی معمولی ہے لیکن اس پر کام میرے ہاتھ کا ہے۔ یہ زرکار کپڑے پر ٹکے ہوئے موتی ایک شہنشاہ کے شایان شان ہیں!"

جہاں گیر جیسے کچھ مایوس سا ہو گیا۔ اس نے مذاق کرنے کی کوشش کی۔

"تو کیا تمہارے خیال میں ایک شہنشاہ زرکار پوشاکوں اور موتیوں کے سوا کچھ پہنتا ہی نہیں اور اگر وہ فن کار ہو؟"

لیکن مہرو کی نگاہ کسی اور طرف تھی۔ وہ چند آنے والوں کو سر کی جنبش سے سلام کر رہی تھی۔ محل کی ایک عمر رسیدہ بیگم شمع بہ دست کنیزوں کے جلو میں چلی آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر جھریاں پڑ چکی تھیں اور مہرو کی طرح اس نے بھی سفید لباس پہن رکھا تھا وہ

سلیمہ بیگم تھی جو کسی زمانے میں اکبر کی منظور نظر رہ چکی تھی۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھی' جو جہاں گیر پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔ پچھتر(۷۵) برس کی عمر میں بھی چلتے میں اس کی گردن اکڑی رہتی تھی اور اس کی بینائی بھی حیرت انگیز حد تک تیز تھی۔

"اخاہ! شیخو بابا! تم نے باغ کا بہترین پھول پا لیا۔ لیکن تم سے پہلے میں نے اسے پایا ہے۔ یہ فراغت کے لمحوں میں میرا دل بہلاتی ہے۔ تم نے اس سے کیا خریدا ہے؟"

سلیمہ بیگم' تیموری نسل کی ایک شہزادی تھی۔ وہ جہاں گیر کو اب بھی اس کے بچپن کے نام سے یاد کرتی تھی۔ جب شاہی دربار آگرہ کے قلعہ سرخ میں تھا' تو اکبر اسے شیخو بابا کہہ کر پکارتا تھا۔ سلیمہ بیگم نے دو نسلوں تک سرکش ماحول پر حکومت کی تھی اور کسی کو اس کی بات کاٹنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اس نے اپنا ڈھلا پتلا ہاتھ' جس پر رعشہ کا معمولی سا اثر تھا' جہاں گیر کی آستین پر رکھا اور شکایت کے لہجہ میں بولی۔

"آج شام میں نے مٹھائی چکھی تک نہیں۔ ارغوانی شہ نشین میں سب دسترخوان پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ بخدا جشن سے بے کھائے پیے جانے کا' میں کوئی خیال نہیں رکھتی۔"

وہ سب کے سب تالاب کا چکر کاٹ کے آگے بڑھے۔ سلیمہ بیگم دوسری بیگمات سے آگے آگے چلنے میں بڑا لطف محسوس کر رہی تھی' جو تیز رفتاری میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ جہاں گیر نے رازدارانہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

"حسن کی یہ مکمل تصویر کیا واقعی تمہارے محل میں رہتی ہے؟"

"شیخو بابا! میں نے' بے ضرورت' کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟ دو سال کی بات ہے۔ اس کا باپ اسے میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔ چار سال ہوئے : میری طرح---- میرا مطلب ہے : جیسی میں بیوہ ہوں' وہ بھی بیوہ ہو گئی۔ فارسی کے شعر خوب پڑھتی ہے۔ خیر! اس سے مجھے کیا؟ میں تو اس کی آواز پر فریفتہ ہوں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

اس نے بجھی بجھی آنکھوں سے جہاں گیر کو دیکھا اور قندیلوں کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی :

"وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ اسے کسی کی پروا نہیں۔"

عمر رسیدہ بیگم نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور ہمت ہارتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی :

"یہاں کہیں ہوا چل بھی رہی ہے؟! میں تو نہیں جانتی' خدا ہی جانے! پھر بھوک نے

الگ بے حال کر رکھا ہے اور جب بھوک لگی ہو تو میں کوئی بات ٹھیک طرح نہیں سوچ سکتی۔"

"حسن و ادا کی یہ پتلی آج رات تمہارے کہنے پر یہاں آئی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا! شیخو بابا! رقیہ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہے۔ لیکن بخدا! اب تک اپنے رخساروں کو غازے سے رنگتی ہے۔ اس کے پاس بھی مہرو سے خوبصورت کوئی کنیز نہیں۔ ہاں! خوب یاد آیا: میری ایک کنیز نے مجھے چپکے سے بتایا تھا کہ تم پوچھ رہے تھے: مہرو کا شوہر کس طرح ہلاک ہوا؟ آئندہ یہ بات پوچھنے سے پہلے ذرا کچھ سوچ سمجھ لینا۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں!! مجھے ایسی نگاہوں سے نہ دیکھو! اللہ! تیرا شکر ہے! آخر ہم یہاں پہنچ ہی گئے۔"

تمام ہندوستان میں شاید ایک سلیمہ ہی تھی، جو جہاں گیر سے پہلے اس شہ نشین میں داخل ہونے کی جرات کر سکتی تھی۔ جہاں گیر کو دیکھتے ہی ساری عورتیں فرشی سلام کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سلیمہ کی ٹانگیں زیادہ دور چل کر آنے کی وجہ سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے جلد سے جلد اپنی جگہ پر بیٹھ جانا چاہئے، مبادا رقیہ کی عقابی آنکھ اس کمزوری کو بھانپ لے۔

جہاں گیر جشن سے سویرے ہی اٹھ گیا اور خدام کو حکم دیتا گیا کہ اس کے ہم جام۔۔۔۔۔۔ ایک نوجوان ایرانی شاعر۔۔۔۔۔۔ کو ڈھونڈا کر لائیں۔ وہ محل میں داخل ہوا اور حرم سرا کے تقریباً سنسان کمروں سے گزرتا ہوا، ایک الگ تھلگ خواب گاہ میں پہنچا، جس کا دروازہ بالائی دالانوں کی طرف کھلتا تھا۔ یہاں وہ تنہائی میں بہ اطمینان ساغر و مینا سے کھیلتا تھا۔ ایک دو آشہ جام پہلے ہی سے تیار کیا رکھا تھا، جہاں گیر خاموشی سے چسکیاں لگانے لگا۔ اسی اثناء میں شاعر کا چہرہ دروازے کے پردوں سے نمودار ہوا۔ شہنشاہ کے اشارے پر وہ تیزی سے آگے بڑھا کہ حضور شاہ میں زمیں بوس ہو کر ہدیۂ فدویت پیش کرے۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کی پیشانی کو دبا رہا تھا۔

"فراش!" جہاں گیر نے کہا۔ "تم اپنے وطن اور مابدولت کے دیوان غیاث بیگ کے گھر والوں کو جانتے ہو؟"

"جہاں پناہ کا آفتاب اقبال تابندہ رہے، فدوی کو غیاث بیگ کے ہاں کئی مرتبہ دعوت طعام میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس کی فراست....."

"اس کی فراست کا مابدولت کو علم ہے! ہم تو اس کی لڑکی: مہرو کے متعلق کچھ جاننا

چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے ہمارے ساتھ ایک جام پیو۔"

مغل شہنشاہ نے آہستہ سے تالی بجائی۔ ایک حبشی' ہمہ تن توجہ شاعر کے قریب دوزانو ہو کر شراب ناب کا ایک طلائی جام پیش کر رہا تھا۔ جس میں جہاں گیر کے کہنے پر اچھی خاصی مقدار میں شراب ملا دی گئی تھی۔

فراش حضور شاہ میں بہ عجلت تمام حاضر ہوا تھا۔ اس کے منہ سے مشک کی تیز لپٹیں آ رہی تھیں' جس سے شہنشاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ شراب پیتا ہوا آیا ہے۔ پھر تو افیون آمیز شراب ناب کا ایک بڑا جام یقیناً شاعر کے ہوش و حواس معطل کر دے گا اور اس طرح کچھ سچی باتیں اس کے منہ سے نکل جائیں گی۔ اصل میں جہاں گیر یہ معلوم کرنے کا بے حد مشتاق تھا کہ سلیمہ نے اسے مہرو کے شوہر کی ہلاکت کا سبب پوچھنے سے باز کیوں رکھا ہے؟ عمر رسیدہ تاتاری شہزادی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں' پھر اسے کیا پڑی تھی کہ وہ لغو باتیں کرتی؟!"

بلکہ اس نے شاعر کو بھی' یہ یقین دلا کر کہ اس کی طبیعت سننے پر مائل نہیں ہے' اپنا کلام سنانے سے روک دیا۔

"ہم نے مہرو کو مینا بازار میں دیکھا تھا۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ اس کی شمع حسن نے ہمیں اپنی طرف کھینچا اور ہم تنہا اس کی دوکان میں چلے گئے۔"

جہاں گیر اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سرسری سا فقرہ شاعر کے آرزو مند دماغ پر وہی کام کرے گا' جو کام ایندھن کے ڈھیر میں چنگاری کرتی ہے۔ زنانہ محل کی افواہیں شاعر کی زبان کی نوک پر رہتی تھیں۔ اس نے یقیناً" ولی عہد سلطنت اور ایرانی لڑکی کی اس ملاقات کا حال سنا ہو گا' جو آج سے کئی برس پہلے' قلعہ سرخ کے پردہ باغ میں ہوئی تھی۔

"تو فیض و احسان کے آفتاب درخشاں نے شمع حسن کو اپنے پرتو سے نوازا تھا۔" شاعر نے تعجب آمیز پیرائے میں کہا! "کیا کتاب میں نہیں لکھا کہ "جو بوؤ گے' سو کاٹو گے" تاہم کہا جاتا ہے' کہ زرقہ کی طرح مہرو بھی بہت دور کی چیزیں دیکھ لیتی ہے' جیسے کسی رصد گاہ میں بیٹھی ہو' مہرو وہ تنہا ستارا ہے' جو غروب آفتاب کے وقت آسمان پر چمکتا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جاتا ہے؟"

"محل کے غلام دبی زبان سے کہتے ہیں کہ وہ پردہ نہیں کرتی۔ جہاں اندھیرا ہوا' وہ باہر نکل گئی کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی بھوت پریت سمایا ہوا ہے' اس لئے جو بھی اس

کی نظر پر چڑھے گا' تباہ و برباد ہو جائے گا اور یہ جھوٹ بھی نہیں ہے! جہاں پناہ جانتے ہی میں کہ اس کا شوہر....."

فراش خاموش ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"یہ ہم جانتے ہیں! لیکن اس کے شوہر کا انجام کیا ہوا؟ یہ مابدولت کو معلوم نہیں!"

"اس کا حشر وہی ہوا' جو ہونا چاہئے تھا!" شاعر نے اپنے ولی نعمت کے چہرہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ نمایاں طور پر سنجیدہ ہو گیا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے بولا۔

"حضور کو یاد ہو گا: چار برس پہلے بنگالہ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے' اور ظل الٰہی کے خلاف کچھ بدانجاموں نے سازش کی تھی۔ جہاں پناہ کو اس کی اطلاع ملی تو فرمان صادر ہوا کہ ان سرکشوں کو گرفتار کرکے دربار میں پیش کیا جائے۔ جن کے قانون شکن ہاتھوں نے بغاوت کے بیج بوئے ہیں۔ حضور کے فرمان پر قطب الدین صوبے دار نے باغیوں کی سرکوبی کی' یہاں تک کہ ان میں ایک جنگ آزما' جسے شیرافگن کہہ کر پکارا جاتا تھا....."

"ہاں! یاد آیا۔ یہ واقعہ ہم نے اپنی تزک میں بھی لکھا ہے۔ قطب الدین ہمارا رضاعی بھائی تھا اور اسی دودھ سے پلا تھا' جو مابدولت کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ بخدا وہ ہمیں دل سے عزیز تھا' وہ کچھ آدمیوں کو لے کر اس شیرافگن کو گرفتار کرنے گیا' جو بڑا سرکش اور بے باک تھا۔ شیرافگن سمجھا: یہ لوگ میرا قصہ پاک کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ وہ قطب الدین پر جھپٹا اور اس کے پیٹ میں تلوار گھونپ دی جس کی پاداش میں اسے موقع ہی پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور اسی انجام کا وہ مستحق بھی تھا!"

"جہاں پناہ! بالکل بجا ارشاد ہوا!" فراش نے دھیمے لہجے میں کہا' یہی شیرافگن' مہرو کا شوہر تھا۔"

"وہ کیسے؟ اس کا شوہر تو علی قلی تھا اور ان دونوں کو تو کہیں پہاڑیوں پر بھیج دیا گیا تھا"

"ظل الٰہی! وہاں سے وہ واپس آ گئے تھے۔ علی قلی اس کا نام تھا۔ لیکن شیر کے ایک شکار میں بہادری کا مظاہرہ کرنے پر اسے شیرافگن کے خطاب سے نوازا گیا۔

"اچھا! تو وہ تلوار ہی سے ہلاک ہوا!"

جہاں گیر قسمت کی کرشمہ سازیوں پر غور کرتا رہا' جس نے مہرو کے شوہر اور شہنشاہ کے رضاعی بھائی کو آپس میں الجھا دیا اور وہ نوں ایک ہی جگہ ڈھیر ہو گئے۔ اگر قطب الدین نہ مارا جاتا۔ تو جہاں گیر کو اس حادثے کا علم ہی نہ ہوتا۔ ہر سال مختلف صوبوں میں' ہزاروں بغاوتیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا دسواں حصہ مغل شہنشاہ کے کانوں تک پہنچایا جاتا تھا۔

ایک اچانک خیال نے اس کا دل برما دیا' سلیمہ کا انتباہ اور فراش کا اضطراب اس نے ------ جہاں گیر نے ----- حکم دیا تھا کہ شیر افگن کو پابہ جولاں دربار شاہی میں پیش کیا جائے یہ صحیح ہے کہ وہ ایک اچانک لڑائی میں مارا جا چکا تھا' تاہم اس پر غداری کا الزام تھا' ممکن ہے لوگ خیال کرتے ہوں کہ مغل شہنشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی' مہرو کے شوہر کے قتل کا منصوبہ تیار کیا اور پھر غیر شعوری طور پر اس واقعے کو اپنی تزک میں بھی لکھ دیا تاکہ تمام اہل دربار اس کی پیش کردہ صفائی کی روشنی میں اس پر نظر ڈالیں۔

اس نے محسوس کیا' کہ فراش ایک چھپے ہوئے اشتیاق کے ساتھ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے' جسے شاعر بنا سنوار کر کانوں میں انڈیل سکتا ہے! "تم جا سکتے ہو!" اس نے بے رخی سے حکم دیا۔ "لیکن ٹھہرو!" وہ بھول گیا تھا کہ اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہے۔ "کیا شیر افگن نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی؟"

"جہاں پناہ! کہتے ہیں : صرف ایک لڑکی ہے!"

"اس کی عمر کیا ہو گی؟" اس نے مجبوری دبے سانحتگی کے لہجہ میں پوچھا۔

"خانہ زاد نے اس بچی کو دیکھا ہے۔" فراش نے نگاہیں نیچی کر لیں "وہ کوئی دس برس کی ہو گی!"

"شیر افگن کی اور کون کون بیویاں ہیں؟"

"اس حیثیت کے لوگوں کو کئی کئی بیویاں رکھنے کی توفیق ہی کہاں ہوتی ہے اور پھر جس کے پاس مہرو ہو' اسے کسی اور طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے! اس کی بس ایک ہی بیوی تھی۔"

فراش نے شاعرانہ اسلوب چھوڑ کر سیدھے سادے لفظوں میں بات بتا دی وہ جانتا تھا کہ شہنشاہ اس وقت جذبات سے مغلوب ہے۔

"اب جاؤ!" جہاں گیر بڑبڑایا : "لیکن یہ نہ بھولنا کہ آج رات تم سے جو باتیں کی گئی

ہیں' اعتماد کا قفل لگا کر کی گئی ہیں۔ اگر اس قفل کو توڑا گیا' تو یاد رکھنا! سسکا سسکا کر مار دیئے جاؤ گے!"

"خانہ زاد نے سن لیا!" شاعر نے قالین پر اوندھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت موجود تھا' جب تخت نشین ہوتے ہی جہاں گیر نے حکم دیا تھا کہ دو سو باغیوں کو سولی پر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائیں اور غداروں کا انجام اس کے اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے یہ منظر شہزادہ خسرو کو بھی دکھایا گیا تھا۔

"فدوی' حضور کا خانہ زاد ہے! حضور کی خاک پا ہے!!"

"پردے کے پاس کہہ دو کہ مزید شراب حاضر کی جائے اور کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے!"

کورنش بجا لانے کے بعد جب شاعر رخصت ہو گیا' تو جہاں گیر نے اپنی توجہ جام و قرطاس میں تقسیم کر دی کبھی شراب کی چسکی لگا لیتا اور کبھی کاغذ پر' بغیر کسی مقصد کے' الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگتا۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت وہ کوئی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا' جو اس کے مزاج کی اس نئی کیفیت سے ہم آہنگ ہو' اسے محسوس ہوا' جیسے وہ "جھروکے" میں بیٹھا ہزاروں آدمیوں کو "درشن" دے رہا ہے۔ یہ ہجوم ہمیشہ اس کے گرد رہتا تھا۔ اس کی توجہ کو بہ ہر طور متاثر کرتا اور واقعات اس سے پوشیدہ رکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ کوئی اجتماعی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ ان کے اپنے اپنے گھر تھے اور اپنی اپنی زندگی' لیکن جہاں گیر ان کے اس اصرار سے زیادہ ان کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا' جو وہ اس کی توجہ کو متاثر کرنے' اس سے رحم و کرم کی بھیک مانگنے کے لئے کام میں لانے تھے۔ اس رازداری سے قطع نظر' کیا واقعی وہ اس کے دشمن نہیں تھے؟

شاعر کے پیٹ میں بات نہیں پچ سکتی تھی' لیکن اس کے لتراپے کی کوئی بھنک جہاں گیر کے کانوں تک نہ پہنچ سکی..... مہرو کا کہن سال باپ------- وہ خوش اخلاقی اور رکھ رکھاؤ کا حقیقی مجسمہ' بھلا جہاں گیر کے خیالات سے کیسے واقف ہو سکتا تھا؟ وہ دونوں قریباً" روزانہ ملتے تھے------ غیاث بیگ سلطنت مغلیہ کا واجب القدر دیوان تھا..... اگرچہ جہاں گیر یہ بھی جانتا تھا کہ وہ رشوت کھاتا ہے۔

وہ سب کے سب جھروکے سے باہر کھڑے' جہاں گیر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ جہاں گیر کے ہاتھ نے قلم کو صفحہ قرطاس پر جنبش دی: جو بوؤ گے' سو کاٹو گے!

بات یقینی تھی' اس نے جام خالی کر دیا اور ان سرخ شعلوں پر ایک نگاہ ڈالی' جو ساغر کی تہ میں بیٹھے ہوئے یاقوتوں کے جگر میں چھپے تھے۔ قیمتی جواہر پر ہمیشہ سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس نے اونگھنے کی کوشش کی اور ایرانی لڑکی کی گہری آنکھوں کو اپنے سامنے پایا' اسے محسوس ہوا' جیسے وہ سنگ سرخ کے بنے ہوئے شہر میں حرم سرا کے تالاب کے کنارے' لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے رہا ہے۔

وہ برسوں سے اس کے خیال و تصور کی ملکہ تھی' پھر جہاں گیر اسے کیوں نہ اپنا سکا۔ وہ سوچنے لگا: سلیمہ آخر چاہتی کیا ہے؟ وہ بے شک اپنے شیخو بابا سے محبت کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ باتیں ہیں جو وہ اس سے چھپاتی ہے۔

بالآخر خیالات کا ہجوم مغل شہنشاہ کے ذہن سے چھٹ گیا اور صرف ایرانی لڑکی کی آنکھیں خنک تاریکی میں باقی رہ گئیں۔ جہاں گیر نے سکون محسوس کیا۔

جشن بہار ختم ہو گیا تو جہاں گیر نے غیاث بیگ سے اس کی بیٹی: مہرو کا رشتہ طلب کیا۔

بادشاہ کی خواہش بھی یقیناً ایک طرح کا حکم تھی۔ پھر خزانے کے دانش مند وزیر نے آج تک اپنے آقا کی کسی خواہش' یہاں تک کہ من ترنگ کی بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ یہ شادی اس کے اور شہنشاہ کے درمیان خون کا رشتہ قائم کر دے گی اور غیاث بیگ کے لئے حوصلہ مندیوں کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی صرف مہرو کا انکار ہی اب اس میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ نہایت شدت سے اس کے احمقانہ اعتراض کی تردید کرے گا۔

"ابا جان! کیا آپ اس پر ایمان نہیں رکھتے؟" مہرو نے کہا "کہ جو کچھ ہماری زندگی میں پیش آتا ہے' وہ پہلے ہی ہماری تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے اور ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔"

"یقیناً یہی بات ہے! مہرو!" غیاث بیگ کے دل میں اس کے متعلق شبہ تھا۔ لیکن یہ موقع شبہ کے اظہار کا نہ تھا۔ "اس سے بڑھ کر ہماری عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ بادشاہ------ ہمارے آقائے ولی نعمت! تمہیں اپنے سایہ حمایت و حفاظت میں لے لیں۔"

"اور یہی آپ کی بھی خواہش ہے؟"

"یہ تیری مسرت و حفاظت کا پروانہ ہے! بیٹی! جب سے قافلے والوں نے تجھے میری گود میں ڈالا ہے' میری یہی تمنا رہی ہے! تو میری زندگی کا ہیرا ہے!"

اس نے اپنا دبلا پتلا ہاتھ مہرو کے سیاہ بالوں پر رکھ دیا اور وہ مسکرانے لگی۔

"آقائے ولی نعمت سے عرض کر دیجئے کہ کنیزان کے حرم میں داخل ہو گی!"

غیاث بیگ نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اپنے دل کو یقین دلایا کہ اگر مہرو کو یہ شادی پسند نہ ہوتی' تو وہ ہرگز حامی نہ بھرتی شادی کے دن تک وہ جہاں گیر کے لئے تحائف کی تیاری میں مصروف رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے آقا کو بدخشاں کے ترشے ہوئے لال شکاری کتے' مینا کاری کے لطیف و نظر فریب نمونے اور طلائی دہانوں کی ایرانی ساخت کی توپیں بہت پسند ہیں۔ اس دن غیاث بیگ نے ایک شان دار دعوت کی اور اپنے گھر کے گھر کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھول دیا' جو اپنے تئیں اس کا دوست کہتا تھا۔ اس نے غریبوں میں چاندی کے سکے لٹائے تاکہ سب لوگ جان لیں: وہ شہنشاہ کی اس قدر موصلہ افزائی پر کتنا مسرور ہے۔ مجلس نکاح کی تمام رسمیں اس نے اپنے ہاتھ سے ادا کیں۔ مہرو بیوگی کے سفید لباس میں تھی اور جہاں گیر مرصع پگڑی اور شاہی خلعت میں قاضی اور گواہوں کی موجودگی میں۔ دونوں کا نکاح ہو گیا اور وہ دونوں آپس میں میاں بیوی بن گئے۔

اس موقع پر کوئی سرکاری تقریب یا دعوت نہیں ہوئی۔ قاضی اور گواہوں کے چلے جانے کے بعد جہاں گیر دلہن کو فنس میں سوار کرا کے' جس کی حفاظت محل کے غلام کر رہے تھے' قلعے میں لے آیا۔ دیوان عام میں پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا اور فنس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ محل کی جھلملیوں سے ہزاروں آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب دلہن فنس سے اتری تو جہاں گیر اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے دیوان خاص کی طرف لے گیا۔ جب وہ آخری پردے کے پاس پہنچے' تو پہرے کے خواجہ سراؤں نے انہیں تعظیم دی اور ملازموں نے دوڑ کر زرتار پردے ہٹا دیئے۔

نئی دلہن اپنے شوہر کے ہم پہلو' حرم کی پہلی غلام گردش میں داخل ہوئی' جس کے بعد پردے گرا دیئے گئے۔ خلوت کدہ عروسی میں قدم رکھتے ہی' جو اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور جہاں خواصیں زرق برق لباس پہنے' ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ جہاں گیر نے خود اپنے ہاتھ سے پردہ گرا دیا۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے! جان من!" جہاں گیر نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا اور اس کا ہاتھ

بھدے پن سے دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے لگا۔ دلہن کی سبک دست انگلیاں ریشم کی جالی دار نقاب کو سرکی بندش سے آزاد کرانے کے لئے اس کی مدد کو بڑھیں اور جب اس کی آنکھوں نے ایک پھول سا چہرہ دفعتہ" شرم سے سرخ ہوتے دیکھا' تو اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا' "آخر کار! اب ہمارے تمہارے درمیان کوئی حائل نہیں رہا!"

ادھر حرم سرا کی غلام گردش میں سرگوشیاں سر سرانے لگیں۔ حیرت اور تعجب سوالوں اور پیش گوئیوں کی ایک رو تھی' جو ہر طرف دوڑ گئی۔

"ایرانی لڑکی نے جہاں گیر کو پھر اپنے دام حسن میں اسیر کر لیا..... ایک ایسی عورت سے شادی کرکے جو کسی اور کی بیوی رہ چکی ہے اور جس کے ساتھ' اپنے پہلے شوہر سے ایک لڑکی بھی ہے! اس نے اپنی روایات کو پامال کر دیا ہے..... کہیں اس کا بھی وہی انجام نہ ہو' جو شیر افگن کا ہو چکا ہے..... کہیں اس اجنبی لڑکی سے وہ بہت جلد نہ اکتا جائے' جس کی تربیت شاہی محل میں نہیں ہوئی۔"

جہاں گیر جو رات گئے خلوت کدہ عروسی سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تھا' اچانک اٹھ بیٹھا۔ اپنے قدموں پر جھکے ہوئے خادم سے اس نے وقت پوچھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ دن نکلنے میں صرف ایک گھڑی باقی ہے' تو حمام تیار کرنے کا حکم دیا۔ سنگ سماق کے گہرے حوض میں گرم اور معطر پانی بھر دیا گیا اور جہاں گیر نے اس میں ڈبکی لگائی۔ کپڑے پہن لینے کے بعد وہ حرم سرا کے بازو میں گیا' جو مہرو کو عطا کر دیا گیا تھا۔ غلام جب از راہ تعظیم اپنی پیشانیاں زمین پر ٹکانے لگے اور انہوں نے دبی زبان سے دعائیہ جملے کہے : حضرت سلامت! جہاں پناہ کی عمر دراز!" تو جہاں گیر نے انہیں اشارے سے خاموش کر دیا۔

"کیا وہ سو رہی ہے؟"

اس نے خاموشی سے کھلی چھت کا رستہ لیا۔ گلاب کی مسلی ہوئی پتیوں کی خوشبو اسے محسوس ہو رہی تھی۔ ایک رنگین فانوس کی روشنی فرش پر بکھری ہوئی تھی اور اس منقش پتھر کی دل فریب جفت کاری کو بھی اجاگر کر رہی تھی' جس کی جالیوں میں سے مہرو کی خواب گاہ نظر آتی تھی۔ جہاں گیر اسے ایک ریشمی بالاپوش پر تکیوں کے انبار میں لیٹے دیکھ سکتا تھا۔ ایک سفید ریشمی چادر اس کے سینے اور کمر کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

جہاں گیر کا ڈیل بھاری تھا۔ اس کے باوجود آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا' ان تکیوں کی طرف بڑھا' جو مہرو کے پہلو میں رکھے تھے۔ جب اس نے اپنی راحت جان کو آہستہ آہستہ

سانس لیتے دیکھا' تو اس کے چہرہ کی ساری شکنیں تحلیل ہو گئیں۔ اسی اثناء میں سورج کی پہلی کرن مرمریں جالیوں سے گزر کر اندر داخل ہوئی اور فانوس کی سرخ روشنی ماند پڑ گئی۔ مہرو کے رخسار کا نازک پیچ و خم اس کے گھنے بالوں میں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یہ عین مین وہی مہرو تھی۔۔۔۔۔ کیا اس وقت وہ جہاں گیر کو اپنی لمبی لمبی پلکوں کے سائے میں سے جھانک رہی تھی؟ وہ اب اس کی ہو چکی تھی۔ جشن بہار میں وہ ایک مسکراتی مورتی تھی اس کی آنکھیں نقاب میں چھپی تھیں' جسے استعمال کرنے کا سلیقہ بعض عورتیں خوب جانتی ہیں۔ لیکن اب وہ مورتی ایک جیتا جاگتا اور ہنستا بولتا وجود تھی : دل فریب اور دل نواز! اب وہ جہاں گیر کی ہو چکی تھی۔ ہر چند وہ ناقابل فہم اور ناقابل تسخیر تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تھی۔

دور سے ایک پر سوز آواز بلند ہوئی۔

حی علی الصلوۃ۔ حی علی الصلوۃ۔ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح۔ الصلوۃ خیر من النوم۔

یہ موذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ جہاں گیر کو فوراً" قلعہ سرخ کے باغ کا منظر یاد آ گیا۔ اور اس کا سانس چلتے چلتے رک گیا۔ مہرو نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھ کر مسکرائی :۔

"آپ یہاں ہیں؟ میرے سرتاج!"

"ہاں!" جہاں گیر نے بے سوچے سمجھے کہا : میں یہاں ہوں!"

مہرو نے سفید ریشمی چادر اپنے چاروں طرف لپیٹ لی۔ الجھے ہوئے سیاہ بالوں کو جھٹکا دے کر شانوں کے پیچھے ڈال دیا اور جہاں گیر کے قریب دوزانو ہو کر اذان کے الفاظ پر لب دہرانے لگی۔

اذان ختم ہونے کے بعد جہاں گیر مہرو پر جھکا' تو اس کے چہرہ پر ایک عجیب قسم کی بھوک تھی : "عزیز ازجان! کیا تم میرے ساتھ اس شادی سے رنجیدہ خاطر ہو؟ کیا تم آزادی کو زیادہ پسند کرتی ہو؟"

مہرو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ مسکرائی :

"میرے دل کی زندگی! کیا میں آپ کی نہیں ہوں؟"

"ہاں تم میری ہو! میں چاہوں' تو تمہیں قید رکھوں اور چاہوں' تو آزاد کر دوں!"

یہ ایک بچے کی سی ضد تھی۔ مہرو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا!

"جیسی آپ کی مرضی! کیا ظل سبحانی صبح ہوتے ہی رات کی محبت سے تھک گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے' تو یہ میرے لئے واقعی شرم کی بات ہے!"

جہاں گیر نے اس کا سر اپنے بھاری ہاتھوں میں لے کر اسے دائیں بائیں جنبش دی اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا:

"تھک گیا ہوں؟ سچ یہ ہے کہ میں کل شام تک اپنی زندگی سے اکتایا ہوا تھا۔ اب ہم جدائی کی بات کبھی نہیں کریں گے!"

مہرو نے از راہ مذاق تسلیمات بجا لانے کے لئے اپنے جسم کو جھکایا:

"اگر یہ بات ہے' تو آپ کی کنیز مطمئن ہے۔ اب میرے سرتاج کو بھوک لگی ہو گی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں جھروکے میں بھی جانا ہے۔"

مہرو کے اشارہ چشم پر خواصیں طشت اور طشتریاں لے آئیں اور جہاں گیر نے پوری رغبت کے ساتھ ناشتہ کیا' اسے اپنی دلہن پر حیرت ہو رہی تھی' جو دن کے کھانے سے پہلے صبح کے ناشتے کے متعلق سوچ سکتی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سورج چڑھ گیا اور اس نے دریا' ریتلے میدان اور محل کی دیواروں کو اپنی آتشیں شعاعوں سے گرم کر دیا۔ مرمریں جالیوں کا عکس ان دونوں پر پڑ رہا تھا۔ جہاں گیر کو یہ دیکھ کر پھر حیرت ہوئی کہ اس منظر نے مہرو کے حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے۔اس وقت اس کے ذہن میں بڑے لطیف لطیف خیالات آ رہے تھے:

"میں نے تمہارا ایک نیا نام سوچا ہے!" اس نے اعلان کیا "ایسا نام' جو بادشاہ کی بیگم کے لئے موزوں تر ہے۔ آج سے تم نور محل کہلاؤ گی!"

"محل کی روشنی------ بڑا دل فریب نام ہے۔"

"تمہارا نام یہی ہونا چاہئے۔ مہرو تم واقعی نور محل ہو۔"

بیرونی دیوار کے نیچے کا میدان جب ہجوم سے لبریز ہو گیا' جو شہنشاہ کے جھروکے میں رونق افروز ہونے کا انتظار کر رہا تھا' تو جہاں گیر بے دلی سے اٹھا۔ اس وقت سورج کو نکلے قریباً ایک گھنٹہ ہوا تھا اور آگرہ کے عوام' معمول کے مطابق' اپنے آقا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔

"انہیں انتظار کرنے دیا جائے!" جہاں گیر نے از راہ تساہل کہا! کیا وہ روزانہ وہاں جمع

نہیں ہوتے؟ "میں کھڑکی سے سکے پھینکنے کا حکم دوں گا۔ پھر ہم دونوں تماشا دیکھیں گے۔"

اپنی مرضی ظاہر کر دینے کے بعد جہاں گیر کو توقع بھی تھی کہ جھروکے کا ذکر دوبارہ نہیں آئے گا۔ لیکن مہرو' جسے ابھی ابھی نور محل کا نام دیا گیا تھا۔ اس وقت تک خاموش رہی جب تک جہاں گیر اس کی طرف نہیں مڑا۔

"اس کھلی چھت کے سائے میں' جو میرے سرتاج کا عطیہ ہے۔" وہ منمنائی! "ہوا کتنی ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔" جب سورج ڈھلے گا اور گرمی تیز ہو گی' تو میں اپنے سرتاج کی دربار سے واپسی تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر لوں گی اور اسے عطر گلاب سے بسا دوں گی۔

"عطر گلاب کیا ہے؟ ہم تو ایسی کسی چیز کو نہیں جانتے!"

"اماں جان اسے عطر گلاب کہتی تھیں۔" نور محل نے اسے ایک چھوٹی سی نقرئی عطر دانی پیش کی اور بتایا کہ وہ کس طرح گلاب کی پتیوں کو بار بار ابالنے کے بعد تیار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تفصیلات سے جہاں گیر کو بہت جلد دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی توجہ سے ایک ایک لفظ سن رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عطر دانی کو سونگھتا بھی جاتا تھا۔

"میرے سرتاج! اسے اپنے پاس رکھئے! تاکہ آپ نور محل کو فراموش نہ فرمائیں اور جلد ہی اپنی کنیز کے پاس تشریف لے آئیں۔"

جہاں گیر نے دیکھا کہ وہ اس کے ہم پہلو آہستہ آہستہ دروازے کی طرف حرکت کر رہا ہے لیکن وہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ نور محل کی خواہش پر وہ اب ایسا کر رہا ہے۔

"میں نے ایک شعر کہا ہے!" اس نے اعلان کیا: "اگرچہ تمہارے حسن کے مقابلے میں وہ ایک حقیر نذرانہ ہے پھر بھی میں سناؤں گا ضرور۔

مدتوں میں تیرے فراق میں دیوانہ رہا' اور اب کہ تیرے وصل سے شاد کام ہوں اس مسرت نے میرے حواس گم کر دیئے ہیں۔ (!)

کہو! کچھ پسند آیا؟ میرے دل کی ٹھنڈک!"

وہ جانتا تھا کہ شعر وہ کبھی کبھی از راہ تفنن موزوں کر لیتا ہے۔ البتہ اس کا مذاق سخن فہمی بڑا ستھرا تھا۔ فراش اور دوسرے درباری شاعر اگر یہ شعر سنتے' تو تعریفوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ لیکن وہ اپنی نئی محبوبہ کی زبان سے تعریف سننے کا انتظار کر رہا تھا۔

"جب تک میرے سرتاج واپس نہیں آتے" اس نے ایک شرم آگیں مسکراہٹ سے کہا۔ "واقعی اس شعر کی دلکشی' میری انتظار کی گھڑیوں کو آسان کر دے گی۔"

محل سرا کی غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا : مہرو------ جواب نور محل ہو چکی تھی------ اس کی مزاجی کیفیات کو کتنی خوبی سے سمجھ گئی' اور اس نے کتنی کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے' جب اسے داد گری کے لئے اس ہجوم کے پاس بھیجا ہے' جو اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اگر اس کی جگہ وہ ہندو لڑکی! پرتھوی ہوتی اور وہ یہ ارادہ ظاہر کرتا کہ میں حاضرین کو چھوڑ کر تیرے پاس رہنا چاہتا ہوں' تو وہ فاتحانہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگاتی۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ پرتھوی مشک و عنبر کی سی تیز خوشبو استعمال کرتی تھی۔

جب میدان کے اس پار' دریا کے کنارے اس نے ہاتھیوں کی پریڈ اور اصیل گھڑ سوار فوج کے "احدی" رسالہ کی قواعد دیکھی۔ تو اس کے دل میں مزید اطمینان پیدا ہو گیا۔ شاید نور محل نے اس کے شعر کو پسند نہیں کیا' اسے بہتر بنانے کے لئے کچھ الفاظ بدلنے چاہیں وہ فراش سے مشورہ نہیں لے گا۔ بلکہ کسی کو بتائے بغیر خود وہی اس کی نوک پلک نکالے گا۔

شہنشاہ کا دن واقعی مصروفیت کا تھا۔ "جھروکے سے اٹھ کر وہ دیوان عام میں پہنچا۔ جہاں بے شمار عرض داشتیں مختلف اہل کاروں کے ذریعے اس کے حضور پیش کی گئیں اور ان لوگوں کا ایک ہجوم پیش گاہ جہاں گیری میں حاضر ہوا' جو مناصب پر نئے نئے فائز کئے گئے تھے۔ یہ لوگ شہنشاہ کی خدمت میں سلام لشکر اور اپنے آقا کے قدموں میں اپنے سب سے پہلے نذرانے پیش کرنے بار یاب ہوئے تھے۔ جہاں گیر نے تمام نذرانوں کو توجہ کی آنکھ سے دیکھا اور چند نوادر جانچ پرکھ کے لئے اٹھا لئے۔ خزانے کے منشیوں نے تمام قیمتی اشیاء کی فہرستیں تیار کر لیں۔ اس کے تمام درباری اچھی طرح جانتے تھے کہ شہنشاہ کی خوشنودی چند نوادر بالخصوص ان ہیروں سے حاصل کی جا سکتی ہے' جنہیں وہ از حد پسند کرتا ہے۔ جب کبھی انصاف سے متعلق اس کے ذاتی شعور سے مرافعہ کیا جاتا' اس میں سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس جاگ اٹھتا'

دوپہر کے وقت وہ دیوان خاص میں پہنچا' جہاں امرائے ہند------ مغل' راجپوت اور افغان درباری لباس پہنے------ نقرئی کٹہرے میں ٹھسے ہوئے تھے اور خوشامد کی مسلسل بھنبھناہٹ کے سائے میں' ان کے درمیان سنگ سیاہ کے اس پتھر سے قریب تر بیٹھنے کی خاموش کشمکش جاری تھی۔ جس پر تخت شاہی نصب تھا۔ پتھر کے قریباً" وسط میں جہاں گیر کو

ایک سرخ سا دھبا معلوم ہوا۔ جو صاف نہ کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے سوچا: ہو سکتا ہے: یہ قدرتی ہو۔۔۔۔ اس سے کہا گیا تھا کہ یہ ایک بہت پرانا خون کا دھبا ہے' جو اس پتھر پر اس وقت پڑا تھا' جب تیمور اعظم نے سمرقند میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ جہاں گیر جب کبھی تھک جاتا۔ تو اکثر اس پتھر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا۔ لیکن آج وہ نقرئی عطر دانی میں ہمہ تن مشغول تھا' آخر کار درباری مصور: ابوالحسن نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ یہ نئی دل کش خوش بو کیا ہے جس کی مہک مور چھلوں کی ہوا سے فضا کو معطر کر رہی ہے۔

"یہ گلاب کا عطر ہے!" جہاں گیر نے مسرور ہوتے ہوئے بتایا۔

سورج ڈوبے ایک گھنٹے سے کم نہ ہوا تھا' جب وہ شہزادوں اور امیروں کے خفیہ اجتماع سے فارغ ہو کر اٹھا۔ یہ اجتماع "شاہ برج" میں ہوا تھا' جس پر منتخب ترک سپاہیوں کا پہرہ تھا اور جہاں نہ شاہی خاندان کا کوئی شہزادہ' جہاں گیر کے تحریری اجازت نامے کے بغیر داخل ہو سکتا تھا' نہ خدام کو اندر آنے کا حکم تھا۔ شہنشاہ کو حرم سرائے شاہی میں جانے کی اب فرصت ہوئی تھی۔ اس نے وہ موسیقی سننی بھی اس وقت پسند نہ کی جس کا کنیزوں نے باغ میں اس کے لئے بطور خاص اہتمام کیا تھا' بلکہ سیدھا نور محل کے کمرے میں پہنچا۔

"مجھے کوئی شعر سناؤ!" اس نے کہا! "کیوں کہ میں شعر گوئی میں مہارت نہیں رکھتا اور شاہ برج میں..... کوئی شعر سناؤ کہ میرے دماغ کو سکون ملے گا۔"

وہ اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تکیوں کے پاس بیٹھ گئی۔ نور محل کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ بغیر کسی کتاب یا مسودہ کے اس نے پڑھا۔

رات آ گئی اور تمام پرندوں نے اپنے اپنے آشیانے میں بسیرا لے لیا۔

رات آ گئی اور شاہ و غلام دونوں آمادہ استراحت ہو گئے۔ گویا ان میں کوئی فرق نہ رہا۔ (۲)

اس کی باریک آواز نے جہاں گیر کو تسکین دی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ یہ اشعار اپنے حافظہ سے' بغیر اٹکے سنا رہی ہے۔ جب وہ اشعار سنا چکی' تو جہاں گیر نے مارے خوشی کے تالیاں بجائیں اور از راہ تفاخر قہقہے لگائے۔

"تو ساحرہ شب ہے! اور دیکھ! یہ سلطان اب تیرا غلام ہو گیا ہے!" اس نے اپنا لچکیلا جسم نور محل کے گھٹنوں پر ڈال دیا اور ان آنکھوں کو دیکھنے کے لئے جھکا' جو اسے تک رہی

تھیں! "تیرا غلام!"

محل سرا کے اندرونی واقعات سے دلچسپی رکھنے والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ جہاں گیر اپنی نئی محبت سے بہت جلد نہیں اکتائے گا۔ اسے محبت میں کھلونے سے زیادہ کوئی چیز مل گئی ہے جس نے اس کی توجہ کو جذب کر لیا ہے۔

☆☆☆

(۲)

آگرہ کے قلعہ سرخ میں مغلوں کے شاہی حرم کی دنیا ہی الگ تھی' جو خاص محل کی ان دیواروں سے شروع ہوتی جن پر آٹھوں پہر مسلح پہرہ رہتا تھا اور دالانوں اور مرمریں ایوانوں سے گزر کر منقش چھتوں اور شامیانہ دار صحنوں کو اپنی آغوش میں لیتی ہوئی تالاب والے باغ پر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ حریر و دیبا کے پردوں کے پیچھے پیچھے دیوان خاص کے اس گوشے تک پھیلی ہوئی تھی جس کی مرمریں جھلمليوں کے عقب میں بیٹھ کر بیگمات شاہی دربار کی باتیں سن سکتی تھیں بلکہ اگر وہ ریشمی پردوں میں ناخنوں سے سوراخ کر لیتیں تو ان کے لئے مردوں کے چہرے دیکھ لینا بھی دشوار نہ رہتا تھا۔

حرم سرا کی اندورنی دنیا مختلف پہلو رکھتی تھی اس لئے کہ حرم سرا میں نہ صرف شہنشاہ آکر شب باش ہوتا تھا بلکہ نو عمر شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی وہیں تھا۔ حرم سرا کے حمام اور سازندے بھی اپنے تھے۔ بنگالی خواجہ سرا اندر باہر آتے جاتے تھے اور نہ صرف بیگمات کے لئے سودا سلف خرید کر لاتے بلکہ اکثر انہیں بیرونی دنیا کے حالات سے بھی باخبر رکھتے تھے۔

شاہی حرم سرا یا "زنان خانہ" ایک ہی آقا ـــــ شہنشاہ جہاں گیر ـــــ کے تابع فرماں تھا' لیکن اس پر شہنشاہ اکبر کی بڑی بیوہ سلیمہ اور اس کی سوکن رقیہ کا اثر و رسوخ بھی کچھ کم نہ تھا اور چونکہ یہ دونوں دودمان تاتار کی سربراہ تھیں' اس لئے اطاعت طلبی کی عادی ہو چکی تھیں۔ جوانی میں وہ مغلیہ فوجوں کے ہمراہ دشوار گزار راستوں کی طویل مسافتیں طے کر چکی تھیں۔ اس لئے انہیں بھوک' پیاس اور پہاڑوں پر پسپائی کی صعوبتوں کا بخوبی اندازہ تھا' بلکہ کہتے ہیں کہ سلیمہ نے تو ایک مرتبہ چوگان بھی کھیلا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے فوجی جوانوں کی کمانوں کے لئے تیر بھی تیار کر چکی تھی' پھر شاہی محل کے مسلح پہریدار یہ دیکھ کر بھی حیرت سے دم بخود ہو گئے تھے کہ وہ تن تنہا اتنا بڑا طبل بھی بجا سکتی ہے' یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص بھی اس پردہ دار تاتاری خاتون کو ٹوکنے کی جرات نہ کر سکتا تھا اور

سلیمہ خود بھی پردے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتی تھی۔

ایک خود اعتماد راجپوتنی ـــــــ جہاں گیر کی ماں ـــــــ شاہی محلات کی ان ہندو خواتین کی سردار تھی۔ جن کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ان خواتین کے سر پر راجپوت نسل کا غرور ہمیشہ سوار رہتا' جس کے ڈانڈے ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے جا ملتے تھے' اس لئے وہ حتی الوسع مسلمان بیگمات سے ملنا جلنا پسند نہ کرتی تھیں۔ ان میں سے اکثر اپنے تئیں فاتحوں کے اس بربری ماحول میں تنہا پا کر بے چارگی کی آگ میں جلتی رہتیں اور کسی کونے کھدرے میں افیون کی چسکی لگا کر اس کی "پینک" میں اپنا وقت گزار دیتیں۔ انہیں مغلوں کے اچھے برے سے کوئی واسطہ نہ تھا البتہ جب ان کی اپنی عزت کا سوال آتا تو یہ بے تعلقی ناممکن ہو جاتی۔

جہاں گیر کی حرم سرا میں قریباً" ایک درجن بیگمات تھیں جن کے علیحدہ علیحدہ محلات بنے ہوئے تھے۔ وہ بظاہر تو اپنے بڑوں کا احترام کرتیں' لیکن درپردہ ان کا میل جول اپنے باہر کے رشتہ داروں سے بھی رہتا تھا۔ وہ بڑے بڑے راجاؤں اور امیروں کی بیٹیاں تھیں۔ جن سے شہنشاہ نے کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر شادی کر رکھی تھی۔ ان میں سے جو گدی پر بیٹھی ہوتیں وہ صاحب اولاد خواتین کے خلاف اپنے دلوں میں رقابت کے شعلے دہکائے رکھتیں۔

شاہی محل سرا میں وہ خواتین بھی تھیں جنہیں "پرستارہ" کہا جاتا تھا' ان کا درجہ بیویوں کے برابر تو نہ تھا' لیکن شاہی محل میں ان کا اثر و رسوخ بھی اتنا ہی ہوتا تھا جتنا بیگمات کو حاصل تھا ان خواتین کی سربراہی پرتھوی کے سپرد تھی' جو کسی زمانے میں رقاصہ تھی۔ یہ جن زیورات سے لدی پھندی رہتی وہ کسی مہاراجہ کے "زرخلاصی" کے لئے کافی ہو سکتے تھے۔ اس نے ایک چیتا پال رکھا تھا جو بڑی آزادی سے دالانوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اگرچہ اس کے پنجوں کے ناخن اکھیڑ دیئے گئے تھے' تاہم کنیزیں اس سے خوفزدہ رہتی تھیں۔

شاہی محل سرا میں لونڈیوں کی ایک اچھی خاصی فوج تھی۔ میدان جنگ سے لائی ہوئی کنیزیں تھیں' ہنگامہ پسند اور لومڑیوں کی سی کھوجی نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ان میں خواصیں بھی تھیں' تربیت یافتہ رقاصائیں بھی' اور سیاہ فام حبشنیں بھی۔

شاہی محل سرا کی خواتین بیرونی دنیا سے بالکل بے تعلق نہ رہتی تھیں بلکہ ان کی رشتہ دار عورتیں مختلف تقریبات کے سلسلے میں ان کے پاس آتی جاتی رہتی تھیں اور امیرزادیوں

کے باپ دیوان عام تک جا سکتے تھے۔ جب شہنشاہ سفر پر جاتا تو ان میں سے اکثر کو اس کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوتا۔ البتہ ہندو اور مسلمان بیگمات کے لئے پردہ یکساں لازمی تھا' وہ نقاب ڈالتی تھیں اور انہیں نقاب ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ وہ نہ تو اکیلے شاہی محل سرا کے باہر قدم رکھ سکتی تھیں' نہ کوئی غیر آدمی شاہی محل سرا میں جا کر ان سے مل سکتا تھا۔ انہیں پردہ میں اس طرح رکھا جاتا' جیسے خوش رنگ پرندے باغ کے پنجروں میں ہوں۔ کم از کم جب وہ شہنشاہ کی سواری کے جلو میں ہوتیں تو باہر کے لوگوں کو یہی احساس ہوتا۔ ان کو "محل ہائے شاہی" کہا جاتا تھا۔ وہ شاہی محل سے جالی دار پالکیوں یا مملوں یا بند ہودجوں میں سوار ہو کر باہر نکلتیں ان کے ارد گرد گھڑسواروں کی ہمراہی میں حرم کا محافظ دستہ ہوتا اور آگے آگے چوبدار راستہ صاف کرتے جاتے باہر کا کوئی شخص ان کے قریب بھی نہ پھٹک سکتا تھا' چنانچہ یہ بات آداب شاہی میں داخل تھی کہ جب کبھی حرم شاہی قریب سے گزرے عوام یا تو نگاہیں جھکا لیں یا ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔

اس لحاظ سے تو بیگمات' دربار شاہی کی شان و شکوہ کا ایک جزو تھیں لیکن اپنے اپنے دائرے میں ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ ان میں سے بعض ممتاز بیگمات کے سپرد دعوتوں اور ضیافتوں کا اہتمام تھا اور جو بہت نیک دل تھیں انہوں نے تقسیم خیرات کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ وہ ان ہزاروں ہندو اور مسلمان عورتوں' لڑکیوں' یتیموں مسکین بیواؤں' بے گھروں' طلاق یافتہ دکھیاریوں اور بھکارنوں کی مدد کرتی رہتی تھیں۔ جن کا تانتا کبھی ٹوٹنے ہی میں نہ آیا تھا اور جو اپنے گھروں کی چار دیواری میں اس طرح دکھ جھیلتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زنان خانے میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ کوئی حج کے لئے روپیہ مانگتی' کوئی اپنے بال بچوں کے لئے کپڑا لتا' کوئی مریض کے لئے دوا چاہتی' کوئی دشمن کے خلاف انصاف طلب کرتی اور کوئی بد دعا کا اثر زائل کرنے کے لئے تعویذ کی خواست گار ہوتی۔ اگرچہ ان ایوانوں میں بازاروں کی فقیرانہ صدائیں کبھی نہ گونجتیں۔ تاہم باہر کی عورتوں کی فریادوں کا سیل تھمنے میں نہ آتا تھا۔

شاہی محل کی یہ بیگمات کپڑوں کے انتخاب اور تیاری میں بھی دربار کی قابل قدر خدمات انجام دیتی تھیں۔ ان کی لونڈیاں اور مغلانیاں نئی نئی پوشاکیں سیتیں' زردوزی کا باریک کام کرتیں اور خوب صورت پردے بناتیں جو دیواروں کو آراستہ کرنے کے علاوہ کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹکانے کے کام آتے' اسی طرح پاپوش' کمربند' صدریاں' خلعت'

عمامے، تولیے، چاندنیاں، تکیوں کے غلاف چہرے کی نقابیں اور سینکڑوں دوسری اشیائے ضرورت سب کی سب انہیں خواتین کی ہنرمندی اور سلیقے کا کرشمہ ہوتی تھیں۔ ہندوستان کی گرمی میں سفر کرنے اور اپنی غیر معمولی شان و شوکت کے مظاہرے کو برقرار رکھنے کے لئے مغل دربار کو وزنی سازو سامان یا دھاتوں کے برتنوں کی ضرورت بہت کم باقی رہ جاتی اور تمام تر توجہ باریک اور ہلکے پھلکے کپڑوں پر مرکوز کر دی جاتی، حتیٰ کہ ہاتھی گھوڑوں کے لئے ساز بڑی دیدہ ریزی سے تیار کئے جاتے" اثنائے سفر میں دربار خیموں اور شامیانوں میں لگایا جاتا تھا۔ جب کبھی قدیم چین سے خالص ریشم یا اصفہان سے زر بفت یا پرتگالی تاجروں کے ذریعے سے سرخ مخمل آتی تو ان خواتین کی گویا عید ہو جاتی تھی۔ زردوزی کا کیسا بھی سبک نمونہ ہو اس کی ایک ہفتے کے اندر اندر نقل اتار لی جاتی تھی اور اگر ساڑھی باندھنے کا کوئی نیا فیشن معلوم ہوتا تو اسے سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنا لیا جاتا تھا۔ بعض عورتوں کے ریشمی زیر جامے اتنے نازک ہوتے کہ وہ صبح کو پہننے کے بعد شام کو اتار دیئے جاتے تھے۔

لیکن شاہی محل کی خواتین کی زندگی کے ان بے شمار پہلوؤں میں سے شہنشاہ جہانگیر کو صرف ایک پہلو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا اور یہ پہلو تھا اپنے آقا کی مکمل وفاداری کا جس کا حق نعمت کبھی ادا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جب وہ شہنشاہ کی خدمت میں باریاب نہ ہوتیں ـــــــ اور حضوری کا شرف شہنشاہ کی منظور نظر یا مغلیہ خاندان کی بڑی بوڑھی خواتین کو بھی کبھی کبھی ہی نصیب ہوتا تھا ـــــــ تو انہیں حرم کی ایک لامتناہی کش مکش میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ ان کی اور ان کے عزیز و اقارب کی قسمت کا انحصار اگر "سرچشمہ تقدیر" (شہنشاہ) پر نہیں تو ان بیگمات پر ہوتا تھا جو شہنشاہ کا اعتماد حاصل کر لیتیں اور اس کے فیضان سے مستفیض ہوتی رہتی تھیں۔ حرم سرا کے اقتدار میں شوخ ادا پرتھوی یا باعظمت سلیمہ سے لے کر کسی بدقسمت یا ٹھکرائی ہوئی داشتہ کے ادنیٰ سے پیغامبر تک اپنی اپنی حیثیت کے مطابق غیر محسوس طور پر سب شریک تھے۔

ان خواتین کو شہنشاہ کی نوازش ہیرے جواہرات اور غلاموں سے بھی کہیں زیادہ دولت دلا لیتی۔ شہنشاہ کی نگاہ کرم کے طفیل انہیں نہ صرف زمین مل جاتی بلکہ وہ جاگیر پانے کی مستحق بھی ہو جاتیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی منظور نظر خاتون کو شاہی محل کی اندرونی کش مکش سے نجات نہ مل سکتی۔ اس کے سہارے جینے والے بسا اوقات اس کے اختیارات

میں شریک ہو جاتے اور اگر اس کے بچے ہوتے تو وہ حرم کے دوسرے بچوں کے حریف بن جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے گروہ بندی کے جال میں پھنسنا پڑتا تھا۔ یا تو اس پر جاسوس چھوڑ دیئے جاتے یا وہ خود دوسروں کی جاسوسی کرنے پر مجبور ہو جاتی' اسے غلام گردشوں کی کھسر پھسر پر ہمیشہ کان لگائے رکھنے پڑتے اور وہ بیرونی دنیا کے واقعات سے بھی بے خبر نہ رہ سکتی تھی۔ گویا وہ اپنا ایک علیحدہ دربار بنا کر اس کی تاج دار بن جاتی اور اسکی ذرا سی بے پروائی کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اپنا تاج کھو بیٹھے۔ وہ اپنے حریفوں سے مطلق سے مطلق کسی رحم و کرم کی توقع نہ رکھ سکتی تھی۔

اس وقت مغلوں کے حرم میں دو متوازن کرنے والی قوتیں برسر عمل تھیں۔ شاہی محل پر بزرگ تاتاری خواتین نے مردوں کی طرح دبدبہ قائم رکھا تھا لیکن ان میں سے کچھ مر چکی تھیں اور جو باقی رہ گئی تھیں وہ بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ جہانگیر کے عہد حکومت کے ابتدائی چند سال چھوڑ کر------ جب اس کے سب سے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کی تھی اور اس کی راجپوت ماں نے خود کشی کر لی تھی------ شاہی حرم میں ہندوستان کی خانہ جنگی کے باعث ہنوز پھوٹ نہیں پڑی تھی۔

نور محل بڑی خاموشی سے حرم کی زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ چونکہ ایرانی النسل تھی اس لئے جہانگیر کی دوسری بیویوں میں اسے اپنی ہم وطن کوئی عورت نظر نہ آئی۔ وہ خراساں کے ایک جہاں گشت کی بیٹی تھی۔ اس لئے شاہی محل کی ہندو یا مسلمان بیگمات میں اس کا نہ کوئی حلیف تھا نہ حریف وہ سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتی اور ہمیشہ سفید ماتمی لباس پہنے رہتی محل والے اسے "حجلہ عروسی کی زینت" کہتے تھے۔

اس کی اور شوخ ادا پرتھوی کی سب سے پہلی ملاقات میں اچھی خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ہندو رقاصہ اپنی کنیزوں کے ہمراہ غسل کرنے جا رہی تھی کہ اس نے ایرانی بیگم کو تن تنہا صحن چمن میں کھڑے دیکھا شاہی محل کی سینکڑوں آنکھیں بڑے اشتیاق کے ساتھ ان دونوں کے دبلے پتلے اور بالکل بچوں کے سے چہروں کی طرف اٹھ گئیں۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے ٹکرائیں۔ پرتھوی ایک ادائے کنیزانہ کے ساتھ جھکی اور رقاصاؤں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا۔ مرمریں سلوں سے منعکس ہوتی ہوئی سورج کی شعاعیں اس کے طلائی بازو بندوں اور سبز ریشمی لباس پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک ناقابل تقلید پیرائے میں جس میں طنز کی اچھی خاصی آمیزش تھی' اشارۃً" اسے جتا دیا تھا کہ جو کام

نور محل سے نہ ہو سکا اسے کرنے میں اس نے لذت محسوس کی ہے۔

"بہت خوب"! ایرانی بیگم کی شفاف آواز نے فوراً" اسے شاباش دی "واقعی تم اپنا فن خوب جانتی ہو بہن!"

اور وہ رقاصہ ہی کی طرح ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی چلی گئی اور اپنے پیچھے صحن چمن میں عطر گلاب کی خوشبو چھوڑ گئی۔

پرتھوی کسی سوچ میں ڈوب کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس نے نہانے کا خیال ترک کر دیا اور اپنے کمروں کی چار دیواری میں پہنچ کر آئینہ طلب کیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رخسار ضرورت سے زیادہ پھول گئے ہیں اور اس کی آنکھیں کچھ کچھ باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس پر غم کی تاریکی چھا گئی جسے اس کی کنیزوں کے تعریفی جملے بھی دور نہ کر سکے۔

اس واقعے کے بعد سے پرتھوی نے اپنے تئیں نور محل کے کمرے کی ایک ایک بات سے باخبر رکھنے کا درد سر مول لے لیا۔ اسے شدہ شدہ تمام حالات معلوم ہوتے رہتے تھے' نور محل نے اپنی خواصوں کے ساتھ بیٹھ کر بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔ اس نے سوزنیوں کے نئے نئے نمونے تیار کئے ہیں۔ اس نے سرمہ کے سوا پلکوں میں کوئی چیز لگائی ہے اس کے پاس بادشاہ کے سوا کوئی نہیں آتا' جو اسے ہر روز صبح ایک نیا تحفہ بھجواتا ہے' اس کے پاس اب پہلے سے دو گنے غلام ہو گئے ہیں وہ کھڑکی میں بیٹھ کر فارسی کے اشعار گنگنا رہی تھی' وہ آئینہ سامنے رکھ کر مختلف شکلیں بنا رہی تھی۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی اس ہندو رقاصہ کو مطمئن نہ کر سکی جو نئی دلہن کو رقیب سمجھ کر خفا خفا سی رہنے لگی تھی۔ آخر اس نے سوچ سمجھ کر دالانوں میں ایک گپ چھوڑی اور مشہور کر دیا کہ نور محل دربار میں آ کر جشن نوروز کی دعوت پر جہانگیر سے اس لئے ملی کہ اپنے پہلے خاوند کی موت کا انتقام لے سکے۔ وہ تمام زہروں کے راز خوب جانتی ہے۔ اس نے گلاب کے عطر میں دھتورے کا ست ملا کر چوہوں کو بھی ہلاک کیا ہے۔

سلیمہ نے یہ گپ سنی' تھوڑی دیر تک اس پر غور کیا اور رسماً" نور محل کے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے خادمہ کے ذریعے سے اطلاع کرائی اور اپنے تمام بربری زیورات پہنے چہرے پر غازہ لگائے اپنی کنیزوں کے ہمراہ کمرے میں جا پہنچی۔ سن رسیدگی اور اقتدار کی نادیدہ قبائے فضیلت اس کے سراپا میں تمکنت و جلال کی شان پیدا کر رہی تھی۔

نور محل نے اس کے جھریوں بھرے بزرگانہ چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جھک کر کورنش بجا لائی۔ ایک گھنٹے میں بہ مشکل انہوں نے ایک بات کی ہو گی۔ ایرانی خاتون نے مہمان کی تواضع پلاؤ' زردے اور قورمے سے کی۔ آخر جب خواصوں نے دسترخوان بڑھایا اور دونوں اکیلی رہ گئیں تو سلیمہ نے اپنے پنکھے کو تڑاخ سے کھولا اور بند کیا۔۔۔۔۔ ایسے موقعوں پر وہ چین کے بھاری پنکھوں میں سے ایک پنکھا اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔۔۔۔۔ اور جیسے اپنے دل سے باتیں کرنی شروع کر دیں:

"میں تو بوڑھی ہو گئی ہوں" سلیمہ نے بڑے رازدانہ لہجے میں کہا۔ "جب میرا دم نکل جائے گا تو رقیہ حرم سرا کی سردار ہو گی" اس نے کنکھیوں سے نور محل کی جانب دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ہمدردی اور دلچسپی کے سوا کوئی تاثر نمودار نہ ہوا۔ بیوہ مشاہدہ نفس میں کھوئی تھی اور دلہن نے اپنے جذبات پر ایک پردہ ڈال لیا تھا۔

"مہرو!" سلیمہ نے اس کے بچپن کا نام لے کر پکارا۔ "میں نے تمہیں اپنے سایہ عاطفت میں اس وقت لیا تھا جب تم بیوہ ہو گئی تھیں میں نے ہی یہ انتظام کیا تھا کہ جشن نوروز کی رات تم پر بادشاہ کی نظر پڑ سکے!"

نور محل نے دبی آواز میں شکریہ ادا کیا لیکن سلیمہ مطمئن نہ ہوئی۔

"شاید خرم کی ماں کو چھوڑ کر بادشاہ کی بیویاں تو سائے کی طرح بے حقیقت تھیں واللہ میرے زمانے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہم ہمیشہ عرش آشیانی کے ہمرکاب رہتے تھے وہ بھی ہر وقت ہم سے مشورہ لیتے اور ہمیں خدمت کا موقع دیتے تھے لیکن اب تمہارے شوہر۔۔۔۔۔ شہنشاہ۔۔۔۔۔ کے ساتھ کون سفر کرتا ہے۔ ہاں! کبھی کبھی رقاصہ پرتھوی اس کے ہمرکاب ہوتی ہے!"

ایرانی بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیوی نے جھنجھلا کر پنکھا بند کر دیا۔

"وہ تمہاری بچی کہاں ہے؟ یہاں تو مجھے نظر نہیں آتی۔"

"یہاں محل سرا سے باہر پیدا ہونے والوں کا کیا کام؟ وہ اپنے گھر میں خوش ہے اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھیل رہی ہو گی۔"

"کیا کہا؟ یہاں اس کا کوئی کام نہیں۔" تاتاری خاتون کی سیاہ آنکھیں غصے سے بھڑک اٹھیں۔ "تو کیا یہ تمہارا اپنا گھر نہیں اور..... اور" وہ یکایک خاموش ہو گئی۔

"اونہہ!۔۔۔۔۔ چلو ہو گا لیکن مجھے سنانے سے کیا فائدہ؟ سنبلی باگھنی! میں تو گور میں پاؤں

لٹکائے بیٹھی ہوں۔ یہ آج کل کی چھوکریاں خواہ مخواہ میرے پیٹھ پیچھے کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں۔ لومڑیاں کہیں کی! انہیں ادھر ادھر بھاگنے اور بھٹوں میں جا گھسنے کے سوا کام ہی کیا ہے۔ یوں بھی مجھے اونچا سنائی دیتا ہے۔ ان میں سے بعض تیرے سرتاج کو افیون کھلا دیتی ہیں' جب وہ ان کے پاس ہوتا ہے ہاں! افیون ------افیون ہی اس کے دادا حضرت کا بھی سہارا اور سرمایۂ تسکین تھی۔ اس کے دو بھائی دانیال اور مراد------ شراب پی پی کر مر گئے دانیال کو گھڑسواری اور شکار کا بے حد شوق تھا---- ہاں' اس کے پاس ایک بندوق تھی جس کا نام اس نے "یکہ و جنازہ (۳)" رکھا تھا۔ وہ بہت بڑی بندوق تھی لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ فی الواقع "یکہ و جنازہ" ثابت ہو گی۔ جب میرے سرتاج نے دانیال کو شراب پینے سے منع کیا تو اس نے مسلح پہرے داروں کی منت خوشامد کرکے "یکہ و جنازہ" کی نال میں دو آتشہ منگوا لی۔ نال میں ایک مدت سے بارود اور اس کی بوسی ہوئی تھی اور شراب کی تیزی سے لوہے کا زنگ بھی پگھل گیا۔ دانیال نے گھونٹ بھرا ہی تھا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اسی وقت اللہ کے سایہ رحمت میں چلا گیا۔ تیرا سرتاج بھی اسی جیسا ہے..... اچھا' میں خاصی باتیں کر چکی۔ اور تیری زبان بس ایک دو ہی دفعہ ہلی ہے۔"

سلیمہ اپنے تصورات میں کھوئی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

چند روز بعد جب اسے خبر ملی کہ خرم اس "باگھنی" کو------ وہ نور محل کو "باگھنی" ہی کہا کرتی تھی------ کوئی تحفہ دینے آیا ہے تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

سلیمہ نے اس معاملے میں خاص دلچسپی اس لئے لی کہ خرم شہنشاہ کا لاڈلا بیٹا تھا اور متین چپ چاپ ذہین اور بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اب وہ سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا وہ جہاں گیر کا تیسرا بیٹا تھا اور راجپوت ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن طبیعت جہاں گیر کے بالکل الٹ پائی تھی جس نے ایک دفعہ اسے نصیحت کی کہ

"شراب تھوڑی پیو اور انسان زیادہ بنو۔"

ہر چند وہ سلطنت کا ولی عہد تھا اور رقیہ بیگم کا چہیتا بھی اس کے باوجود اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس کی رنگت زرد تھی اور اس کی آنکھوں سے سرد مہری ٹپکتی تھی۔ سلیمہ پہلے تو اس سوچ میں رہی کہ وہ نور محل کو تحفہ دینے کیوں آیا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ گھوڑا تحفتہ" دیا گیا ہے تو اس کی حیرانی و سرگشتگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے حیرت دور کرنے کے لئے حکم دیا کہ مجھے دالان کی ان مرمریں جالیوں تک پہنچا دیا جائے جن

سے وہ بیرونی صحن نظر آتا ہے جہاں سفر پر جانے والی شاہی بیگمات ہاتھیوں پر سوار ہوتی ہیں۔

نور محل صحن میں پہلے ہی موجود تھی اور خرم نے جو نفیس عربی گھوڑا اسے "تحفتاً" دیا تھا اس کی ایال تھپتھپا رہی تھی۔ سلیمہ نے اسے چرمی زین کے سرخ بیل بوٹوں اور مرصع باگ کی تعریف کرتے سنا۔ ایرانی بیگم نقاب میں تھی اور اس نے ریشمی پاجامہ اور سفید مخمل کی صدری پہن رکھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا: گھوڑا اسے واقعی دل سے پسند آیا ہے۔

"یہ بڑا سبک خرام ہے۔" خرم اس سے کہہ رہا تھا۔ "اس پر سواری کرو گی؟"

"یقیناً"..... ایرانی بیگم کی مترنم آواز دالان میں گونجی "اور ابھی!" یہ کہہ کر اس نے اپنی دونوں ٹانگیں زین کے دونوں طرف رکھ لیں۔

"ذرا سنبھل کر۔" خرم نے فوراً" اسے ہدایت دی "وہ ابھی تمہیں پہچانتا نہیں۔"

"نہیں! پہچانتا ہے!"

اس نے باگیں ذرا کھینچ کر سفید عربی گھوڑے کو پہلے ایک دائرے میں آہستہ آہستہ چکر دیئے اور اس کے بعد اسے دلکی پر ڈال دیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا سر اوپر کی طرف اٹھا کر یک لخت رک گیا۔ لیکن جونہی نور محل نے رانوں سے اس کا جسم دبایا وہ بڑی آسانی سے پھر دوڑ پڑا۔ سوار اور گھوڑا دونوں بڑی ہم آہنگی سے متحرک نظر آتے تھے۔ وہ بغیر کسی ظاہری علامت کے موڑ مڑنے' بھاگنے اور رکنے لگے۔ نور محل کے بال کھل کر اس کے حسین شانوں پر بکھر گئے۔ دھوپ میں اس کی من موہنی صورت اتنی اچھی معلوم ہوتی تھی کہ محل کے خدام بھی اسے دریچوں اور کھڑکیوں کی اوٹ سے جھانکنے لگے۔ شاہی حرم کی عورتیں دالان کی جالیوں میں آ کر سلیمہ کے پاس کھڑی ہو گئیں اور بادشاہ کی ایک بیوی کو صحن میں گھوڑا دوڑاتے دیکھ کر اونچی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"شاباش!" ایک آواز بلند ہوئی جو دوسری سب آوازوں پر بھاری تھی۔ "بہت خوب!" لیکن اس آواز میں استہزا تھا اور سلیمہ نے خیال کیا کہ یہ پرتھوی کی کسی خواص کی آواز ہے۔

"بیٹی!" کوئی دوسرا چلایا۔

نور محل کو یہ آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے صحن کا آخری چکر کاٹ کر

گھوڑے کو عین دالان کے نیچے ٹھہرا دیا۔ خرم آگے بڑھ کر اس کی رکاب تھامنے ہی کو تھا کہ وہ خود بخود پھسل کر زمین پر آ رہی اور خرم کے چھونے سے پہلے ہی اس سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بازو دھوپ میں بجلی کی طرح لہرائے اور اس نے بکھرے ہوئے بالوں کو باندھ کر اپنے تئیں ایک ادا کے ساتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر اپنا سر اونچا کر کے جالیوں کی طرف دیکھا اور قہقہے لگانے لگی جیسے وہ بے حد خوش ہے۔

سلیمہ نے ناک بھوں چڑھائی لیکن کسی اندرونی جذبے نے اس کے باطن میں ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ شام کو جب سلیمہ اور رقیہ جمع ہوئیں تو گھوڑے کے واقعے پر رائے ظاہر کرتے ہوئے سلیمہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"باگھنی' باگھنی ہی رہتی ہے چاہے وہ انسانوں ہی میں کیوں نہ پلی ہو!"

"لیکن اگر اسے پنجرے میں بند رکھا جائے؟"

"تو بھی وہ باگھنی ہی رہے گی۔ نور محل صحرا زادی ہے۔"

"مجھے تو خطرہ ہے کہ اس نے خرم پر جادو کر رکھا ہے۔"

"خرم پر؟" سلیمہ نے اپنا پنکھا دو دفعہ کھٹکھٹایا۔ "کیا یہ نور محل کا قصور ہے کہ شہزادہ اس کی رکاب تھامے دوڑتا اور اسے بھیڑ کی سی نگاہوں سے دیکھتا ہے؟"

جذباتی شہزادے کی طبیعت میں جو عجیب و غریب انقلاب آ رہا تھا اسے دیکھ کر سلیمہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ وہ نور محل کو روزانہ تحفے تحائف بھیجتا تھا۔ کبھی پھل اور کبھی جواہرات۔ خرم کو نفیس جواہرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ بعض اوقات وہ نور محل سے باتیں بھی کرنے لگتا اور دونوں خاص محل میں دیر تک بیٹھے رہتے۔ بظاہر وہ جذبات سے عاری نظر آتا تھا لیکن جب بھی وہ حرم سرا کے بیرونی کمروں میں آ کر دیکھتا کہ نور محل غائب ہے تو اس کی نگاہیں دوسری خواتین میں اسے بے اختیار ڈھونڈنے لگتی تھیں۔

لیکن ہوشیار سے ہوشیار آنکھ کو بھی ان واقعات میں کوئی ایسی "بات" نہ مل سکی جسے "بتنگڑ" بنایا جا سکتا۔ خرم کو باپ کی طرح شکار یا کھیل تماشے' یہاں تک کہ ہاتھی کی لڑائی دیکھنے کا بھی شوق نہ تھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ "شہ برج" میں کوئی مفید مشورہ دے سکتا یا میدان میں فوج کی کمان سنبھال سکتا تھا لیکن کھیل کود سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ تاہم وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا اسے انجام تک پہنچاتا اور اسے بڑی سنجیدگی سے کرتا۔ پہلے بھی حرم میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ نور محل میں خاص دلچسپی

لے رہا ہے۔

"وہ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔" رقیہ نے شکایت کی۔ "جیسے غم کی تلاش میں ہو۔"

خرم نے حسب معمول کوئی بات نہ کی۔ کچھ دنوں کے بعد نور محل نے اسے اپنے کمروں میں آنے کی اجازت دے دی۔ جہاں گیر کے فرزند ہونے کی حیثیت سے خرم کو اس کا حق بھی پہنچتا تھا۔ وہاں اس نے نور محل کو دوسری عورتوں کے ساتھ دیکھا اور یہیں اس کی نگاہ ایک نوخیز لڑکی ارجمند پر پڑی۔

وہ یا تو سب سے الگ زردوزی کے کام میں مصروف نظر آتی یا دوسری خواصوں کے ساتھ دیوار سے لگے ہوئے گدوں پر بیٹھی ہوتی وہ سر سے پاؤں تک تن زیب میں لپٹی رہتی اور سوائے ستواں ناک اور اس کے اوپر دو خوب صورت بھوری آنکھوں کے اس کے جسم کو کوئی حصہ نظر نہ آتا۔ لیکن خرم اسے اس کی ہنسی سے پہچانتا' جو دوسروں سے الگ تھی۔ وہ نور محل کا ممنون تھا کہ وہ ارجمند کو ہمیشہ اپنے پاس بٹھاتے رکھتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا؟ وہ اس کی بھتیجی جو تھی۔ خرم کو ارجمند کا لڑکپن یاد تھا۔ جب اس کا منہ شکر قند سے بھرا رہتا لیکن اب وہ اس کی موجودگی میں کچھ نہ کھاتی۔

"بی فاختہ" رقیہ نے اس کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ جب آس پاس کوئی نہ ہوتا تو ارجمند خوب مٹھائی کھایا کرتی تھی۔

حرم سرا کے جاسوسوں کا خیال تھا کہ جب شہزادہ خرم نور محل سے ملنے آتا ہے تو وہ جان بوجھ کر ارجمند کو اپنے پاس بٹھا لیتی ہے۔ بہرحال ارجمند اس کا خون تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب دالانوں میں یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ شہزادے کو "حجلہ عروسی کی زینت" سے عشق ہے۔ وہ جہاں گیر کی غیر حاضری میں اس کے قدموں میں بیٹھا رہتا ہے اور وہ بھی اس پر اعتراض نہیں کرتی۔ نہ جانے کیوں؟

جب یہ کہانی تاتاری بوڑھیوں تک پہنچی تو وہ خاموش رہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ نور محل ایک اجنبی ہے اور ایک صحرازادی۔ اسے اپنا خیال آپ رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ انہیں خرم کے اشارے کا انتظار تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ناقابل فہم رہا۔ آخر ایک دن اس نے رقیہ کے سامنے سر جھکا کر کہا۔

"دادی حضور! کیا آپ ارجمند (۴) سے میری شادی کے لئے ابا حضرت سے سفارش کریں گی؟"

اس وقت سلیمہ کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ وہ معمولی مسائل کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکتی تھی اس کے باوجود خرم کی التجا سن کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی :۔

"تو بی فاختہ نے اس کا دل موہ لیا ہے ——— نور محل کی بھتیجی نے!"

اس اثنا میں جہانگیر کو ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے وہ بے حد لطف اندوز ہوا۔ اس کے دل میں شکار کا شوق چرایا۔ وہ چند گھڑسواروں اور درباریوں کے ہمراہ دریا کے کنارے کنارے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں جب گھنے جنگل آئے تو اس نے ہانکے والوں کو بھی ساتھ لے لیا۔

چند دن تک وہ آرام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ جمعرات آئی جسے وہ اپنے لئے بہت بھاگوان سمجھتا تھا۔ چیتوں کی مدد سے شکار کھیلا جانے لگا۔ جونہی کوئی شکار نظر آتا سدھائے ہوئے چیتے اس پر چھوڑ دیئے جاتے۔ اتنے میں ایک درباری جھاڑیاں لانگتا پھلانگتا آیا اور خبر دی کہ شیر نظر آیا ہے۔

"جہاں پناہ! میں ہانکے والوں سے بھی پرے نکل گیا دیکھا کہ ایک درخت پر کچھ چیلیں بیٹھی ہیں۔ میں نے سوچا لاؤ لگے ہاتھوں ہم بھی شکار کر لیں۔ میں نے چلہ چڑھایا اور کمان کھینچ کر ہولے ہولے درخت کی جانب بڑھا۔ لیکن جہاں پناہ ابھی میں درخت کے قریب بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مجھے گھاس پر ایک نیم خوردہ بیل پڑا دکھائی دیا۔ اتنے میں لمبی لمبی گھاس سے ایک قوی الجثہ شیر نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سچ کہتا ہوں جہاں پناہ! مجھے لقمہ توڑنا نصیب نہ ہو اگر میں نے جھوٹ بولا ہو۔"

"لیکن وہ چلا کہاں گیا؟" جہانگیر نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ اسے شیر کا شکار سب شکاروں سے زیادہ پسند تھا۔

"قسم بخدا! میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ حتیٰ کہ وہ گھنے جنگل میں جا گھسا۔ میں نے ہانکے والوں کو بلایا انہوں نے اس جگہ کو گھیر لیا۔ جہاں پناہ! وہ دیکھئے ان کے ہانکوں کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔"

جہانگیر کا اشارہ پاتے ہی چیتوں کے گلے میں زنجیر ڈال دی گئی اور انہیں محافظوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد تپائیوں پر دو بھاری بندوقیں لائی گئیں۔ سورج جنگل کے عقب میں غروب ہو رہا تھا۔ اور اندھیرا ہونے میں قریباً ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن شہنشاہ پانچ یا چھ گھڑسواروں کے ساتھ رہبروں کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔

انہوں نے دیکھا کہ شیر تاڑ کے ایک پیڑ کے گھنے سائے میں کھڑا ہے۔ جہاں گیر ایک بھاری بندوق سنبھال کر اس کی طرف بڑھا لیکن گھوڑا شیر کو دیکھتے ہی بدکا۔ جہاں گیر پھسل کر زین سے اتر آیا اور دوڑ کر قریب ہی ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا تاکہ نشانہ باندھنے میں آسانی ہو۔ اس نے پہلا فائر کیا لیکن اندھیرے کی وجہ سے اندازہ نہ کر سکا کہ نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس نے دوسری گولی چلائی۔ اب درندہ اٹھ کر جھپٹا اور قریب کھڑے ہوئے ایک شکاری پر پنجہ مارا۔

جہاں گیر نے اپنے اسلحہ بردار انوپ رائے کو دوسری بندوق لانے کا اشارہ کیا۔ انوپ رائے نے جٹ سے تپائی اس کے سامنے رکھ دی۔ جہانگیر نے اس پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا۔ انوپ رائے تپائی کو تھامے رہا لیکن شیر دھاڑ رہا تھا۔ حالت غضب میں برابر چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے ٹیلے کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ جہانگیر نے جلدی سے نشانے کا رخ بدل کر ایک اور گولی چلا دی جو شیر کے جبڑوں اور دانتوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ درندہ غصے کے مارے پاگل ہو گیا اور جو خدام جہانگیر کے ارد گرد کھڑے تھے وہ سراسیمہ ہو کر جہانگیر کو روندتے ہوئے بھاگے۔ تاہم انوپ رائے بدستور اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس نے تپائی کو لڑھکتا چھوڑ کر شیر کی کھوپڑی پر زور سے ایک لاٹھی رسید کی۔ شیر نے اس کی کلائی خونخوار دانتوں میں دبوچ لی۔ انوپ رائے تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اتنے میں دو درباری تلواریں سونتے اس کی مدد کو آ پہنچے۔

انہوں نے گرد و غبار کے دل بادل میں دھاری دار جسم پر بے تحاشا تلواریں چلائیں حتی کہ انوپ رائے اپنی کلائی چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ جو بھاری کڑوں کی وجہ سے محفوظ رہی۔ پھر بھی شیر نے اس کے شانے اور چھاتی کو پنجے مار مار کر زخمی کر دیا۔ لیکن ابھی شکاری گھٹنوں کے بل کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے عظیم الجثہ درندہ کو اپنے اوپر جھپٹتے دیکھا اور زندگی سے مایوس ہو کر شیر کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اب وہ پہلوانوں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں وہ لڑھکتے لڑھکتے ٹیلے سے نیچے جا پڑے۔ جہانگیر، جسے سہارا دے کر اٹھا دیا گیا تھا یہ نظارہ بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

ایک ہانکے والا دوڑ کر ان کے قریب سے گزرا۔ شیر نے جھپٹ کر ایسا پنجہ مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر انوپ رائے نے تلوار کھینچ لی اور اس کی نوک سیدھی درندے کی آنکھوں میں بھونک دی۔ اتنے میں ہتھیار بند لوگ آ پہنچے اور

انہوں نے برچھے مار مار کر شیر کو ہلاک کر ڈالا۔

جہانگیر کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی۔ اس نے لڑائی کو اس کے ایک ایک مرحلے میں' غور سے دیکھا۔ وہ تن آسان بیشک تھا لیکن اس میں نہ تو ہمت و جرات کا فقدان تھا۔ نہ وہ کبھی خطرات سے گھبرایا۔ ایک دفعہ اس نے ہاتھی پر بیٹھے بیٹھے ایک خالی بندوق کے دستے سے شیر کو مار مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ شیر کے شکار سے فارغ ہو کر جب وہ خیمے میں واپس پہنچا تو اس نے جشن منانے کا حکم دیا جس میں شراب کا دور خوب چلا۔ اس واقعے کا تذکرہ اس نے اپنی تزک میں بھی کیا ہے۔

چند روز بعد آگرہ کے قلعے میں پہنچ کر جب اس نے یہی واقعہ نور محل کو سنایا تو انوپ رائے کے بارے میں کہا۔

"اس نے میری خاطر جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کی۔ میں نے اس کی خدمات کے صلے میں اسے شمشیر خاصہ مرحمت کی اور اس کی سالانہ تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے اسے "ابتدائے سنگ وطن" کا خطاب بھی دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" نور محل نے پوچھا۔

یک شنبہ کو میں نے مچھلی کا شکار کھیلا اور سات سو چھیاسٹھ(۷۶۶) مچھلیاں پکڑیں۔

جہانگیر باقاعدہ شکار کا حساب رکھتا تھا۔ "ان میں سے میں نے وہی مچھلیاں کھائیں جن کے فلس تھے کیونکہ ایسی مچھلیاں مردہ خور نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ میں نے پانچ بڑی نیل گایوں کا شکار کیا۔ جو اونٹ پر لاد کر لائی گئیں۔ اس کے بعد نظیری نیشاپوری کے نام سے ایک شاعر میری خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے انوری کے اس قصیدہ کے تتبع میں اپنا قصیدہ پیش کیا' جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے۔

باز ایں چہ جوانی و جمال است جہاں را

اس نے نور محل میں وہ دل کشی پائی' جسے کچھ دن کی دوری نے آتش ناک بنا دیا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچ گیا اور نور محل کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر اس کے عنابی ہونٹ تلاش کرنے لگا۔ نور محل بظاہر اس کا ایک ایک لفظ بڑی توجہ سے سن رہی تھی لیکن دل ہی دل میں انسان کی اس عجیب فطرت پر غور کر رہی تھی' جو شکار کرنے میں بے حد لذت محسوس کرتی ہے۔ وہ ایک دم اس کی طرف مڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔

"اب کے مجھے بھی ساتھ لے چلئے! میں نے شیر کا شکار کبھی نہیں کیا۔"
نور محل کی نازک نازک انگلیاں جہاں گیر کے پنجہ میں گتھی ہوئی تھیں۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب وہ بچوں کی طرح للچا کر کسی خواہش کا اظہار کرتی تو جہانگیر کے لئے انکار مشکل ہو جاتا۔

"کیوں نہیں میرے سرتاج! جب آپ ساتھ ہوں گے تو شیر کا شکار کھیلنا کون سا مشکل ہے؟ کیا سچ مچ میں نے تیر کمان کبھی ہاتھ میں نہیں لیا۔ جھپٹتے ہوئے درندے پر نشانہ باندھنے میں کتنا لطف آتا ہو گا۔"

اس نے محبت اور امید کی ملی جلی نگاہوں سے شہنشاہ کی جانب دیکھا گویا اس کے جواب کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ جہاں تک اسے یاد تھا آج تک کسی عورت نے اس قسم کی کوشش نہ کی تھی۔ تاہم اگر وہ شکار کے وقت اس کے پہلو میں رہے اور اس کی ہنر آزمائی پر نظر رکھے۔ تو کیا حرج ہے؟...... اگر اس کا نشانہ خطا بھی گیا تو وہ خود اپنی اسلحہ نوازی کا کمال دکھا کر شیر کو گرا سکتا ہے؟"

"جان من!" اس نے کہا "میں نہیں جانتا کہ تم اسے کیسے پسند کرو گی؟ تاہم اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو......"

ایک ہی دن میں دو جذبات کی آسودگی------ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا اور غالباً" نور محل بھی یہی چاہتی تھی۔ جہانگیر کو یہ خیال اتنا پسند آیا کہ اس نے جھٹ تیاری کا حکم دے دیا اور اسی جوش میں وہ حسب معمول پرتھوی کے پاس بھی نہ گیا بلکہ اسے نیل گائے کے کچھ سینگ تحفتہ" بھیج دیئے۔

ایک ہفتے کے اندر ہی شاہی فیل خانہ کا سب سے بڑا ہاتھی------ دادالہٰی------ حرم کے بیرونی صحن میں پہنچ گیا۔ اس کا ہودج بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا اور چترشاہی کے نصف حصے میں سیاہ ریشم کے پردے اس طرح لٹکائے گئے تھے کہ ضرورت پڑتے تو ہٹا کر بندوق کی نال باہر نکالی جا سکے۔

چونکہ شہنشاہ نے خلاف معمولی جلوانے کی بجائے محل سرا کے صحن میں ہاتھی طلب کر لیا تھا اس لئے خواتین یہ تماشا دیکھنے کے لئے جوق در جوق دالانوں میں جمع ہو گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ "دادالہٰی" قالین کے سرے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے۔ جہانگیر ہودج کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے دو بندوقچی تھے۔ اتنے میں ایک نقاب پوش خاتون

قالین پر نمودار ہوئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر ہودج میں پہنچی اور پردوں کے پیچھے جا بیٹھی۔ پہرے داروں نے اسے آتے دیکھ کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ تاہم یہ ہر ایک جانتا تھا کہ وہ نور محل ہے۔

مہاوت نے آنکس کو حرکت دی اور عظیم الجثہ ہاتھی چنگھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل ہاتھی نے چنگھاڑ سے جہانگیر کو سلامی دی تھی۔ جس کے جواب میں دیوار کے عقب سے نصف درجن ہاتھیوں کی چنگھاڑ سنائی دی اور سفید فام چوپایہ روشن آفتاب کی شعاعوں سے گزرتا ہوا خراماں خراماں سڑک کی جانب چل دیا۔

جب شکاری واپس آئے تو سورج غروب ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور وسیع صحن قندیلوں سے جگمگا رہا تھا۔ جہاں گیر مسکراتا ہوا مے نوشوں کی اس محفل میں پہنچ گیا' جس میں فراش اور نظیری بھی شامل تھے۔ ان سب کو جہاں گیر نے رات کے کھانے پر بلایا تھا۔

اس نے شکار کی باتیں کرتے ہوئے کہا "دریا کے پار جانے والی سڑک پر شیر نے اودھم مچا رکھی تھی۔ وہ مسافروں اور کسانوں کو تنگ کرتا تھا۔ میرے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اس کے بعد میں نے نور محل سے نشانہ باندھنے کو کہا۔"

مہمان یہ کہانی نوکروں کی زبانی سن چکے تھے۔ لیکن وہ ہمہ تن گوش جہانگیر کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی ہیں۔ "جب ہاتھی کو شیر کی بو آتی ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے" جہانگیر نے شیر کے شکار کا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "اس وقت عماری سے اس پر گولی چلانا آسان نہیں ہوتا۔ میرزا رستم کا نشانہ بھی تین یا چار مرتبہ خطا گیا۔ حالانکہ میرے بعد وہی بہترین نشانہ باز ہے تاہم نور محل بیگم کی پہلی ہی گولی نشانے پر بیٹھی اور شیر وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔"

اس رات جہانگیر کی طبیعت تفریح کی طرف مائل تھی۔ دعوت کا خاتمہ شربت اور بادام کے حلوے پر ہوا۔ اس کے بعد کشمش اور شراب منگوائی گئی۔ بادشاہ کو خوش دیکھ کر شاعر بدیہہ گوئی کرنے لگے۔ نظیری عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "اس خوشی کے موقع پر تو رقص و نغمہ کا اہتمام ہونا چاہئے۔"

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔ نہیں" بادشاہ بولا۔ "نغمہ بے شک سنو لیکن رقاصاؤں کو مردانہ محفل میں نہ آنا چاہئے۔"

جب پردے کے عقب سے طبلے اور شہنائی کی پرسوز آوازیں بلند ہوئیں تو جہانگیر کو

ایک نئی بات سوجھی۔ "نظیری! تم رقص کرو۔ تمہاری آواز بہت سریلی ہے۔ لیکن ٹھہرو! تمہارا دل بڑھانے کے لئے تین سال پرانی شراب کا ایک جام درکار ہو گا۔"

"جہاں پناہ! اس کے ساتھ شراب ناب کا ایک جام بھی" ایک درباری! آصف خاں نے لقمہ دیا! "اس سے ان میں توانائی پیدا ہو گی۔"

"حرکت اور توانائی۔" جہانگیر نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "چلو دونوں سہی۔"

"بالکل بجا' بالکل درست!"

"فراش بولا "سلطنت پناہ کی زبان صدق ترجماں ارسطو کے الفاظ کو شرف تکرار بخش رہی ہے۔

"مجھے معلوم نہ تھا۔" جہانگیر نے انکسار کے ساتھ اعتراف کیا کہ یہ الفاظ ارسطو کے ہیں۔"

"جب ہم ایک جیتے جاگتے سرچشمہ فہم و ذکاء سے فیض یاب ہیں' تو ہمیں مردہ یونانی فلسفی کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے؟" آصف خاں نے کہا۔

سب نے سر ہلا کر تائید کی اور بعض نے سوچا' شہنشاہ کی توصیف میں پہل ہم نے کیوں نہ کی اتنے میں نظیری کے سامنے دو جام رکھے جا چکے تھے۔

"ایک ہی سانس میں پی جاؤ!" جہانگیر نے کہا "اگر اس کے بعد تم نے صحیح تال پر رقص کیا' تو انعام میں تمہیں خلعت مرحمت کیا جائے گا۔"

"جہاں پناہ کی سلامتی ہو!" ایرانی نوجوان نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور شمال کی طرف منہ کرکے مغلوں کی رسم کے مطابق جام سے دو تین قطرے گرا دیئے۔

"مت گراؤ' فرمان شاہی کے مطابق ایک دم سب چڑھا جاؤ" آصف جاہ نے تنبیہہ کی نظیری نے یکے بعد دیگرے دونوں جام غٹاغٹ حلق میں انڈیل لئے اس کے دماغ میں خون کا دوران تیز ہو گیا اور دم گھٹ سا گیا۔ طبلے کی تھاپ پر اس نے اپنے پاؤں کو جنبش دی اور دسترخوان پر ناچنے لگا۔

"ذرا تیزی سے۔" آصف نے کہا۔ اس نے کنکھیوں سے بھانپ لیا تھا کہ شہنشاہ کی دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ "روح بلقیس کی قسم! یہ چال تو اندھے بھکاری کی سی ہے۔"

مخلوط شراب نظیری کے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ اس نے آصف کا عمامہ اچک لیا' جو

رقص کی گردشوں کے ساتھ ساتھ کھلتا گیا اور نظیری نے دوپٹے کی طرح اسے اپنے سر پر ڈال لیا۔ اگرچہ آصف کی توہین ہوئی تھی لیکن جب اس نے بادشاہ کو زیر لب مسکراتے دیکھا تو خود بھی زبردستی ہنسی ہنسنے لگا۔ اب نظیری کی زبان کھل چکی تھی۔ اس نے تالیاں پٹخار پٹخار کر گانا شروع کیا:۔

بوئے گل و مستی مے تاب
از غنچہ دہان دختراں جوئی
نور مہ و لذت سحر را
در روئے ستارہ منظراں جوئی

اس کا پاؤں کشمش کی ایک طشتری میں جا پڑا۔ جس سے اس کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور وہ لہراتے ہوئے عمامہ میں الجھ کر دھم سے نیچے گر پڑا۔ جہانگیر جو اس کی مسخرگی سے اکتا چکا تھا۔ اسے گرتے دیکھ کر ضبط نہ کر سکا اور بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔

"اب ہمیں کوئی نیا آدمی تلاش کرنا ہوگا۔" آصف خاں نے گویا شہنشاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا وہ افغان بچہ کہاں ہے؟" جہانگیر نے پوچھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اسے یاد آیا کہ آصف خاں نے ایک شخصی باریابی کے موقعہ پر ایک پہاڑی سپاہی کو اس کے حضور پیش کیا تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر قسم کے اسلحہ کا استعمال جانتا اور ہر دشمن کو زیر کر سکتا ہے۔

"جہاں پناہ! وہ اکبری دروازہ میں میرے مصاحبوں کے ساتھ انتظار کر رہا ہے وہ اعلیٰ حضرت کے دوبارہ دیدار کا متمنی ہے!"

"اسے بلاؤ۔ ہم اس کی طاقت کا امتحان کریں گے جس کی وہ ڈینگیں مارتا ہے!"

گفتگو جاری تھی کہ جہاں گیر خاموش ہو گیا۔ ایک شدید انقباضی کیفیت اس پر چھا گئی۔ آخر جب اس نے نگاہ اوپر اٹھائی تو افغان بچہ پردے کے پاس کھڑا اسے بڑے سلیقے سے سلام کر رہا تھا۔ جہانگیر کے ماتھے کی شکنیں کسی حد تک دور ہو گئیں۔ افغان کے منحنی سے چہرے کو تیل بھرے گیسوؤں نے گھیر رکھا تھا۔ جن پر پیچ دار پگڑی بندھی تھی پیٹی میں مختلف قسم کے نصف درجن خنجر لٹکے ہوئے تھے۔ دونوں کولھوں پر دو تلواریں آویزاں تھیں

اور پشت پر ڈھال پڑی تھی۔ جہاں گیر سوچنے لگا کہ کہیں وہ بندوق دروازے پر تو نہیں چھوڑ آیا؟"

"تمہارے پاس ہتھیار تو خاصے ہیں لیکن تم حق خدمت کیا لو گے؟"

پٹھان نے تھوڑی دیر اطمینان سے سوچنے کے بعد کہا "جہاں پناہ! فدوی کو ہر مہینے سو اشرفیاں عطا ہو جایا کریں!"

"اور اس خطیر رقم کے بدے تم کرو گے کیا؟"

"جہاں پناہ! فدوی' سورما ہے اور تلوار یا بندوق سے' خنجر سے یا خالی ہاتھ گھوڑے پر سوار ہو کر یا پیدل' اندھیرے یا اجالے کسی بھی دشمن کو ہلاک کر سکتا ہے' خدا کی قسم فدوی اسے جہاں پناہ کے قدموں میں لا کر ڈال سکتا ہے۔"

عام حالات میں جہاں گیر ایک فوجی نسل کے پہاڑی کی اس بڑ پر مسکرا دیتا۔ لیکن اس پر ایک وجشیانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہم آز مائیں گے تمہیں ایک دشمن سے مشعلوں کی روشنی میں نہتے لڑ کر دکھانا ہو گا۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔"

"جہاں پناہ کا حکم سر آنکھوں پر" پٹھان نے سر جھکا کر اٹھایا اور ڈھال اس کی زرہ بکتر کے ساتھ ٹھن سے ٹکرائی۔

اہل محفل اور خدام جہاں گیر کے پیچھے پیچھے چھت سے اترے۔ شہنشاہ بڑے صحن سے ہوتا ہوا باغ میں اصطبل کے قریب پہنچا۔ آصف خاں نے یہ دیکھ کر کہ بادشاہ نشے میں دھت ہے' مشعلیوں کو راستہ دکھانے کے لئے بلایا اور بعض ان سپاہیوں کو جن کا پہرہ ختم ہو چکا تھا' بادشاہ کے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ باغ کے ایک گوشے میں لکڑی کا ایک بہت بڑا جنگلا تھا۔ جس میں بادشاہ کے ملاحظے کے لئے وہ جانور رکھے جاتے تھے جنہیں زندہ پکڑ لیا جاتا تھا۔ وہ ان جانوروں کی عادات و خصائل کا مطالعہ کرتا اور ان کی تصویریں بنوا لیا کرتا تھا۔ آس چوبی جنگلے کے سامنے آ کر بادشاہ رک گیا۔

"یہ ہے تمہارا دشمن!" بادشاہ نے افغانی سے کہا' جو اس کے پیچھے قریب ہی کھڑا تھا "تیار ہو جاؤ۔"

افغانی نے جنگلے میں جھانک کر دیکھا تو اسے ایک تاریک ترین گوشے میں ایک شیر ببر بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ مشعلوں کو دیکھ کر غرا رہا تھا۔ افغانی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کی سانس اس کے دانتوں سے سسکارتی ہوئی نکلی۔ اگر وہ تلوار اور ڈھال لے کر ننگے

پاؤں پنجرے میں داخل ہو جائے تو اس کے معنی ہیں کہ اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے' اور وہ خوش نصیب ہو گا اگر خود زخمی ہو کر بھی شیر کو مار ڈالے اور اس پنجرے سے نکل بھاگے۔

"ہتھیار ڈال دو------ سارے ہتھیار!" جہاں گیر نے بڑے اطمینان سے حکم دیا۔

"اس درندے سے کشتی لڑنا ہو گی۔ انوپ رائے نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور ہم نے اسے انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا تھا۔ اگر تم اپنے ہاتھوں سے اس پر غالب آ جاؤ تو ہم تمہاری تنخواہ ایک سو اشرفی ماہانہ مقرر کر دیں گے۔"

افغانی نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو یقیناً یہ ایک مذاق تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا جواب دے سپاہی اور دوسرے حاضرین اس سے نگاہیں بچا کر جنگلے کے پرلی طرف چلے گئے۔ جب مشعل بردار جنگلے کے ارد گرد قطار بنا کر کھڑے ہو گئے تو افغانی سمجھ گیا کہ یہ مذاق نہ تھا۔!

"مولا علی کا واسطہ' کم سے کم مجھے تلوار تو لے لینے دیجئے" وہ چلایا۔

"فرمان شاہی نافذ ہو چکا ہے۔" آصف خاں نے دبی آواز میں کہا: چلو' جلدی کرو۔"

افغانی نے بڑی بے دلی سے ڈھال اتار کر نیچے رکھ دی اور پیٹی سے خنجر اتار پھینکے اس کی پیشانی سے پسینہ بہ کر ہونٹوں پر گر رہا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔

"سننے کے معنی ہیں اطاعت کرنا۔" وہ بڑبڑایا۔ جب محافظ نے جنگلے کا دروازہ کھولا تو اس نے مٹھی سے اپنا سینہ ٹھونکا اور دوڑ کر جنگلے میں گھس گیا۔ وہ زور سے نعرہ مار کر ایک ہی جست میں زرد درندے پر جا پڑا۔ شیر نے دو ہی پنجے مارے تھے کہ اس کا ایک بازو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور دوسرا بازو شیر نے اپنے دانتوں میں لے کر اس زور سے بھینچا کہ ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔

پٹھان لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے کٹے ہوئے بازو سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ غضبناک شیر دہاڑنے کے بعد بیٹھ گیا اور اس کی دم ریت پر جھاڑو دینے لگی۔

اس کے بعد وہ پھر جھپٹا اور پٹھان کو نیچے گرا کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

جہاں گیر نے پارہ پارہ لاش سے نگاہیں اٹھائیں۔ مشعلوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ہجوم کا جائزہ لیا اور انجام کار اس کی نگاہیں ایک تنو مند ترک پر جا کر رک گئیں جو ایک درباری پہلوان تھا۔

"طغرل بے! دیکھتے ہو؟ شیر نے میدان مار لیا۔ کیا تمہارے بازو اسے مغلوب کر سکتے ہیں؟" جہانگیر نے کہا۔ طغرل بے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تاہم اس نے زمین بوس ہو کر شہنشاہ کو سلام کیا۔ اور بولا "جی! خداوند نعمت!"

طغرل بے! تم اکثر اپنی طاقت کی بڑ ہانکا کرتے ہو۔ اب موقع ہے کہ اپنی دلاوری کا ثبوت پیش کرو۔"

موٹی تازی گردن پر پہلوان کا سر ادھر سے ادھر پھر گیا اور اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ شہنشاہ کو دوبارہ سلام کرکے وہ بڑی شان سے اٹھا اور کہنے لگا۔ "شہنشاہ کا کام حکم دینا ہے اور خادم کا فرض اس پر عمل کرنا! آپ سب حضرات طغرل بے کی ہمت آزما لیں!اس نے مرصع صدری کے نیچے اپنی چھاتی پھلائی اور لمبی آستینیں اوپر کی طرف چڑھا لیں' جس سے بازو کی مچھلیاں نظر آنے لگیں۔ وہ چونکہ تقدیر پرست تھا' اس لئے جب دروازہ کھلا' تو وہ رضا بہ قضا اس میں داخل ہو گیا۔ بازو پھیلائے بدن جھکائے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور غراتے ہوئے شیر کے گرد چکر لگایا۔ اس کا گول سر شانوں کے اندر دھنس گیا تھا اور اس کے ہونٹ ایک عجیب اور مضحکہ خیز انداز میں سل سے گئے تھے۔

جنگلے میں داخل ہوتے وقت اس نے اپنے جوتے اتار دیئے تھے۔چنانچہ وہ ننگے پاؤں خون آلودریت کی طرف بڑھا۔ اچانک شیر اٹھ کر اس پر جھپٹا۔ اس نے ایک چیخ ماری لیکن فوراً" گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چاہا کہ درندے کے پنجے سے بچ کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے لیکن شیر کے ایک طمانچے نے اس کے کندھے کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس نے پہلوان کو اپنے نیچے محسوس کرکے پچھلے پاؤں کے ناخن اس کے جسم میں گاڑھ دیئے اور پھر جو پاؤں اٹھایا تو اس کی پسلیوں کی ساری کھال کھینچتا ہوا لے گیا۔ مشعلوں کی روشنی میں گندی جسم کا اضطراب اور نکیلے دانتوں کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد شیر بھاگ کھڑا ہوا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ طغرل بے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کا جبڑا اور سینہ قیمہ قیمہ ہو گئے تھے اور وہ اس قدر زخمی نظر آ رہا تھا کہ اس کے لئے گھسٹ گھسٹ کر جنگلے کے دروازے تک پہنچنا بھی دوبھر تھا۔

"درندہ اب بھی غالب۔" جہانگیر نے گہری آواز سے کہا "اب تم اس کا مقابلہ کرو۔" اس نے کسی اور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فراش اور آصف خاں کی زبان پر تالے لگے ہوئے تھے۔ نظیری بڑی دھکا پیل کر کے

مشعلوں کے حلقہ سے نکل گیا۔ جب اس مرتبہ ایک تیسرے شخص کو' جو سپاہی تھی۔ جنگلے میں نہتے جانے کا حکم دیا گیا۔ جہاں گیر پر ابھی تک وحشیانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ قالین پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت وہاں سے نہ اٹھا' جب تک یکے بعد دیگرے گیارہ آدمی شیر کے پنجرے میں داخل ہو کر اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

آخر پو پھٹتے وقت وہ بے پروائی کے ساتھ محل میں داخل ہوا۔ اس نے افیون منگوائی اور جب تک جھروکے کی گھڑی نہ گزر گئی وہ پلنگ پر مدہوش پڑا سوتا رہا۔

اس روز صبح ہوتے ہی شیر سے کشتی کرنے والے گیارہ آدمیوں کی داستان قلعہ آگرہ کے ذریعے طوائفوں کے دارا شیاطین سے لے کر ہاتھیوں کے اصطبل تک بچے بچے کی زبان پر پہنچ گئی۔ لیکن ہلاک ہونے والوں سے کسی کو ہمدردی نہ تھی۔ آخر وہ شہنشاہ کی مرضی کے ادنیٰ چاکر ہی تو تھے' اور یوں بھی اس زمانے میں آئے دن ہزاروں آدمی بخار اور زہر خوری کے باعث مرتے رہتے تھے۔ پھر لوگ خوب جانتے تھے کہ اگر ایک وقت بادشاہ کا عتاب نازل ہوتا ہے تو کسی دوسرے وقت اس کی مہربانی' سورج کی شعاعوں کی طرح' اپنی رعایا کو زندگی بھی بخشتی ہے۔ تاہم جب یہ خبر مشاطہ کی زبانی نور محل کو پہنچی تو وہ کسی گہری فکر میں ڈوب گئی۔ اس نے سوچا کہ بدمست جہاں گیر نے خود اپنے جانثاروں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اس سے دو گھنٹے پہلے' جب وہ اس کے پاس سے اٹھنے والا تھا' تو اس کے گلوبند کے موتیوں سے کھیل رہا تھا۔ شاید اس پر خون سوار تھا۔ ع رات آ گئی اور پرندوں نے اپنے اپنے آشیانے میں بسیرا لے لیا۔

اس نے آہستگی و نرمی سے مصرع دہرایا۔

"ملکہ عالم نے کیا فرمایا؟" مشاطہ نے اس کی جانب مستفسرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے تو یہ چیستان ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن رات کو ہم اپنی فطرت کیوں بدل لیتے ہیں؟ ہمارا عمل دن کے عمل سے اتنا مختلف کیوں ہو جاتا ہے؟"

"شاید اس لئے کہ رات کو اندھیرا ہوتا ہے اور ہم ڈر جاتے ہیں۔" مشاطہ نے قدرے تامل سے جواب دیا۔ "بشرطیکہ ہم ڈر جائیں۔"

لڑکی نے کنکھیوں سے اپنی مالکہ کی طرف دیکھا اور خاموش رہی۔ وہ ایک نو عمر یتیم لڑکی تھی جس کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں یا شریفانہ ہنسی کی چند لہریں۔ اسے مریم کہتے تھے۔ نور محل نے اسے یتیم سمجھ کر پالا پوسا تھا۔ مریم اسی کے پاس پروان چڑھی تھی اور محض اسی کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ اسے نور محل کے زیورات کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔

اس رات وہ بے چینی کے ساتھ مرمریں جالی کے آس پاس ہی منڈلاتی رہی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی مالکہ کو خوش کرنے کی شرمیلی کوشش کر رہی تھی لیکن نور محل پر اس روز خاموشی کا دورہ پڑا ہوا تھا اس حالت میں وہ اکثر سنگین جھلملیوں کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں کسی گہرے سوچ میں مستغرق رہتی۔ اس رات بھی وہ خنک مرمر پر سر رکھے سامنے دریا کی متحرک موجوں میں چاندنی کی دل کش جھلک کا نظارا کر رہی تھی۔ وہ زنان خانے کی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اسے ان دالانوں سے وحشت ہو رہی تھی جن میں ہر وقت چپکے چپکے اس کے گن گائے جاتے تھے اور جہاں معمولی سے اشتعال پر اس کے متعلق افواہیں اگلی جا سکتی تھیں۔ خود اس کے کمروں میں اس کے خلاف جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں اور یہ صرف جہاں گیر کے عتاب کا خوف ہے' جو ان جاسوسوں کو اس کے متعلق فرضی قصے گھڑنے نہیں دیتا...... کم بخت رات کو تو چین لینے دیں۔

"جان من!" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا "آؤ تھوڑی دیر کے لئے ذرا خان کا لباس پہنیں۔"

نور محل نے وہی رات کہی جس سے مریم ڈرتی تھی۔ وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گئی "------ یہیں------؟ برسرعام------؟ بیگم------!" اس نے احتجاج کے طور پر کہا۔

"ہاں ابھی------ پگڑی لاؤ۔"

مریم نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی------ اس کے چھوٹے سے دماغ میں نافرمانی کا تصور بھی نہیں آ سکتا تھا؟ وہ اٹھی اور صندل کی لکڑی کے ایک صندوق میں سے پگڑی نکال لائی۔

"اور ہاں' ارسلان کو پیغام بھیج دو کہ وہ گھوڑوں پر زین کس کر جھروکے کے پاس لئے آئے۔"

"اللہ رحم کرے!"

"جلدی کرو۔ ورنہ وہ اصطبل سے چلا جائے گا۔" جب مریم دروازے پر ایک بوڑھی کنیز کو پیغام دے کر آئی تو اس نے دیکھا کہ نور محل صندوق کھول کر اس کے سامنے بیٹھی ایک کے بعد دوسرا کپڑا نکال رہی ہے۔ مریم نے بڑی احتیاط سے دروازے کے پردے کھینچ دیئے اور ساڑھی باندھنے میں اپنی مالکہ کی مدد کرنے لگی۔ اس کے بعد ایک ریشمی چولی اور زردوزی کے کام کی صدری نکال کر اسے پہنا دی۔ سب سے آخر میں وہ قبا لائی جو سامنے سے کھلی ہوئی اور گھٹنوں تک پہنچتی ہے۔ پھر اس نے اپنی مالکہ کو شہ سواری کے موزے پہنائے اور اس کے کولھوں کے ارد گرد پٹکا لپیٹ دیا تاکہ اس کی پتلی کمر چھپ جائے۔

"خنجر کہاں ہے؟" نور محل نے انگشتریاں اتار کر اسے دیتے ہوئے پوچھا۔ مریم نے اپنا سینہ ٹٹولا اور ہاتھ دانت کے منقش دستوں کے خنجروں کی ایک جوڑی نکال کر اسے دے دی۔ جنہیں اس نے سامنے پٹکے میں اڑس لیا۔

"اب پان کا ایک بیڑا دے دو تاکہ پوری "احدی" نظر آؤں۔ میرے دانت بہت زیادہ سفید نہ ہونے چاہئیں------- تیرے پاس کوئی رنگ ہے؟"

جیسے ہی نور محل پان چبانے لگی ہوشیار کنیز نے ایک کپڑا رنگ میں بھگو کر اس کے چہرے اور گردن یہاں تک کہ بالوں کے اندر بھی پھیر دیا۔ جس سے اس کی رنگت گندمی ہو گئی جسے دھوپ نے جھلسا دیا ہو۔ مریم نے اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں سلائی سے سرمہ بھی لگا دیا۔

"لیکن پگڑی" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"لائیے! پگڑی میں باندھ دوں! یہ اتنا مشکل کام ہے کہ اندھیرے میں تنہا ایک آدمی کے بس کا نہیں!"

"لیکن میں خود ہی باندھوں گی!"

نور محل نے سفید ریشم کا کپڑا لیا اور نقرئی آئینے کے سامنے پگڑی باندھنے لگی۔

"اب دوپٹہ دے دو۔" آخر کار اس نے کہا۔

مریم نے اس کے شانوں پر ایک باریک ململ کا دوپٹہ ڈال دیا اور اس کے ایک حصہ کی نقاب سی بنا کر نور محل کے گھنے بالوں اور چہرے پر اس طرح لپیٹ دی کہ آنکھوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

"یہ تو ایک طرح کی دیوانگی ہے!" مریم بڑبڑائی "اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

"میرے آنے تک تم خواب گاہ کے دروازے پر میرا انتظار کرنا! جان من!" نور محل یہ کہہ کر اندھیرے میں روپوش ہو گئی۔

اس کے محل کے دروازے پر کوئی نہ تھا۔ تیز تیز قدم اٹھا کر وہ تاریک سیڑھیوں پر پہنچ گئی۔ جب اس نے نیچے نگاہ ڈالی تو اسے اندھیرے میں دو سبز سبز آنکھیں چمکتی دکھائی دیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں۔ اس کی رگوں میں جیسے خون خشک ہو گیا۔ بے شک وہ چوپایہ ہی تھا شاہی حرم میں اتنی بڑی بڑی اور خوفناک آنکھوں والا ایک چوپایہ ہی ہو سکتا تھا۔

"تو منے بھائی؟" اس نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا "تم پنجرے میں بند ہو اور بے چینی سے رات کاٹ رہے ہوں؟"

وہ جرات کر کے سیڑھیاں اتری۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پرتھوی کا چیتا پیار سے اس کے پاؤں چاٹ رہا ہے۔ بڑی بلی جو پہلے اس کی آہٹ پا کر ایک لمحہ کے لئے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اب اس نے ملکہ کو پہچان لیا تھا۔ تنگ و تاریک زینے میں شمع کی روشنی جھلملائی اور نور محل نے دیکھا کہ ایک تخت پوش پر دو پٹھان قلما قنیاں پیٹی میں خنجر لگائے آرام سے لیٹی ہیں۔ ایرانی خاتون کچھ دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہی اتنے میں دوسرے زینے سے کچھ عورتیں اتریں اور محافظوں کے بیچ میں سے چبوترہ طے کرنے لگیں یہ عورتیں کنیزیں تھیں جو نیچے کی منزل میں جا رہی تھیں۔ پٹھان قلما قنیوں نے رسماً ان پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس چبوترے پر حرم سرا کے سکونتی حجرے ختم ہو جاتے تھے۔ نیچے بہت سے باورچی خانے' دھوبی گھر اور ہزاروں خدمت گاروں کی سونے کی کوٹھڑیاں تھیں۔ جب قوی ہیکل مسلمان غلاموں کا ایک گروہ چبوترے پر ظاہر ہوا تو نور محل ان کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گئی وہ بھاری بھاری قدم رکھتی اور دالانوں کی بھول بھلیوں میں ابلتے چاولوں اور گیلے کپڑوں کی بو سونگھتی ہوئی محافظوں کے بیچ میں سے گزری اور جب اس نے غلاموں کی بھیڑ سے کٹ کر توشہ خانوں کا رستہ لیا' تو کسی نے اس پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

قوی بازو دیہاتی لڑکیاں' بوریاں اور ٹوکرے اٹھائے اس کے پاس سے گزریں۔ اس

نے اندازہ کر لیا کہ وہ ان ٹھنڈے اور محراب دار کمروں کی طرف جا رہی ہیں' جو اناج اور پھلوں سے لبریز ہیں۔ چونکہ کھانے پینے کا منوں سامان روزانہ حرم سرا کے باورچی خانے میں لایا جاتا تھا اور چونکہ دیہاتی لڑکیاں لگاتار آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس لئے نیچے کا پھاٹک جو باہر کے صحن میں کھلتا تھا' کھلا ہوا تھا۔ نور محل نے صحن کی آوازوں پر کان لگائے پھاٹک کا رخ کیا' جہاں سیاہ حبشنیں پہرہ دے رہی تھیں۔ جب اس نے تھوڑے سے فاصلے پر ان کی بلند آوازیں سنیں تو وہ سنگین دروازے سے نکل کر دیوار کے انتہائی تاریک سائے میں چلی گئی۔ سیاہ فام پہرے دارنیاں چاندنی میں پھسکڑا مارے بیٹھی کنکریوں سے کھیل رہی تھیں۔

ایرانی خاتون ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی۔ اگر وہ چاہتی' تو الٹے پاؤں توشہ خانوں میں جا کر وہاں سے اپنے محل کی چار دیواری میں واپس ہو سکتی تھی۔ اگر وہ اس جگہ سے ایک قدم بھی آگے بڑھتی ہے' تو اس کا پردہ اٹھتا ہے اور اگر کسی نے اسے پہچان لیا' تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن چاند کی ٹھنڈی روشنی اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور باغ کے اس پار وہ نسیم شب کے سانس کی آواز سن سکتی تھی۔

آخر اس نے جلدی سے اوپر کی سیاہ زنانہ پوشاک اتار پھینکی اور گھنگریالے بال پگڑی کے اندر سمیٹ لئے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دیوار کے ساتھ ساتھ پھاٹک سے باہر نکل آئی۔ بچپن میں اس نے اپنے باپ غیاث بیگ کے ہمراہ گھوڑے پر بارہا سفر کیا تھا بلکہ وہ مردانہ لباس پہن کر دن کے وقت بھی اس کے ہمرکاب رہی تھی۔ ہندوستان میں پردہ دار عورتیں گھوڑے پر سوار ہو کر عوام کے سامنے نہ آ سکتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ڈولیوں یا پالکیوں میں سفر کرتی۔ لیکن نور محل کو پردے میں کبھی خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ شادی کے بعد جب اس کا سپاہی پیشہ شوہر کہیں باہر گیا ہوتا تو وہ اکثر مردانہ لباس پہن کر اپنے خادم خاص ارسلان کے ساتھ رات کو گھوڑے پر سیر کیا کرتی تھی۔ وہ اکثر احدی کا بھیس بدلتی اور ان امراء کے خیموں میں پہنچ جاتی جو اس کے پڑوس میں خیمہ اندوز ہوتے۔ ایک دفعہ اسی حالت میں وہ باپ کے پاس بھی پہنچی اور وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ایک اور موقع پر اس نے سپہ سالار مہابت خاں کے خیموں میں بہت سے دن گزارے۔ جو مغلیہ سلطنت کا سب سے پہلا پٹھان سپہ سالار اعظم تھا۔ وہ مہابت خاں کی باتیں سن کر خوش ہوتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح مغربی پہاڑیوں پر پیدا ہوا تھا اور ہمیشہ کھری بات کہتا تھا۔

نور محل نے زنانہ لباس اور نقاب تلوں کی بوریوں کے پیچھے چھپا دیئے۔ جب وہ بیرونی

دیوار کے محافظ کے قریب سے گزری تو اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ "اس کی بی بی کتنی نیک ہے اسے اتنے سویرے باہر نکلنے کی اجازت دے دی ہے۔"

"جہنم میں جائیں ساری لڑکیاں!" نور محل نے جل بھن کر جواب دیا "اللہ کرے تمام بیبیوں کو کانٹوں پر سونا ملے اور وہ زہر خود پئیں جو ہمارے لئے تیار کرتی ہیں۔"

آواز نے ہمدردی کے طور پر قہقہہ لگایا۔ "سچ کہتے ہو۔ سب بیبیاں ایسی ہی ہوتی ہیں پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ کبھی قند" نور محل ریت کے اس میدان میں ٹہل رہی تھی جس سے ابھی سورج کی گرمی پوری طرح زائل نہ ہوئی تھی کہ ایک گھڑسوار ایک اور گھوڑا لئے چند قدموں کے فاصلے پر اس کے سامنے آکر رکا۔

"کون؟ خلیل خاں؟" ایک گہری آواز نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

"پہچانا نہیں؟ میں ارسلان ہوں....." وہ ایک بوڑھا ترک تھا' جو غیاث بیگ کے ہمراہ پہاڑیوں سے آیا تھا۔ وہ نور محل کے قدموں میں آکر گر گیا اور اس کا ایک پاؤں اٹھا کر اس نے اپنے سر پر رکھ لیا۔

"ایسا مت کرو۔ اتنے سال کے بعد بھی تم نہیں بدلے۔ کہو مجھے پگڑی کیسی لگتی ہے؟"

ارسلان نے ڈرتے ڈرتے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بچپن میں اس کے واسکٹ میں لگے ہوئے پیتل کے بکسوؤں سے کھیلتی رہی تھیں لیکن اب وہ سلطانہ بن چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے کسی نے اس کے ہمراہ دیکھ لیا اور وہ موذیوں کے ہاتھوں سے نکل کر بھاگ بھی گیا تو بھی اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندا دیا جائے گا۔ ذاتی نقطہ نظر کے اعتبار سے ارسلان تقدیر پرست تھا۔ لیکن اس عورت کو دیکھ کر اس کا سکون برہم ہو گیا' جواب ایک مغل شہنشاہ کی بیوی تھی اور قلعے کے تمام دروازوں سے اکیلی باہر نکل آئی تھی۔ لرزتی کانپتی آواز میں اس نے کہا: "پگڑی؟ پگڑی تو بالکل ٹھیک ہے! مگر....."

"مگر ہم دیواروں کے تلے کیوں کھڑے ہوں۔ جب خدا کی زمین کشادہ ہے!" نور محل چلائی اور خالی گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس پر سوار ہو گئی۔

"کہو! لشکر گاہ کی کیا خبریں ہیں؟"

رات چار پہر ڈھل چکی تھی۔ لیکن قلعے کے مغربی دروازے کے باہر' جہاں کانسی کی

تین توپیں نصب تھیں، آگرہ کے بازار میں ابھی تک روشنی اور چہل پہل تھی، لوگ جون کی گرمی سے بچنے کے لئے دوپہر بھر سوتے رہے تھے۔ اب کھانے پینے اور گپیں مارنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ وہ قالینوں کے انبار یا تیل کے مرتبانوں کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ ایک کونے میں استنبول کا ایک ترک بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ وہ نے منہ میں دبائے زور سے کش لیتا تو حقہ گڑگڑ کرنے لگتا اور جب سانس چھوڑتا تو دھوئیں کے مرغولے فضا میں لہرانے لگتے۔ بہت سے تماشائی اس کے ارد گرد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

بھائیو! یہ تمباکو بھی عجیب چیز ہے!" اس نے بڑے وقار و تمکنت سے تشریح کی۔ "وہ اس چھوٹے سے گنبد میں پڑا سلگتا رہتا ہے اور اس کے دھوئیں سے انسان کے دل و دماغ کو بڑی فرحت پہنچتی ہے۔ پھر اس میں زحمت بھی کچھ نہیں۔ تم میں سے ہر شخص تمباکو کے لئے ایک پاؤ کا خرچ کر سکتا ہے!"

"واہ! بھئی واہ! نرا جادو ہے!" ان میں سے ایک تماشائی نے کہا۔

"خدا کی قسم! جادو نہیں" اس نے بڑے وثوق سے کہا "یہ تو ایک نیا فن ہے جو بڑے حاذق طبیبوں نے بتایا ہے۔"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" دوسرا بولا "لیکن ان لال لال انگاروں میں یقیناً کوئی شیطان بیٹھا ہے! اپلے تو یوں کبھی نہیں جل سکتے۔"

بہت سی آوازوں نے مل کر اس کی تصدیق کی کیونکہ تماشائیوں نے اپنی آنکھوں سے تمباکو جلتے اور راکھ بنتے دیکھا تھا۔

"بھئی! ممکن ہے انگاروں میں شیطان بیٹھا ہو۔" ترک نے اعتراف کیا۔ "لیکن میرے بھائیو! جب یہ دھواں پانی سے ہو کر گزرتا ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے اور اس کے بعد دھواں صحت کے لئے بڑا مفید ثابت ہوتا ہے تم بھی چار آنے دے کر تجربہ کر لو۔"

اس کی آواز ان فقیروں کی چیخ و پکار میں دب کر رہی گئی جو ایک اسپ سوار کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ اتنے میں ایک شکرے باز بازو پر شکرا بٹھائے بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ چند آوارہ گرد راجپوتوں کو گالیاں دے رہا تھا، جنھوں نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے انہیں چھو کر بھرشٹ کر دیا۔ اتنے میں ایک ہندو جوگی گیروا لباس پہنے، ان سے پہلو بچا کر گزرا۔ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔

مبادا کوئی کیڑا اس کے پاؤں کے نیچے آ کر کچلا جائے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کشکول تھا۔۔۔۔۔ آدھا بھرا اور آدھا خالی۔ جب کسی نے اس کے پیالے میں مٹھی بھر پکے ہوئے چاول ڈالے' تو اس نے منہ ہی منہ میں اسے اشیرباد دی۔ اپنے سر کو جنبش دیئے بغیر اس نے ایک عجیب الخلقت شخص کو حیرت سے دیکھا' جو ایک بوسیدہ قالین پر بیٹھا تھا۔ وہ چرمی پاجامہ اور چرمی بوٹ پہنے تھا اور اس کے لمبے لمبے بال ایک رومال سے بندھے تھے۔ اس کے سامنے قالین پر ایک پرانا قطب نما رکھا تھا اور قطب نما کے پاس انجیل سے پھاڑے ہوئے اوراق پھیلے ہوئے تھے۔

"میں نجومی ہوں!" اجنبی نے نہایت بھدی ہندی میں ٹانک لگائی "میں قسمت کا حال دیکھتا ہوں۔ دیکھو! یہ منطقہ البروج کے ٹکڑے ہیں" اس نے انجیل کے اوراق کی طرف اشارہ کرکے کہا اور پھر بولا : میں نجوم کا ماہر ہوں۔ ایک روپے میں قسمت کا حال معلوم کرو!" بے شمار راہ گیر اس کے پاس پڑا ہوا عجیب و غریب آلہ دیکھنے لگے جس کی سوئی ہمیشہ ایک ہی سمت رہتی تھی۔ دراصل وہ ایک پرتگالی ملاح تھا۔ جو بے روزگاری سے تنگ آ کر نجومی بن بیٹھا تھا۔

اتنے میں دو مسیحی لمبے لمبے چغے اور کھڑاؤں پہنے ادھر سے گزرے۔ جب ان کی نگاہ پھٹی ہوئی انجیل کے اوراق پر پڑی تو وہ طیش میں آ گئے۔

"اے کفر بکنے والے! تم کس قسم کے جوتشی ہو؟"

ملاح نے انہیں گھور کر دیکھا اور اپنی بولی میں کہا :

"ان بے دین کتوں کے لئے بس ایک جمتول کافی ہے!"

اتنے میں نور محل گلیوں سے نکل کر بازار میں آئی۔ اس کے دماغ میں ان خوشبوؤں کی مہک آ رہی تھی جنہیں وہ بھول چکی تھی اور اس کے کان وہ بے سروپا باتیں سن رہے تھے' جو کھلی چھت کی دکانوں میں ہو رہی تھیں گویا وہ بیرونی دنیا کے دل کو چھو رہی تھی۔ ارسلان نے' ان فقیروں کو' جو نور محل کے گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے تھے میان میں لپٹے ہوئے نیمچے کی نوک سے ہٹا کر' اس کی توجہ ایک اور طرف مبذول کرائی۔۔۔۔۔ ڈاڑھی والے پٹھان سفید پگڑیاں باندھے اور منہ میں ممنوع سا بیج ٹھونسے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔۔۔۔۔ ایک دستہ چاندی کے ملمع کئے ہوئے زرہ بکتر اور سرخ چغوں میں ملبوس تھا یہ لوگ فوج کے بہترین شہ سوار تھے۔۔۔۔۔ سورت سے آئے ہوئے لمبوترے چہرے والے

عرب تاجروں کا ایک گروہ، مصر کا رنگین سوت لئے ایک طرف کھڑا تھا۔
سوت کی منڈی کی سڑک پر آ کر نور محل نے تیزی سے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ ایک درجن گھڑسوار اپنے گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ اگلے سواروں کے ہاتھ میں مشعلیں تھیں اور مشعل برداروں کے پیچھے دو افسر تھے۔ جن میں سے ایک------ جو گراں بہا خلعت پہنے تھا اور جس کی زین کے دونوں طرف سفید گھوڑے کی دم کے بالوں کی جھالر لگی تھی------ اعلیٰ عہدے دار معلوم ہوتا تھا۔ نور محل نے پٹھان سپہ سالار مہابت خاں کو پہچان لیا۔ اس نے پانچ برس پہلے اسے دیکھا تھا۔ لیکن اب اس لمبے تڑنگے سورما کا جسم ڈھل چکا تھا تاہم اس کی ڈاڑھی چڑھی ہوئی اور اس کا عمامہ قدرے ترچھا تھا۔
نور محل ایک گلی میں مڑنا چاہتی تھی کہ جتے ہوئے بیلوں کی ایک جوڑی پیچھے سے آ کر اس کے گھوڑے سے ٹکرائی اور اسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک مشعل بردار نے بے تاب ہو کر اسے للکارا اور مشعل کی روشنی اس کی آنکھوں پر ڈالی۔ نور محل کے گھوڑے نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ ارسلان غصے میں آگے بڑھا اور اس کے آگے جا کر اپنے گھوڑے کو روک لیا۔
"ابے پہاڑی کتے! کیا یہ راستہ تیرے لئے کافی نہیں کہ تو امیر پر بھونک رہا ہے؟"
مہابت خاں نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور ان کے قریب پہنچ کر اپنے آدمیوں کو رک جانے کا حکم دیا۔ وہ نور محل کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ ارسلان نے انتہائی طیش میں اپنا ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھ لیا۔
"توبہ یا اللہ" جرنیل بول اٹھا "خلیل خاں ابھی تک گھوڑ سوار ہے۔"
"اخاہ! سردار صاحب!" وہ سر جھکا کر منمنائی "خلیل خاں کا سلام قبول کیجئے۔"
"مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟ تو کیا کام کرتے ہو؟" جرنیل نے پوچھا۔
"میں دربار میں ملازم ہوں۔"
تاہم افغان جرنیل ابھی تک اسے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی یادداشت پر ناز تھا۔ وہ کسی کو ایک دفعہ دیکھ کر مشکل ہی سے بھولتا تھا۔
"چلو ذرا میرے ساتھ ساتھ چلو" جرنیل نے حکم دیا۔ "تمہارے پرانے صوبہ بنگال میں لڑائی ختم ہو چکی ہے۔"
نور محل طوعاً و کرہاً اس کے پہلو بہ پہلو چلنے لگی اور دستے نے اپنے گھوڑوں کی رفتار

پھر تیز کر دی۔ ارسلان دل ہی دل میں فکر مند اپنی مالکہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ نور محل نے سن رکھا تھا کہ افغان جرنیل کو اس روز آگرہ میں ایک اہم مشورے کے لئے طلب کیا گیا ہے اور شام کو وہ شہنشاہ اور شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر تھا۔ وہ خاموش چلی جا رہی تھی اور مشعلوں کی چمک سے اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اسے یہ تو معلوم نہ تھا کہ شاہ برج میں بادشاہ نے اس سے کیا کیا باتیں کی تھیں' تاہم اتنا وہ یقین کے ساتھ جانتی تھی کہ مہابت خاں کا مزاج اس وقت چڑ چڑا ہے۔

"سردار صاحب! آپ نے تو ماشاء اللہ خوب ترقی کی ہے۔" نور محل نے یونہی بات چھیڑنے کے لئے کہا۔

"اس نوکری نے تو مجھے بوڑھا کر دیا" جرنیل نے کہا "میں انتظار میں' حاملہ عورت کی طرح ایڑیوں کے بل بیٹھا رہا ہوں اس نے ڈاڑھی کے بال منہ میں لے کر چبائے' پھر کچھ سوچ کر کہا--------" ہمارے بادشاہ سلامت کے سینے میں سپاہی کا دل ہے لیکن حکم کس کا چلتا ہے فوج کے بخشی کا-------- حاکم بنگالہ کا-------- حرم کی بیگمات کا!"

اس نے شاہی محل کے دو اندرونی برجوں کی طرف اشارہ کیا جو ستاروں کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اسے شاہی حرم کی خواتین کا تذکرہ کرنے کی جرات نہ ہو سکتی لیکن مہابت خاں شاہی حرم کا دشمن تھا۔ اسے نتائج کی بھی پروا نہ تھی۔

نور محل نے بڑی سنجیدگی سے ہاں میں ہاں ملائی "عرش آشیانی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اور بات تھی۔"

"ارے تمہیں اس زمانے کی کیا خبر؟ تمہاری تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگیں۔"

"لیکن سردار صاحب! باتیں تو سننے میں آئی ہیں۔"

"ارے کیا باتیں؟ اس کے منصوبے اور اس کے جوابی منصوبے' میں اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ و سلم کا ارشاد ہے۔ "عورت کا مشورہ سنو! اور جو مشورہ وہ دے' اس کے برعکس عمل کرو۔"

نور محل نے بمشکل ہنسی ضبط کی... "جو کچھ سردار صاحب فرما رہے ہیں' یہی لکھا بھی ہے۔ یہ دربار کی خوش قسمتی ہے کہ مہابت خاں سرحدوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کی تلوار ہمیشہ فتح و نصرت کی ضامن ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود لوگ باتیں بنانے سے باز نہیں آتے اور اسے مشورہ بھی تو ٹھیک نہیں ملتا۔ اچھا! سردار صاحب! اب مجھے دوسری طرف

باگ موڑنی چاہئے" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "آج رات مجھے ایک خدمت انجام دینی ہے۔" یہ کہہ کر نور محل نے گھوڑے کا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ ارسلان اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب وہ موڑ مڑ چکے تو مہابت خاں نے اپنے افسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے اس احدی کے متعلق؟"

"گھوڑے پر عجیب طرح بیٹھتا ہے۔"

"اس سے بات کرنی آسان ہے۔" افغان جرنیل نے اپنی ڈاڑھی کو جھٹکا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا: "بخدا: اگر میں پانچ برس پہلے پارسانہ ہو گیا ہوتا تو اس نوجوان سے ضرور محبت کرتا۔"

اتنے میں وہ نوجوان ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ ارسلان اس کے پیچھے پیچھے بڑبڑاتا چلا جا رہا تھا۔

نور محل جانتی تھی کہ وقت خاصا گزر چکا ہے۔ سپیدہ سحر کے نمودار ہونے میں صرف چار گھنٹے باقی تھے۔ جس سے پہلے پہلے اسے اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا حلق خشک ہو گیا ہے اور اس کے رخسار تمتما اٹھے ہیں۔ اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ تاہم تاریک گلی کوچوں کی بھول بھلیوں سے ہو کر اسے جس مقام پر پہنچنا تھا' وہاں وہ آسانی سے ایک گھنٹہ گزار سکتی تھی۔!

"ذرا ہوشیاری سے" ارسلان نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

ان کے آگے آگے گھڑسواروں کا ایک دستہ لالٹین لئے جا رہا تھا۔ یہ دونوں سڑک کے ایک طرف مڑ گئے۔ اب وہ ایک دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ تازہ ہوا اور نواحی باغوں کی مہک انہیں راحت بخش رہی تھی۔

اچانک نور محل نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور دونوں طرف کے مکانوں کو دیکھنے لگی۔ روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہر طرف نیند اور خاموشی طاری تھی تاہم چاند کی چاندنی میں پتھر کی ایک حویلی صاف نظر آ رہی تھی۔ نور محل اس کی سیڑھیوں کے پاس آ کر رک گئی۔ ارسلان نے دونوں گھوڑوں کو دیوار کے سائے میں کر لیا۔ اتنے میں چھت پر سے کسی پردہ دار عورت نے جھانکا۔

"کون ہے؟ ہم تو غریب لوگ ہیں۔"

"گھبراؤ نہیں عائشہ! خلیل خاں اور اس کا ساتھی ہے۔ جلدی سے دروازہ کھولو۔"

عورت کا سر فوراً" پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوا' جیسے کوئی ننگے پاؤں سیڑھیوں سے اتر رہا ہو۔ کسی مرد کے کچھ پوچھنے کی آواز آئی جس سے مکان کے اندر پھیلی ہوئی تاریکی میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اگلے لمحے دروازے کی زنجیر کھلی اور ایک مسلمان خاتون نے باہر نکل کر نور محل کے قدم لئے۔

"ایں!۔۔۔۔۔۔۔ ملکہ عالم!"

"چپ' مجھے کہاں جانا ہے؟"

"چھت پر! وہاں صرف وہی ہے جس کی ملکہ عالم کو تلاش ہے۔"

نور محل تیزی سے ان سیڑھیوں کی طرف بڑھی جو تاریکی میں نظر نہ آتی تھیں اور چھت پر پہنچ گئی جہاں قالینوں کا فرش تھا اور ایک چھوٹی سی باریک کپڑے کی چھولداری میں گدے اور تکیے بکھرے پڑے تھے۔ نیچے سے ایک عورت : عائشہ کی گھبرائی ہوئی آواز آ رہی تھی۔

"ارے گدھو! دفع بھی ہو! جانتے نہیں ملکہ عالم تشریف لائی ہیں اور تم ہو کہ بھینسوں کی طرح پڑے ہو۔ اس روز تو تم نے سستی نہ دکھائی تھی۔ جب گھڑسواروں کی بھرتی کرنے والے آئے تھے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یا اللہ یہ کیسے بھائی میرے پلے بندھ گئے ہیں۔ ارے سنا نہیں' ملکہ عالم اوپر چھت پر رونق افروز ہیں۔"

"ہوں....." ایک گہری آواز نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کیوں چیخ رہی ہو؟ سارا محلہ سن رہا ہو گا۔۔۔۔۔۔"

وہ مرد اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے دو شالے اوڑھ رکھے تھے وہ کھانستے اور تھوکتے ہوئے چاندنی میں دیوار کے زیر سایہ جا کھڑے ہوئے وہاں ارسلان پہلے ہی موجود تھا۔ تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے وہ سب غیاث بیگ کے ملازم تھے۔

چھت پر نور محل دوڑ کر چھولداری میں پہنچی اور ایک نازک اندام بچی کو' جو سوتے سوتے اٹھ بیٹھی تھی' گود میں اٹھا لیا۔ پہلے تو بچی بھونچکا سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے نور محل پر نگاہیں جما دیں۔

"ملکہ عالم!"

"تیری ماں' لاڈلی! میری بچی' تیری ماں!"

نور محل نے سر سے پگڑی اتار پھینکی۔ اس کی گھنی سیاہ زلفیں اس کے کندھوں پر بچی

کے رخسار کے عین سامنے آ کر بکھر گئیں۔ لاڈلی نے محسوس کیا کہ اس نے گلاب کی پتیوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھی ہے اور اس کی ماں کے ہاتھ' جو اس کے جسم پر پیار سے مچل رہے ہیں اور اس کے سر کو محبت سے دبا رہے ہیں' بڑے گرم و گداز ہیں۔

ان سے ذرا فاصلے پر عائشہ جس کی سانس ابھی تک پھولی ہوئی تھی' گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ وہ اس بات کی خاص احتیاط کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں نور محل کی آنکھوں سے ملنے نہ پائیں۔ بے شک ملکہ عالم لاڈلی کی ماں تھی لیکن یہ محترم خاتون بیوی بھی تو رہ چکی تھی اور عائشہ جانتی تھی کہ کسی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بدشگونی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ تسبیح لے کر دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ خدا بچی کو نظر بد سے بچائے۔

نور محل چپ چاپ گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی محل کی جانب واپس روانہ ہوئی اور ارسلان کے بار بار زور دینے کے باوجود اس نے بازار کے دروازے تک پہنچنے میں خاصی دیر لگائی۔ وہاں جب اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ارسلان کو الوداع کہی تو وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا" ارسلان نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اندھیرے میں وہ اسے مہرو ہی سمجھ رہا تھا۔ "کیونکہ خطرہ ہمیشہ اخیر میں آتا ہے جب بظاہر خیریت کے آثار ہوتے ہیں۔"

نور محل کے عقب میں آسمان پر سپیدہ سحر پھیل رہا تھا اور جب وہ باغیچوں میں سے گزری تو دیواروں اور برجوں کو شناخت کرنا آسان ہو گیا تھا۔ پہرے کی لالٹین کی روشنی کے سوا حبشی غلاموں کے صحن میں ابھی تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف پہریدار لالٹین کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اسے تل کی بوریوں کے پیچھے سے اپنے زنانہ کپڑے نکالنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ پہرے دار کو پتا بھی نہ چلا کہ کوئی سیاہ پرچھائیں اس کے عقب سے ہوتی ہوئی توشہ خانے کے دروازے میں داخل ہو گئی ہے۔ کنیزیں نیند سے بیدار ہو کر چولھوں میں آگ سلگانے لگی تھیں۔ نور محل ان سب کی آنکھیں بچا کر سیڑھیوں پر چڑھ گئی اور دالان میں سے ہوتی ہوئی جب وہ پردہ اٹھا کر خواب گاہ میں پہنچی تو مریم کو انتظار کرتے پایا۔ مالکہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آ گئے۔ اس نے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

نور محل نے خلیل خاں کا لباس اور اپنا بہروپ اتار کر لحاف اوڑھا اور پلنگ پر لیٹ

گئی۔ اس کی آنکھیں تکان سے خواب آلود ہو رہی تھیں۔ ادھر موذن نے صبح کی اذان دی ادھر نور محل نیند کے دھندلکوں میں کھو گئی۔

جب کسی نے اس کے پاؤں کو چھوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور ہوا کے جھونکے گرم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی پائنتی مریم اور ایک کنیز کو گھٹنے ٹیکے اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتے دیکھا۔ جب وہ اٹھ کر بیٹھی تو کنیز نے فرش پر پیشانی پٹخ پٹخ کر کہا۔

"اوئی! ملکہ عالم! اب اٹھئے بھی۔ پرتھوی کی ایک کالی کلوٹی خادمہ صبح سویرے' فتنہ انگیزی کی نیت سے دالان میں آئی------ اس کلموئی نے ایک نوجوان کو تلوار کے بغیر' اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا شاید کوئی سپاہی تھا جسے وہ نہیں جانتی۔ کم سے کم اپنے دیوتاؤں کی سوگند کھا کھا کر وہ اسی کا یقین دلاتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ نوجوان نے ایرانی عامہ باندھ رکھا تھا اور اس کے پاؤں میں شہ سواری کے موزے تھے۔ اس نے مشعل کی روشنی میں نوجوان کو خود دیکھا۔ اس نے یہ کہانی آ چاکو سنائی اور اس نے شہنشاہ------ ہمارے آقائے ولی نعمت------ کے کانوں تک پہنچا دی۔

"اس نے کیا دیکھا تھا؟"

"شاید خلیل خاں کو۔" مریم منمنائی۔

نور محل نے کلائی سے ایک ریشمی دست بند اتارا جس میں موتی جڑا ہوا تھا اور اسے جہاں گیر نے دیا تھا۔

"یہ فورا" بادشاہ کے پاس لے جاؤ" اس نے حکم دیا۔

"قابل اعتماد ہاتھوں کے ذریعے اسے ابھی بادشاہ کے پاس پہنچ جانا چاہئے"

"ملکہ عالم! اس کے ساتھ کوئی پیغام؟"

"کوئی پیغام نہیں۔" شہزادی نے سر اٹھا کر کہا: "دست بند خود بتا دے گا۔"

کنیزیں ابھی سہمے ہوئے پرندوں کی طرح نظر آ رہی تھیں کہ نور محل نے لباس تبدیل بھی کر لیا۔

وہ جالیوں والے دالان میں دو آدمیوں کے لئے کھانے کی ایک میز پر میز پوش بچھانے لگی۔ پھر اس نے سوسن اور انار کی کلیاں منگوائیں اور ان کا گلدستہ بنا کر میز پر سجا دیا۔ جہاں گیر دوپہر تک نہ آیا۔ اس کے باوجود مطلق بے چین نظر نہ آتی تھی۔

آخر وہ جھومتا جھامتا اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کے سلام کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے موٹے موٹے گال تمتما رہے تھے اور اس کی آنکھیں ابھی تک مے نوشی و شب بیداری کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ نور محل نے پہلی ہی نگاہ میں سب کچھ تاڑ لیا جب اس نے سلام کرنے کے بعد پوچھا کہ شاہ برج میں مہابت خاں سے اس کی ملاقات کیسی رہی تو وہ بگڑ سا گیا۔

"خدا جانے۔" جہاں گیر نے سنجیدہ منہ بنا کر کہا "پچھلے چند گھنٹوں سے مجھے کوئی اچھی خبر کیوں نہیں سنائی گئی۔ ابھی ایک چھوکری نے شوجی کے سر کی سوگند کھا کر مجھے بتایا ہے ایک نامحرم شخص تم سے صبح سویرے ملنے آیا تھا۔ میں تو چھوکری کو جھاڑ دیتا۔ لیکن ..... لیکن....."

شہنشاہ کہتے کہتے رکا تو نور محل نے فوراً" جواب دیا۔ "تو کیا میرے سرتاج نے دوسروں کی زبان پر یقین کر لیا؟"

جہاں گیر کی تاریک آنکھیں یکایک چمک اٹھیں۔

"کیا میں ان غلاموں کی باتوں پر یقین کر لیتا" یہی بات تو میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آخر اس داستان سرائی کا مقصد کیا ہے؟ تم بھی بعض اوقات جذبات میں بہ جاتی ہو۔ میری زندگی کی روشنی!"

"نور محل تھوڑی دیر تک جہاں گیر کے لہجے اور اس لہجے کے پیچھے، چھپے فکر کام کر رہی تھی، اس پر غور کرتی رہی۔ اس کا عشرت نواز اور حقیقت پسند دماغ نور محل کے لئے کھلی کتاب کی طرح تھا، تاہم کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ بعض جذبات کو چھپایا جا رہا ہے۔

"تو پھر میں صحیح بات بتا دوں؟" اس کے لبوں کی ہلکی سی مسکراہٹ نے جہاں گیر کو ایک حد تک آسودگی بخشی۔ "بشرطیکہ میرے آقا گھڑی دو گھڑی میرے سامنے آرام سے بیٹھ جائیں۔

جہانگیر کو انتظار میں چوبیس منٹ سے زیادہ گزر گئے۔ اتنے میں مریم اور دوسری خواصیں اس کے پسندیدہ ماکول و مشروب لے آئیں اور وہ تازہ دم ہو گیا۔ پردے کے پیچھے سے ستار کو کومل سر اس کی سماعت کو ٹھوکے دے رہے تھے۔ جہاں گیر گانے کو سمجھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دھن بڑی دل کش ہے۔

اتنے میں ایک موسیقار ہاتھ میں ستار اٹھائے اندر داخل ہوا اور جہانگیر کے پہلو میں

پڑے ہوئے گدوں پر آ کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جہانگیر بچے کی طرح حیرت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ نور محل نے خلیل خاں کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک بڑا سا پگڑا اور شہ سواری کے موزے جن میں اب اس نے ستار کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ جہاں گیر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نور محل یہ کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔

"عالم پناہ کے لئے ایک جام لاؤ۔" نور محل نے خواصوں کو حکم دیا "کیا شہنشاہ فلک مرتبت مجھ ایسے ہم جام کے ساتھ پینا پسند فرمائیں گے؟"

نور محل نے اسے شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی نازک انگلیاں بے اختیار ستاروں کے تاروں پر تھرکنے لگیں ع

جہاں گیر آہستہ آہستہ چسکی لگاتا رہا۔ نغمہ اس پر کیف طاری کر رہا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے اسے سنتا رہا لیکن ابھی گیت آدھا بھی نہ ہوا تھا کہ نور محل نے ستار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور مسکرا کر بولی :۔

"یہ تھا خلیل خاں' آپ کا ہم جام۔ کیا بہروپ بھرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟ اگر میں یہی گانا باغ کی دیوار کے پاس جا کر گاؤں تو کیا کسی شرمیلی سے شرمیلی لڑکی کا دل بھی کھچا نہ چلا آئے گا؟"

"ہاں------ ہاں-------" جہانگیر نے تصدیق کرتے ہوئے کہا' میں تو خود ایسا دل پذیر نغمہ بڑے شوق سے سنوں گا۔"

"کم از کم میں نے اس ہندو لڑکی کو تو بے وقوف بنا دیا جس نے مجھے علی الصبح دالان میں بھیس بدل کر جاتے دیکھا ہو گا۔"

جہاں گیر نے اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ہنس پڑا۔

"افوہ-------- یہ بات ہے؟ اچھا تو جان من! تم میرا دل بہلانے کی تیاریاں کر رہی تھیں-------؟"

"جی ہاں-------" نور محل نے بڑے آرام سے کہا------- "اپنے سرتاج کا دل بہلانے کی تیاریاں کر رہی تھی اور کیوں نہ کرتی--------؟" پھر وہ جلدی سے سر اٹھا کر بولی------" وہ ہندو لڑکی باہر حراست میں کھڑی ہے۔ آپ اسے بلا کر پوچھ لیں کہ اس نے اسی مرد کو دالان میں گھومتے ہوئے دیکھا تھا نا-------؟"

جہانگیر نے پہلے تو انکار کیا لیکن نور محل کے اصرار پر وہ مان گیا۔ ایک حبشی خواجہ سرا

لڑکی کو باہر سے پکڑ لایا وہ آتے ہی کورنش بجا لائی لیکن جب اس نے سر اٹھایا تو نور محل کو مردانہ لباس میں دیکھ کر مارے خوف کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"بولو۔ کیا میں ہی وہ مرد تھی؟" نور محل نے پوچھا۔

"جی------ سرکار------!" لڑکی مایوس ہو کر پیچھے دیوار سے لگ گئی۔ جہاں گیر نے حبشی خواجہ سرا کو حکم دیا کہ وہ اسے اندر کے صحن میں لے جائے اور دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے مارے۔

"لیکن کیوں میرے آقا؟" نور محل نے فوراً پوچھا۔ "اس نے سچ بولا ہے اور بہرصورت آپ کی خدمت کی ہے؟" "وہ حبشی خواجہ سرا سے مخاطب ہوئی' جو غصہ میں بھرا تھا" جہاں پناہ اسے سزا نہیں دینا چاہتے۔ اسے پرتھوی رقاصہ کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہنا کہ نور محل نے اس کی جان بخشی کرائی ہے۔"

جب جہاں گیر نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تو خواجہ سرا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ نور محل کے اشارے پر باقی خواصیں بھی کمرے سے نکل گئیں۔ جب خلوت ہو گئی تو نور محل نے آہستہ آہستہ پگڑی کھولنی شروع کی۔ تھوڑی دیر تک وہ کان لگائے کھڑی رہی تاکہ یقین ہو جائے۔ وہ دونوں کمرے میں تنہا ہیں۔ پھر وہ ایکدم جہاں گیر کے پاس کھسک آئی۔ اس کے عنابی ہونٹ' جن سے گلاب کے عطر کی لپٹیں آ رہی تھیں' جہاں گیر کے گلے سے مس کرنے لگے۔ اب جہانگیر کوئی لفظ منہ سے نکالتا تو نور محل کی مدھم آواز میں اطمینان کی گونج محسوس ہوتی' لیکن اس کا ہر جذبہ چونکہ بیدار تھا' اس لئے نور محل کا دماغ اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے مرد کا تجزیہ کر رہا تھا اور وہ اس خیال کو ٹٹول رہی تھی۔ جو تھکے ہوئے دماغ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے اپنے ساتھ جہاں گیر کی شیفتگی سے ماورا کسی چیز کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

ممکن ہے جہانگیر کو نامعلوم طور پر شک گزرا ہو کہ نور محل نے اس سے دھوکا کیا ہے۔ حرم سرا میں یقیناً اس کے بہت سے دشمن ہیں جو خلیل خاں کے کرتوت کی تلاش میں محل کا کونا کونا چھان ماریں گے اور ممکن ہے انہیں پتا لگ جائے کہ اس نے شاہی محل کے بیرونی دروازے سے گزر کر پردے کو خیرباد کہہ دیا۔ شاید وہ بازار تک اس کا پیچھا کریں' اور اس کی شب گردی کی کہانی رائی کا پہاڑ بنا کر جستہ جستہ اس کے کانوں تک پہنچا دی جائے جس سے اس کے شبہ میں اور بھی اضافہ ہو جائے اور شاہی حرم میں زہر اتنا مہلک نہ تھا۔

جتنا شک و شبہ!

اس نے اندر کی طرف ایک چھوٹا سا سانس لے کر فیصلہ کر لیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولی :۔

"آپ کی کنیز نے پردہ اٹھا دیا ہے!"

"کون سی کنیز نے؟" جہاں گیر نے بے پروائی سے پوچھا۔

"آپ کی اس کنیز نے" نور محل نے سیاہ پلکوں سے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"گذشتہ رات میں یہ کپڑے پہن کر آگرہ کے بازار میں گھومنے گئی تھی اور صبح سویرے ہی واپس آ گئی تھی۔ جب اس خواص نے مجھے دیکھا۔"

جہاں گیر کا جسم تن گیا۔ وہ ششدر ہو کر نور محل کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم؟ یہ کیا نیا مذاق ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میرے محبوب! بس یونہی جی چاہ گیا! نہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر ہوئی نہ کسی مرد کا ہاتھ میرے جسم کو لگا۔"

"لیکن میرے بغیر؟ شہر میں؟ کیوں؟"

"شاید رات نے مجھے پکارا تھا۔ میں یہاں آنے سے پہلے چار دیواری میں کبھی قید نہ رہی تھی۔"

جہاں گیر فخر و ناز کا وافر سرمایہ رکھتا تھا۔ وہ ایک فاتح کا بیٹا تھا۔ اپنی رعایا سے کہیں بلند و برتر کسی تاتاری ملکہ نے بھی آج تک اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے کی کوشش نہ کی تھی لہٰذا اس کی سمجھ میں فوراً یہ نہ آ سکا کہ یہ عورت فی الواقع محافظوں کے بغیر تن تنہا حرم سے باہر چلی گئی۔ لیکن جب اسے یقین آ گیا تو خون کھینچ کر اس کے حلق میں سرسرانے لگا اور اس نے اپنے موٹے موٹے ہونٹ بھینچ لئے۔

"تم شاید' کہہ رہی ہو اور میں نے پوچھا تھا کیوں'!"

نور محل کے ذہن میں دفعتہً وہ نقشہ پھر گیا جب وہ ڈھلتے چاند کی ملگجی چاندنی میں لاڈلی کے ساتھ ایک حویلی کی چھت پر لیٹی تھی لیکن اس وقت کے احساسات جہاں گیر کیسے سمجھتا اور وہ اسے کیونکر سمجھاتی؟

"بس یونہی! طبیعت کی ایک رو تھی---------- ایک احساس' جو کبھی کبھی مجھ پر

طاری ہو جاتا ہے اس نے اکھڑے اکھڑے الفاظ میں کہا۔

"شاید وہ بلی جو صحن میں گڑی ہے' تمہاری طبیعت کا علاج کر سکے۔ اگر تمہیں اس سے باندھ کر دھوپ میں کھڑا کر دیا جائے اور عورتیں تم پر ہنسیں تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔" جہاں گیر نے اس کا لحاظ کئے بغیر کہا۔

ایرانی بیگم کی سیاہ آنکھوں سے شرارے نکل نکل کر اس کے گورے گورے چہرے پر برسنے لگے۔

"شہنشاہ اکبر کا فرزند اپنا فرمان صادر کرے۔ کیا میں اس کی کنیز نہیں ہوں؟ وہ اپنے آدمیوں کو شیر کے سامنے ڈالنے کا حکم دے سکتا ہے۔ اس کی فوجیں توجہ کی منتظر کھڑی رہتی ہیں اور وہ افیون کی پینک میں پڑا سوتا رہتا ہے۔ مہابت خاں نے جھوٹ بولا تھا' جب کہا تھا کہ آپ کے سینے میں سپاہی کا دل ہے۔"

ان باتوں کی تلخی نے اس کے پندار پر زبردست چرکے لگائے۔ نور محل نے بے اختیار سب کچھ اگل دیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا دل کی گہرائیوں سے کہا۔ وہ غضب ناک ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر جہاں گیر ایک لمحے کے لئے مبہوت ہو گیا۔ پھر اچانک اس نے طاقتور بازوؤں کی جنبش سے اسے پیٹھ کے بل گدوں پر گرا دیا اور اپنے پٹکے سے جڑاؤ خنجر نکال کر تان لیا۔

نور محل اپنے جسم پر خنجر کے آہنی پھل کو لہراتے دیکھ کر دہشت کے مارے سکڑ گئی۔ وہ انگلیوں کی پوروں تک ایک درد ناک عذاب میں مبتلا تھی لیکن اس نے نہ تو حرکت کی نہ چیخ ماری بلکہ اس کے خوف کی سردتہ کے نیچے اطمینان اور نجات کے اس احساس کی گرمی رینگنے لگی کہ وہ اس کمرے کی دیواروں سے' اپنے آپ سے' تمام جھنجھٹوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا جائے گی۔ اس نے چمکتے ہوئے خنجر سے نگاہیں ہٹا لیں اور اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھیں' جن میں خوف کے سائے رینگ رہے تھے' جہانگیر سے کہیں پرے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں' لیکن اس کے کانوں میں جہانگیر کا صرف ایک لفظ پڑا جس نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔"مہرو!"

"عورت" کے چہرے پر وہ خوف نظر آیا جو اس "لڑکی" کے چہرے پر طاری ہوا تھا' جو جہانگیر کے بازوؤں میں باغ کے تالاب کے پاس پھڑپھڑائی تھی۔ جہاں گیر کو محسوس ہوا کہ جس ہاتھ میں اس نے خنجر پکڑ رکھا ہے وہ کانپ رہا ہے اس نے ایک نظر خنجر کو دیکھا اور

بمشکل تمام اسے غلاف میں اڑس لیا۔ اس کی کنپٹیوں پر جو رگ پھڑک رہی تھی وہ یکبارگی خاموش ہو گئی۔

اسے تھکن سی محسوس ہوئی اور وہ سانس لینے میں بھی دقت محسوس کرنے لگا۔ اس نے نور محل کو قتل ہی کر دیا ہوتا۔ جب رات کے وقت نور محل کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح سلگ رہی تھیں۔ شاید وہ اسے نقصان پہنچا بیٹھتا۔

"میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔" جہاں گیر نے شکایت کی۔

نور محل نے تالی بجائی اور جب ایک کنیز دوڑ کر دالان میں آئی تو اسے مئے شیراز کا ایک جام لانے کا اشارا کیا۔ اس نے بلوریں جام بھرا اور جہاں گیر کے منہ سے لگا دیا تاکہ وہ جنبش کئے بغیر پی سکے۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھ کر یہ انتظار کرتی رہی کہ وہ کوئی بات کرے گا۔ جہاں گیر نے اپنا بازو پھیلایا اور اس کے گلے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اف! کتنا قریب تھا کہ وہ اس حسین گلے پر خنجر چلا دیتا۔

"آج میں تھک گیا ہوں۔" جہاں گیر نے جذباتی انداز میں کہا۔ "مجھے کوئی گانا سناؤ! آج دوپہر کو میں اچھی طرح نہیں سو سکا"

نور محل نے گدوں سے ٹیک لگا کر ستار سنبھالا۔ پھر اسے ایک طرف رکھ دیا اور لبوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے گانے لگی۔ ع

شب تاریک میں روحیں قفس سے جب نکلتی ہیں

جہاں گیر اس کے کمرے سے نکلا تو غیر ارادی طور پر تھوڑی دیر کے لئے برآمدے میں رک گیا۔ وہ افیون کی چسکی لگانا بھول گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حرم کی کون کون سی عورتیں اس کے لئے افیون تیار رکھتی ہیں۔ ان کے خدام خاموشی سے اس کے گرد دوڑیں گے' اس کے کپڑے اتاریں گے' اس کے بدن پر صندل اور گلاب کی مالش کریں گے' اس کے ہاتھ پاؤں دبائیں گے اور وہ موسیقی سننے اور افیون کی چسکیاں لگانے میں مصروف رہے گا۔ پیشانی پر ٹھنڈا تیل ملوانے کے بعد وہ مزے سے لیٹ کر آرام کرے گا۔ لیکن اب تک دوپہر کی مجلس خاص میں لوگ جمع ہو چکے ہوں گے۔ اسے یاد آیا کہ پرتگالی سفیر نے اسے ایک "گھنٹا" تحفہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جس کے سامنے کے حصے پر پالش کی ہوئی ہے اور جس سے باج کی آواز نکلتی ہے۔ بادل نخواستہ وہ خاص محل اور بیرونی پردوں کی جانب چل دیا۔

ادھر سلیمہ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے موت کا خیال اپنے اوپر طاری کر لیا۔

شاید اس کے پاس وقت گزاری کے لئے کوئی اور مشغلہ نہ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کی مجہولیت کے زیر اثر' وہ ان درباری طبیبوں سے کٹ حجتی میں ایک نیا لطف محسوس کرتی تھی جو بھاری پردوں کے پیچھے قطار اندر قطار اس کی نبض دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ بعض لوگوں نے اسے کاغذ کی وہ گولیاں نگلنے کو کہا جن پر آیتیں اور تعویذ لکھے ہوں بعض نے------ اور ان لوگوں کی تجویز اس نے نہایت شدت سے ٹھکرا دی------ خواہش ظاہر کی کہ وہ جلاب لے کر گرم ضمادوں اور چائے کا استعمال کرے تاکہ پسینہ آکر بخار اتر جائے۔ آخر بات فصد کھلوانے پر آکر ٹھہری۔ سلیمہ نے اس انتہائی خوشامدانہ تجویز کو شرف قبول عطا کیا۔ بلکہ جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی تھی' ان سب کو شاہانہ تحائف سے نوازا۔ خاص طور پر رقیہ کے عیادتی کلمات سن کر اسے بڑا اطمینان ہوا جو شہنشاہ اکبر کی بیگمات میں اس کی سب سے بڑی اور سب سے اہم حریف تھی۔

"سلطانہ عالم! اگر تم اللہ کو پیاری ہو گئیں۔" رقیہ نے رسماً" مزاج پرسی کرتے ہوئے کہا۔ "تو ہماری خوش حالی کا سورج غروب ہو جائے گا اور ہمیں نور ہدایت میسر نہ آ سکے گا۔ بلکہ شاہی محل اور پوری سلطنت میں پھوٹ اور نااتفاقی کا اندھیرا چھا جائے گا۔"

"سچ کہتی ہو" سلیمہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "یہاں میری جگہ لینے والا کوئی بھی نہیں۔ حتیٰ کہ تم بھی جان من میرے بغیر گھبرا جاؤ گی۔"

تاتاری بیوہ نے اپنا گندھا ہوا سر اثبات میں ہلایا۔

"سچ ہے! تمہارے اس چھہتر(۷۶) برس کے زمانے میں تو گویا رات آئی ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے' اب خدا چند دن سے زیادہ اس سورج کو نکلے رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہتا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ وہ سلیمہ سے صرف پانچ سال چھوٹی تھی۔ اسے کچھ دیر کے لئے یاد ہی نہ رہا کہ سلیمہ نے مشہور کر رکھا تھا وہ ساٹھ سال کے پیٹے میں ہے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اب خود اس کا آفتاب عمر بھی لب بام آگیا ہے۔ اس لئے حرم کی سربراہی اور ان گوناگوں فرائض کی ذمہ داری سنبھالنے کی کوئی خواہش اس کے دل میں نہیں ہے' جن سے موجودہ نسل کے لئے کوئی نمایاں کوشش کئے بغیر معمر بیگمات سبک دوش ہو گئیں۔

سلیمہ سلطانہ نے ناک سڑکی ہر چند وہ بے جان سی پڑی تھی لیکن اس کا ذہن بالکل

آسودہ تھا اور اسے آنسوؤں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

"یہ طبیب بھی نرے گاؤدی ہیں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "بھلا مجھے ضماووں اور چائے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو اپنے پہاڑوں پر واپس جا کر ٹھنڈی ہوا کھانا چاہتی ہوں اور ـــــ اور میرا جی چاہتا ہے کہ کابل کے ٹھنڈے سردے کھاؤں۔"

اسے اپنے آپ پر ترس کھانے کا سب سے آسان راستہ یہی نظر آیا لیکن جب سے رقیہ اس کی عیادت کو آئی تھی اسے اپنے بستر مرگ سے ایک نئی دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس نے طبیبوں کو چلتا کیا اور بوڑھی عورتوں کو بین کرنے کی اجازت دے دی۔ ادھر دروازے کے باہر قرآن کی تلاوت ہو رہی تھی ادھر پرانی خادمائیں اور خواصیں ـــــ جو اب اکثر معاملات میں بزرگ بن چکی تھیں ـــــ پراسرار طور پر حرم میں جمع ہوئیں اور کم عمر عورتوں کے ہاتھوں سے سارا کام لے لیا۔ حبشی اور بنگالی خواجہ سرا ان کے حکم پر ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے اور دالانوں میں ایک شور برپا تھا۔ اس ہنگامے میں سلیمہ کی طعن آمیز آواز کبھی کبھی سنائی دیتی تھی' جسے شکایت تھی کہ بین مکمل نہیں ہے۔ اسے ہنگامہ و حرکت' دل سے پسند تھے' بشرطیکہ ان کا مرکز خود اس کی اپنی ذات ہو۔

اپنے رنگے ہوئے رخساروں اور دبلی پتلی کلائیوں کے ساتھ جن پر وزنی کڑوں کا بوجھ تھا' وہ لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی لیکن یہ نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ سو نہیں رہی اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں روشنی اور تجسس کی جھلک تھی۔ اسے یکے بعد دیگرے پرانے خدمت گاروں اور ان ملازموں کی بیواؤں کا خیال آیا' جو اس کی خدمت کرتے کرتے مارے گئے تھے۔ اس نے ان سب کو یا ان کی بیٹیوں کو طلب کیا اور انہیں گھوڑے' مویشی' گاؤں' زمین کی آمدنی اور دریا کی چنگی انعام میں دیئے اور تاتاری شریف زادیوں کو ہاتھی' جگمگاتے تاج اور ہیرے جواہرات عطا کئے' جو ان کے شوہروں کی حیثیت اور مرتبے کے مطابق تھے۔ ایک خواجہ سرا' جو حرم کا میر منشی تھا' میراث کی فہرست لکھتا جاتا تھا اور پگڑی کے شملے سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا جاتا تھا۔

"میں اپنے ساتھ دنیا کی کوئی چیز نہیں لے جا سکتی۔" سلیمہ نے بڑی حسرت بھری آواز میں اس خواجہ سرا سے کہا جس نے یہ اعتراض کرنے کی جرات کی تھی کہ اس نے اپنی ملکیت سے بڑھ کر مال تقسیم کر دیا ہے۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ چھوٹے چھوٹے تحفے بادشاہ کی طرف سے دے دیئے

جائیں گے۔ خدا کی قسم! کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ میرا مال رعایا کے کام آئے بجائے اس کے کہ تم ایسے سگ محنتوں اس پر قبضہ جمائیں۔"

شاہی طبیبوں نے جہاں گیر کو بتایا کہ درحقیقت وہ بستر مرگ پر دراز نہیں ہے۔ البتہ تلی بڑھ جانے کے باعث اسے ضعف ہو گیا تھا جس کا علاج ہم نے فصد کھول کر کر دیا ہے۔ تاہم جہاں گیر نے اس کی عزت و تکریم کے لئے یہی سمجھا کہ سلیمہ کی عیادت کو جائے۔ "شیخو بابا!" اس نے جہاں گیر سے پیار سے کہا۔ "مجھے منڈا کر کے باغ میں دریا کے پاس دفن کرنا۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو کہ تمہارے ابا حضرت بھی وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔"

"جی ہاں!" جہانگیر نے کہا لیکن معمر تاتاری بیگم کا دماغ ماضی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا۔

"شیخو بابا! تم اس گرم ملک میں پیدا ہوئے تھے" اس نے کہا "لیکن آقایان ولی نعمت یعنی تمہارے آباؤاجداد ٹھنڈے صحراؤں کے رہنے والے تھے۔ کیا ان کے مورث اعلی چنگیز خان نے صحراؤں سے نکل کر ملک خطا بلکہ پوری دنیا کو فتح نہیں کیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ چنگیز خاں کے پوتے : قبلائی خاں میدان جنگ میں ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر جاتے تھے جو تین ہاتھیوں پر رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنا دارالسلطنت صحراؤں سے نکال کر ملک خطا میں منتقل کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی نسل کمزور ہوتی چلی گئی..... گل اندام ارجمند آج بھی خرم پر جان دیتی ہے لیکن میں بچہ------- اس کا بچہ------ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں گی۔ ہائے وہ خرم کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح جنگی خیمے میں بھی چلی جاتی ہے۔ یہ تمہارے گھرانے کی رسم ہے۔ تمام سلطان اور بادشاہ یعنی تمہارے آباواجداد----- چنگیز خاں کے زمانے سے اب تک------ ہمیشہ محبوب ترین بیوی کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ ہر وقت پابہ رکاب رہتے تھے وہ فاتح تھے..... اسے نہ بھولنا شیخو بابا۔"

"ایک عقل مند کا قول ہے کہ گھوڑے پر بیٹھ کر تم سلطنت فتح کر سکتے ہو لیکن اس پر حکومت نہیں کر سکتے" جہاں گیر نے کہا۔

سلیمہ کچھ دیر تک خاموش پڑی رہی۔

"شیخو بابا! تم اس گرم ملک کے باشندے ہو۔ یہ تمہارے پہاڑوں کی طرح نہیں ہے؟ کیا چنگیز خاں عقلمند نہ تھے۔ پتا نہیں..... بہرحال انہوں نے کہا تھا کہ تخت اس کو دیا جائے

جو چاروں بیٹوں میں سب سے بڑا ہے۔ تمام مذاہب کو یکساں سمجھا جائے محل میں نہیں' فوجوں کے ساتھ رہا جائے۔ تورہ چنگیزی ایسا ہی تھا۔ کیا شہنشاہ انجم سپاہ تیمور اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ وہ بھی ایک بہت بڑے فاتح تھے۔ پھر تمہارے ابا حضرت کے جدا مجد بابر سمرقند سے ہندوستان وارد ہوئے اور انہوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا۔ اگرچہ میری طرح ان کا دل بھی ہمیشہ پہاڑیوں میں لگا رہتا تھا------ ہاں! میری طرح! انہوں نے کبھی گوارا نہ کیا کہ لشکر گاہ کو چھوڑ کر محل میں زندگی بسر کریں۔ یہی حال میرے سرتاج یعنی تمہارے ابا حضرت کا تھا' جنہوں نے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں مستحکم کیں۔"

------"اور میں نے بھی' جیسا وہ چھوڑ گئے تھے' ان بنیادوں کو مستحکم رکھا!"

"بے شک' بے شک' لیکن اکیلے تم ہو' ورنہ باقی لوگ تو اس کے حصول اور استحکام کی جدوجہد میں مرگئے۔ بہرحال میں نہیں کہہ سکتی کہ اسلاف کے راستے سے انحراف کس حد تک مفید رہ سکتا ہے؟ خاص طور پر اس گرم ملک میں جہاں بے شمار لوگ آباد ہیں اور جن کے رسم و رواج بھی ہم سے مختلف ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچتی رہی۔ اس کی کمزور انگلیاں دولائی میں کانپ رہی تھیں۔

"شیخو بابا! تورہ چنگیزی کے پابند رہنا! مجھے تمہارے متعلق ڈر ہی لگا رہتا ہے کتنے ہی لوگ ہیں' جو تمہارے دامن سے وابستہ نہیں۔ تمہارے حرم میں کون ہے' جو تاتاری قانون پر کاربند ہو؟ امراء میں سے بھی صرف دو ہی امیروں کو یہ قانون یاد ہو گا۔ ایک تو افغان سردار مہابت خاں دوسرا شیخ فرید! دیکھو! اسے نہ بھولنا' کبھی نہ بھولنا..... بس میں نے بہت باتیں کرلی ہیں۔ اب میں تھک گئی ہوں....."

تھوڑے ہی دن بعد جب جہاں گیر شکار کو گیا ہوا تھا سب لوگ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ سلیمہ سلطانہ بیگم راہی عدم ہو گئیں۔ جہاں گیر نے حکم دیا کہ اسے منڈاکر باغ میں دفن کیا جائے اور اپنی تزک میں لکھا :۔

"در زنان ایں مقدار ہنرو قابلیت کم جمع می شود..... درسند شصیت سالگی بہ رحمت خدا واصل گشتند۔ ہماں روز از باغ دھرہ کوچ شد۔ اعتماد الدولہ راجت سرانجام برداشتن ایشاں فرستادم ودرعمارت باغ منڈاکر بیگم خود ساختہ بوونڈ' فرمودم کہ ایشاں رانہا

دند" (۵)

سلیمہ بیگم کی وفات کے بعد حرم کی سربراہی کی جگہ خالی ہو گئی۔ عموماً" خیال تھا کہ رقیہ کو حرم کا سردار مقرر کیا جائے گا لیکن ایک دن خلاف توقع شاہی فرمان صادر ہوا کہ شاہی حرم کی سربراہی نور محل کے سپرد کر دی گئی ہے۔

☆☆☆

(۳)

"اوہ! بہت خوب۔ آخر ہم چل ہی پڑے۔" فراش نے کہا۔
"لیکن ہماری رفتار بہت سست ہے' جیسے عوام کا کوئی جم غفیر ہو" نظیری نے لقمہ دیا۔
"بہرحال ہم پہنچ ہی گئے۔"
"پہنچتے تو ہم روز ہی کہیں نہ کہیں ہیں لیکن انجام کار ہم کہاں ہوں گے' یہ خدا ہی جانے!"
"خدا کو اس سے کیا غرض؟" فراش نے متصوفانہ انداز میں کہا۔
دراصل وہ آزاد خیال اور اکثر یہ دلیل دینے میں لطف محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے اعضا کے وظائف کے سوا کوئی چیز یقینی معلوم نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے نظریے کے ثبوت میں عمر خیام کی ایک رباعی پڑھی۔ ؎

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
دیں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من'
اندر پس پردہ گفتگوے من و تواست
چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من'

فراش بڑی توجہ سے نظیری کی بات سن رہا تھا اس نے متصوفانہ انداز میں فلسفہ آرائی کرتے ہوئے کہا: "تم کہتے ہو: اللہ! میں کہتا ہوں خدا! کچھ لوگ اسے "یہود" کہتے ہیں اور کچھ "برہما" اور ہندوؤں نے تو اپنے دیوتاؤں کے اتنے نام رکھ چھوڑے ہیں کہ انہیں دہرانے سے ہی میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہمارا حقیقی راہ نما تو دراصل مغل شہنشاہ ہے۔ ہم اسی طرف ہی جائیں گے' جدھر وہ جانا چاہتا ہے اور یہ وہ بات ہے' جسے تم بھی جانتے ہو۔
نظیری مسکرایا: "لیکن نہ جانے جہاں گیر کے دماغ کی رہنمائی کون کرتا ہے؟"

اب گفتگو ایک نازک مرحلے پر آ پہنچی تھی اس لئے فراش محتاط ہو گیا۔ وہ گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے' باجرے کے پامال کھیتوں سے گزر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ خدام بھاگے چلے آ رہے تھے۔ نوکروں کے بھی کان تھے۔ اس لئے شاعر کا قول تھا کہ جو بھی لفظ بولا جائے' وہ کسی نہ کسی کے کان میں ضرور پڑے گا۔ چنانچہ اس نے اعراضی لہجہ میں کہا :۔

"ہمارے آقا کے ذہن میں تو ہر وقت جنگ' سفر اور شکار ہی بسے رہتے ہیں۔ اس کا چڑیا گھر بھی سفری ہے اور اس کے مصور بھی راستے میں جانوروں کی تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ وہ راجپوت راجاؤں کو ان کی پہاڑیوں میں شکست دے کر اکبر بننے کی کوشش کرتا ہے' اس لئے نظیری! اپنا تو خیال یہ ہے کہ ہمیں اپنی نظموں میں فوجی روح پیدا کرنی چاہئے۔

"میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ شہزادہ خرم کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا ہے۔ شہزادہ فوج کی کمان بڑی عمدگی سے سنبھال سکتا ہے بشرطیکہ خان خاناں اس کے ساتھ ہو' راجاؤں سے ٹکر صرف مہابت خان ہی لے سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے حسب معمول سرحد کی حفاظت کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔"

نظیری! دراصل تم شاہی دربار کو اتنا نہیں سمجھتے' جتنا میں سمجھتا ہوں اگر مہابت خاں کو نئی فوج کی کمان مل جائے اور وہ تمام سرحدوں پر فتوحات حاصل کر لے' تو اس سے شہزادہ خرم کو کیا فائدہ پہنچے گا' اس کے مقابلے میں اگر شہزادہ خرم کو بہت بڑی فوج دے دی جائے اور وہ تھوڑی بہت فتح بھی حاصل کر لے تو اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں۔ یہ تو دو اور دو چار کی طرح بالکل صاف بات ہے۔ جہانگیر کو ان دنوں جنگ کی لہر آ گئی ہے اس لئے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو بڑی بڑی فتوحات بنا کر پیش کرنے کے لئے شعر سوچو۔ ہم تو اسی اصول پر کاربند ہیں۔"

"ہاں! بھئی یہ کام تم بہت اچھی طرح کر سکتے ہو!" نظیری نے مسکرا کر کہا۔

"ارے ہمیں تو تنخواہ ہی اسی بات کی ملتی ہے۔" فراش نے شانے کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس نے سامنے غبار کے اٹھتے ہوئے بادل کے اس طرف دیکھا۔

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جلوس جا رہا ہے کہیں ضرغام کی فوج تو نہیں؟"

دیکھتے دیکھتے ان کے ارد گرد میدان میں خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا۔ اس روز شاہی محل کے داروغہ و فراش خانہ نے یہاں خیمہ گاہ بنانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے شاہی خیمے کے لئے ایک بڑا سا قطعہ منتخب کیا گیا جس کے ارد گرد بانس گاڑ کر قناتیں لگا دی گئیں۔ قناتوں کی اس دیوار کے اندر فراش کو سرخ خیموں کی چھتیں ہوا میں اڑتی دکھائی دے رہی تھیں وہ بہ آسانی پہچان سکتا تھا کہ طویل مشورتوں کے خیمے کون سے ہیں؟ جہانگیر کی خواب گاہ کون سی ہے؟ اور ان کے عقب میں حرم سرا کے خیمے کون سے ہیں؟

قریب ہی جہاں شاہی احاطے کے پھاٹک پر جھنڈیاں لہرا رہی تھیں' برق اندازوں کا دستہ آ چکا تھا پیچھے پیچھے ہاتھیوں کی قطار گرد اڑاتی چلی آ رہی تھی۔ ہاتھی گنے اور لمبی لمبی گھاس کھا رہے تھے' ان کے فولادی خول میں لپٹے ہوئے دانتوں اور چرمی سامان کو دیکھ کر فراش کو یہ اندازہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ وہ جنگی ہاتھ ہیں۔ بیسیوں کی تعداد میں یہ ہاتھی اس شور اور ہنگامے سے جھومتے جھامتے گزر کر اپنی مقررہ جگہوں پر جا کھڑے ہوئے۔

شاہی خیمے کے قریب ہی راجپوت شہزادوں' افغان امیروں اور درباریوں کے خیمے قطار اندر قطار لگائے جا رہے تھے۔ بڑے راستے کے دونوں طرف لوگ دکانیں لگانے میں مصروف تھے جن کے عقب میں بیل گاڑیوں کے آس پاس ان کے بیوی بچوں کا ہجوم تھا۔ حماموں میں سے دھواں نکل نکل کر فضا میں پھیلنے لگا اور اس کے پیچھے ایک سفری مسجد کے گنبد جھلک رہے تھے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے نقارے پر چوٹ پڑتی یا نقیب کی آواز فضا میں گونجتی اور اس کے بعد اپنے گھڑسواروں اور خدام کے جلو میں کسی امیر کی سواری نمودار ہوتی۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو شور و شغب بھی دھیما پڑ گیا۔ سائیس گھوڑوں کی مالش کرنے لگے اور نوجوان لڑکے جن کے جسموں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں' ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اتنے میں باربردار اونٹوں کا آخری قافلہ خیموں سے گزرتا ہوا آیا۔ تمام اونٹ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تاہم ان کی بڑبڑاہٹ برابر سنائی دیتی رہی۔ اب ان کی پیٹھوں سے سامان اتارا جا رہا تھا اور ہوا بھی قدرے خنک ہو گئی تھی۔ بڑے بازار میں نقارچی جمع ہو گئے اور لوگوں کو اپنے اپنے خیموں میں جانے کا حکم دینے لگے۔

"با ادب! با ملاحظہ! ہوشیار! ظل الٰہی کی سواری آ رہی ہے۔"

دونوں شاعر اپنے اپنے گھوڑے سے اترے اور انہیں سائیسوں کے حوالے کرنے کے

بعد ہجوم کو چیرتے ہوئے شاہی خیمے کی طرف بڑھے۔ اتنے میں راجپوت شہ سواروں کا ایک دستہ خیمہ گاہ کی طرف آتا دکھائی دیا' جسے دیکھ کر ان دونوں کے منہ سے بے اختیار کلمات تحسین نکل گئے۔ خیمہ گاہ میں داخل ہو کر دستہ دو قطاروں میں تقسیم ہو گیا' سواروں کے نیزوں اور ڈھالوں کی کھڑکھڑاہٹ اور کلغی نما نقرئی خودوں کی جنبش فضاء میں ہلکا سا شور پیدا کر رہی تھی۔

"یہ شاہی دربار ہے یا کوئی فوج کوچ کر رہی ہے؟" نظیری نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہے تو یہ لشکر کا پڑاؤ لیکن دربار نظر آتا ہے۔ پھر جب ہم فوج کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں' تو ایسا لگتا ہے' جیسے میدان جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔

سادات بارہہ کے نقاروں کی گونج میں جب جہانگیر کا ہاتھی جھومتا جھامتا خیمہ گاہ کے دروازے میں داخل ہوا تو دونوں شاعر جھک کر کورنش بجا لائے۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں جہانگیر کے تاج میں ٹکے ہوئے ہیروں سے ٹکرائیں تو وہ یکایک دمک اٹھے اور ان کی روشنی میں جہانگیر کا چہرہ ایک لمحے کے لئے چمک کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

"اہا! کیسا نظارہ ہے!" نظیری پکار اٹھا لیکن اس کی نگاہیں شاہی سواری کے بعد کے منظر پر مرکوز تھیں۔ چھ چھ فٹ لمبے حبشی رستہ صاف کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور چار ہاتھی بغیر کسی سوار کے جھومتے جھامتے ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چاروں ہاتھیوں کے درمیان ایک دیو پیکر چوپایہ تھا جس پر زری کی جھول پڑی تھی اور ایک گنبد نما طلائی ہووج رکھا تھا۔ پتمبر کا مکیں خود تو پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن روزن میں سے باہر کی دنیا کا بخوبی نظارہ کر سکتا تھا۔ جب ہاتھی دروازے سے گزرا تو ہووج کا بالائی سرا محراب سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا' ارد گرد کھڑے ہوئے مرد یا تو مڑ کے کھڑے ہو گئے یا زمین بوسی کے لئے جھک گئے۔ سنہرے ہاتھی کے ساتھ ساتھ بے شمار کنیزیں نقاب اوڑھے اور برچھیاں' ڈھالیں اٹھائے گھوڑوں پر چلی آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جھالر دار مخروطی ٹوپیاں پہنے اور دوشالے اوڑھے خواجہ سراؤں کا ایک جھرمٹ تھا' آخر میں خواصیں پالکیوں میں بیٹھی چلی آ رہی تھیں اور ان سب کے پیچھے افغان اسپ سواروں کا ایک دستہ تھا۔

"ملکہ نور محل زندگی سے لطف اٹھانا خوب جانتی ہیں۔" فراش نے اس منظر کو دیکھ کر سرگوشی کی لیکن جیسے ہی توپوں کی دنا دن سے زمین کانپنے لگی تو وہ مبہوت ہو گیا۔ دروازے کے سامنے جتنی توپیں قطار میں تھیں ان سب کو "برق اندازوں کے سردار" کے اشارے پر

داغ دیا گیا تھا۔

راجپوت حفاظتی دستے کے گھوڑے ہنہنانے لگے اور دور سے ہجوم نے خوشی کے نعرے بلند کئے۔ دھواں لہراتا ہوا اٹھا اور خیمہ گاہ پر چھا گیا۔ اس ہنگامے میں فراش کو یاد ہی نہ رہا کہ شہنشاہ جب اپنے خیمے کے سامنے زمین پر قدم رکھتا ہے' تو اسے توپ کے گولوں سے سلامی دی جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ توپ وقت سے پہلے داغ دی گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ نور محل کے خدام دروازے میں داخل ہو گئے ہیں اس نے پوچھا۔

"توپ دا غنے کا حکم کس نے دیا ہے؟"

ہمارے ہوشیار اور فربہ اندام داروغہ توشہ خانہ آصف خاں نے "نظیری نے جواب دیا۔ "خود میں نے اسے" ترک کو اشارا کرتے دیکھا ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"اس وقت بالکل لڑائی کے دھوئیں کا مزہ آیا ہے" فراش بڑبڑایا "مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سلامی شہنشاہ کو نہیں ملکہ کو دی گئی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" نظیری نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"سفر کرنے سے پہلے شگون تو دیکھ لینا چاہئے" شہنشاہ کے ہم جام نے کہا اور منہ پرے کر لیا۔ دراصل فراش ہمیشہ ایسی باتوں کی ٹوہ میں رہتا تھا جن کی بنا پر وہ شاہی عنایات کا مستحق ہو سکے اور اسے ابھی ابھی ایک راستہ نظر آیا تھا۔ جب وہ اپنے خیمے میں داخل ہوا اور خدام نے اس کے کپڑے اتار کر بدن کی مالش کی اور اسے معطر درباری پوشاک پہنانے لگے تو اس وقت بھی یہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

اسے ایک سرپرست کی ضرورت تھی یہ صحیح ہے کہ وہ شہنشاہ کا ہم جام تھا لیکن مخمور جہاں گیر' اصل جہاں گیر سے مختلف تھا۔ فراش ایک ایسے آدمی کا حشر دیکھ چکا تھا جس کی زبان محض اس لئے گدی سے کھینچ لی گئی تھی کہ اس نے شہنشاہ کو نشے کی کوئی ترنگ یاد دلا دی تھی۔ فراش کو واقعی ایک ایسے مربی کی ضرورت تھی' جو شہنشاہ کے حضور اس کی سفارش کر سکے۔ ایسے آدمی کی تلاش میں اس نے اچھا خاصا وقت صرف کیا۔ اول اول اس نے فوجی سرداروں کے متعلق سوچا' لیکن خود ہی اس خیال کو دل سے نکال دیا۔ پھر اس کی نظر راجپوت شہزادوں پر گئی------ وہ راجپوت سرداروں کو شہزادے ہی سمجھتا تھا------ لیکن یہاں بھی اسے بات بنتی نہ دکھائی دی۔ راجپوت سرداروں کا غرور انہیں ایک تنگ بند شاعر کی سفارش کیوں کرنے دے گا۔ اب اس نے افسران خزانہ کی طرف نگاہ

دوڑائی' جن کی انگلیاں درہم و دینار کی تھیلیوں کے منہ کھولتی اور بند کرتی رہتی تھیں' لیکن دیوان شیخ فرید' جو "صاحب السیف والقلم" کے لقب سے ممتاز تھے اور جن کی زندگی قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی تھی' پائی پائی پر نظر رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی ذات پر بھی ناجائز طریقے سے کچھ خرچ کرنا حرام سمجھتے تھے' وہ بھلا اس کی دال کیسے گلنے دیں گے۔

"دوسرا دیوان نور محل کا والد غیاث بیگ ہے' جو ہے تو بڑا محنتی' خلیق اور ملنسار۔ لیکن رشوت قبول کر لیتا ہے' تاہم وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور سلطنت کی ذمہ داریوں نے اسے بری طرح گھیر رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میرے تحائف قبول کرنے کے بعد قبر میں جا سوئے۔ فراش نے سوچا۔

شاہی محل میں نور محل اور شہزادہ خرم دو ہی ایسے آدمی تھے جن کا ستارا عروج پر تھا۔ فراش کی خواہش تھی کہ ان میں سے کسی ایک سے وابستہ ہو جائے اور اب غروب آفتاب کے وقت اسے اچانک اس کا امکان بھی نظر آ گیا تھا۔ اس کے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ اس کا ہنس مکھ دوست آصف خان کبھی اس کا مربی بھی بن سکتا ہے۔ آصف خاں کو شاہی محل میں داروغہ توشہ خانہ کا عہدہ حاصل تھا۔ اسے کھانے پینے کا بے حد شوق تھا اور وہ شاعروں کو پسند بھی کرتا تھا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ فراش کا مربی بننا منظور نہ کر لیتا۔ آصف خاں کو اسی زمانے میں دو ہزاری منصب ملا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ نور محل کا بھائی' غیاث بیگ کا بیٹا اور شہزادہ خرم کا خسر تھا۔

"زیورات کا صندوقچہ لاؤ" اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا اور سونے کی ایک چھوٹی سی ڈبیا میں سے ایک سیاہ موتی نکال کر ریشمی معطر رومال میں لپٹا اور ایک رباعی کے ساتھ اپنے ملازم کے حوالے کیا کہ یہ تحفہ داروغہ توشہ خانہ کے پاس لے جائے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ ایوان خاص کی جانب چل دیا۔ جہاں امرا و وزرا جمع ہو رہے تھے۔ فراش کو کوئی ہنگامہ برپا کئے بغیر' آگے بڑھنے میں کمال حاصل تھا۔ حالانکہ ایسے مواقع پر' کوئی بھی بیرونی دروازے' نقرئی کٹہرے یا شاہی تخت کی حدبندی سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اسے آصف خاں کے قریب پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی جو شاہی تخت کے پائے کے پاس بیٹھا تھا۔ آصف خاں نے اپنا مسکراتا ہوا چاند سا چہرہ اٹھایا اور اس کی عقابی نگاہوں نے فراش کو اسی لمحے دیکھ لیا حالانکہ اس نے اپنی موجودگی کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا۔ اب آصف خاں کھسک کر اس کے قریب آیا اور اس کے کان میں کہنے لگا۔ شاعر

شیوا بیان کی رباعی سے ایں جانب کی بے حد عزت افزائی ہوئی ہے۔"

اس نے موتی کا ذکر تک نہ کیا۔ تاہم فراش جانتا تھا کہ یہ ہدیہ تشکر رباعی کے لئے نہیں، موتی کے لئے پیش کیا گیا ہے۔

"برگ سبز است تحفہ درویش" اس نے بڑے ادب سے گزارش کی "ایک غلام اپنے آقا کی اس سے زیادہ خدمت بھی کیا کر سکتا تھا؟ اس کی تو ایک ہی خواہش ہے کہ کسی طرح وہ بھی ایک خوش قسمت ستارے سے وابستہ ہو جائے۔"

"خوش قسمت ستارا؟"

فراش کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے ستاروں کا تو علم نہیں لیکن فال اور شگون سے قسمت کے رستے کا اندازہ کر سکتا ہوں۔" "تو پھر شاعر صاحب! جوابی تحفہ قبول کرنے سے بھی غافل نہ رہنا۔"

اس فقرے کا مطلب صاف تھا۔ آصف خاں نے دوسرے لفظوں میں فراش کو دعوت دی تھی کہ وہ اس کی ملازمت اختیار کر لے۔ دونوں ایک دوسرے کے رمز بخوبی سمجھتے تھے۔

کچھ دیر تک فراش سلطنت کے متعلق باتیں سنتا رہا۔ اسے بے چینی تھی کہ کسی نہ کسی طرح جہانگیر کی نگاہ اس پر پڑ جائے، امرا و وزراء کے اس اجتماع میں زیادہ تر ما لگذاری اور فوجی مصارف کی باتیں ہو رہی تھیں۔ جن سے شاعر کو مطلق دلچسپی نہ تھی اور وہ صرف اس کوشش میں تھا کہ شہنشاہ کو دربار میں اس کی حاضری کا علم ہو جائے۔ جب اس نے سمجھتا کہ یہ مقصد حل ہو گیا ہے تو وہ چپکے سے روشنیوں کے پیچھے کھسک گیا اور اس کے بعد ایوان خاص سے باہر نکل آیا۔

وہ چوب داروں کی نظریں چراتا اور اس بڑے الاؤ کی روشنی سے بچتا بچاتا، جو لشکر گاہ میں دیر سے آنے والوں کی رہنمائی کے لئے سو فٹ اونچے ایک مینار پر جل رہا تھا، نور محل کے خیمے کی بیرونی قناتوں کی جانب بڑھا۔ جہانگیر چونکہ اپنی محبوبہ کو دربار میں بھی اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا اس لئے وہ جانتا تھا کہ اس وقت نور محل ایوان خاص ہی میں پردے کے پیچھے ہو گی لیکن اس کے پاس یہ باور کرنے کے وجوہ بھی موجود تھے کہ اس کی ایک کنیز کو کہیں اور ہونا چاہئے۔ قنات کے دروازے پر اس نے پہرے دار کو بتایا کہ میں آصف خاں کو ایک پیغام دینے آیا ہوں۔ شاہی محل میں شاعروں پر چونکہ کوئی پابندی نہ تھی اس لئے فراش شاہی قناتوں کے آس پاس بھی بے روک ٹوک گھوم سکتا تھا۔ تاہم جب وہ

پہرے داروں کی نگاہ سے اوجھل ہوا تو جھٹ اس تاریکی میں داخل ہو گیا جو نور محل کے خیمے اور بیرونی قناتوں کی دیواروں کے درمیان چھائی ہوئی تھی۔

"مجسمہ رعنائی! میں نے ایک نئی غزل کہی ہے اس نے تاریکی میں کھڑے ہوئے ایک سائے سے کہا "میں یہ غزل پس پردہ وجود کو سنانے کا متمنی ہوں! یہ لیجئے ایک حقیر نذرانہ۔۔۔۔۔۔۔!"

اس کے جواب میں ایک دبی سی ہنسی سنائی دی اور افغان قلما قنی' جو خیمے کے پیچھے پہرہ دے رہی تھی' اندھیرے سے نکل کر اس جگہ آئی جہاں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فراش نے ایک زمردیں کنگن اس کے حوالے کر دیا' وہ خوشی خوشی اسے دیکھنے لگی۔ فراش نے اس سے پہلے بھی کئی بار اس کے شام کے فرائض کو خوشگوار بنایا تھا' تاہم شاعر کسی اور عورت کی تلاش میں تھا وہ تاریکی میں رینگتا ہوا آہستہ آہستہ خیمے کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا حتی کہ دبیز ململ کے پردے میں سے شمع کی روشنی نظر آئی کچھ دیر کے بعد اسے نقرئی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ اس نے ململ کے پردے کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ فوراً ہی خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر ادھوری انگڑائی لینے کی آواز آئی۔

"اف! کتنے افسردہ لمحات ہیں!"

خیمے کے اندر کسی نے جیسے خلاؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"کتنی مصیبت ہے۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔" فراش نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"لیکن اندر آئے کیوں؟" لڑکی کی آواز نے تعجب کے لہجے میں پوچھا۔

فراش سمجھ گیا کہ اس وقت وہ اپنے خیمے میں اکیلی ہے۔ اس نے بڑی بے حیائی سے اپنے ایک حریف کا شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم تھا۔ (۶)

"اگر عاشق اپنے محبوب کے سنگ آستاں پر آ کر سر پھوڑ دے؟ تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اس کا اور ٹھکانہ ہی کون سا ہے؟ بہرحال وہ آ گیا ہے۔ اب محافظ چاہیں تو اس کے خون سے اپنے خنجروں کی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"

افغان قلما قنی اس کے اور قریب ہو گئی مبادا اس کے کلام بلاغت نظام کا کوئی حصہ اس کے سننے سے رہ جائے۔ وہ اشعار سننے لگی۔ اندر سے بھی ایک آہ نے اسے داد دی۔

"لیکن وہ ہے کون؟"

"نغمہ کار فراش! جو ہندوستان کے اجڈ کانوں میں ایک ایسی موسیقی کا رس گھولتا ہے، جو آج تک انجانی ہے اور کیا ہے یہ موسیقی؟ آپ ہی کے لحن داؤدی کی ایک گونج!"

ایک نرم رد قہقہہ۔ اس کے بعد متوقع خاموشی------!

عشق جتانے کے لئے ستائش گری کی ضرورت تھی اور شاعر کو اس فن میں ید طولیٰ حاصل تھا' افغان قلما قنی ہانپ رہی تھی۔ اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا مبادا یہ باتیں کسی کے کان میں پڑ جائیں۔ لیکن پردہ نشین لڑکی مطمئن نظر آ رہی تھی۔ فراش نے مقطع پڑھا:

"اگر اس کا دیدار مجھے نصیب نہ ہوا' تو سورج میرے بے جان جسم پر طلوع ہو گا۔" (۷)

"خیمہ کی یہ سیون ادھڑ گئی ہے۔ اس کو سینا چاہئے۔"

شاعر کی نگاہ بے تابانہ طور پر اٹھی اور ادھڑی ہوئی سیون پر جا کے رک گئی۔ اس نے خنجر نکال کر تیزی سے سوراخ کو اور بڑا کیا اور سانس روک کر چوروں کی طرح اندر جھانکنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ مریم تکیوں اور گدوں کے درمیان مٹھی مٹھائی بیٹھی ہے۔ بظاہر وہ اس سے بے خبر تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھوں تک نقاب ڈال رکھی تھی لیکن نقاب کی یہ جالی تار عنکبوت سے بھی زیادہ نازک تھی۔ اس پیکر ناز و ادا کو دیکھ کر فراش عش عش کر اٹھا' جس کے لب لعلیں' مہر سلیمانی سے مشابہ اور بال' کالی آندھی سے زیادہ سیاہ تھے۔ اس کا لچکیلا جسم ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے ہوا میں بید مجنوں لہرا رہا ہو۔

"صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔"

شاعر کی زبان سے نکلا۔ لڑکی نے ایک لحظہ کے لئے روزن کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور فوراً ہی جھکا لیں۔

"ایک غزال نے مجھ پر نگاہ کرم کی ہے" شاعر نے کہا اور لجاجت آمیز پیرائے میں بولا:۔

"خدا کے لئے شمع بجھا دو۔ ورنہ میرے ہوش و حواس برقرار نہ رہیں گے۔"

شمع بجھ گئی افغان قلما قنی یکایک لرز اٹھی۔ وہ فراش کے قریب پہنچی۔ تاہم یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس نے روزن میں سے لڑکی کا بوسہ لینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔

"جاؤ' بھاگ جاؤ۔ بے شرم' بے حیا' "وہ" دربار سے آنے والی ہیں"

فراش بڑے تامل کے ساتھ خیمے کی قنات سے علیحدہ ہوا۔ ابن نے مریم کی کلائی سے ایک ریشمیں دست بند اتار لیا تھا اور اب اسے چوم رہا تھا۔ اس نے سوچا' مریم کا دامن عصمت قریباً" پاک ہے' حالانکہ اسے شاہی محل میں آئے آٹھ سال ہو گئے ہیں اور اتنی مدت میں کسی لڑکی کے لئے حرم سرائے شاہی میں پاک دامن رہنا کوئی آسان کام نہیں جبھی تو وہ فراش کی آغوش میں کانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی تھی' اس نے اپنے تئیں بڑا خوش نصیب سمجھا اور سوچا کہ اگر اس کا عشق کامیاب ہو جائے' تو نور محل کی ہمراز اس کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ دو ڈوری کی کمان ہر حال میں بہتر ہوتی ہے۔ وہ آصف خاں سے التجا کرے گا اور مریم کو حکم دے گا۔ علاوہ ازیں یہ سازش بجائے خود اسے بڑی دلکش نظر آئی۔

جب فراش خیمے سے باہر نکلا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے ایک سفید سایہ دیکھا جو دبے پاؤں گھاس پر محو خرام تھا۔ اس کی سانس سینے میں اٹک کر رہ گئی اور وہ ہاتھ باندھ کر کورنش بجا لایا۔

"کس کی تلاش ہے شاعر صاحب!"

اسے کیا خبر تھی کہ نور محل یکہ و تنہا دربار سے اس طرح واپس آئے گی کہ اس کے ساتھ روشنی تک نہ ہو گی' تاہم الاؤ کی روشنی میں اس کی نازک اندامی صاف طور پر نظر آ رہی تھی اور وہ سر سے لے کر پاؤں تک سفید ریشمی لباس میں ملبوس تھی۔

"میں تو..... میں تو.....!" اس نے گھبرا کر کہا اور فوراً" ہی خوشامد پر اتر آیا۔

"میں علیا حضرات نور محل کی خدمت میں اپنے چند حقیر اشعار پیش کرنے آیا تھا۔"

"تو پھر سناؤ!" نور محل نے کہا۔ فراش سر کھجانے لگا۔ آخر وہ کیا سنائے؟ نور محل پچھلے دنوں شیر کے شکار سے واپس آئی ہے۔ کیوں نہ اسی کے متعلق کوئی شعر پیش کیا جائے۔ اس طرح جہاں گیر کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

نورجہاں گرچہ بظاہر زن است
درصف مرداں زن شیر افگن است (۸)

اچانک اس نے دیکھا کہ ریشمیں نقاب کے اندر چھپی ہوئی سیاہ آنکھوں سے غیظ و غضب کے شرارے نکل رہے ہیں اور اسے یاد آیا کہ نور محل کے پہلے شوہر کو جہانگیر کے

غیرارادی حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ فراش خاصا دلیر انسان تھا۔ اس کے باوجود اس کی نگاہوں کے سامنے یہ منظر گھوم گیا کہ اس کی آنکھیں نکال کر لاش کو ہاتھی کے پاؤں تلے روندا جا رہا ہے۔ اسے بروقت شیرافگن کا خیال کیوں نہ آیا؟ تاہم نہ سفید سائے نے اپنی جگہ سے جنبش کی' نہ اس کی سانس میں تیزی پیدا ہوئی معلوم ہوتا تھا وہ اسے تعجب سے دیکھ رہی ہے۔

"یا تو تم احمق ہو" نورمحل نے کہا "یا جتنے نظر آتے ہو اتنے بہادر نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تنہائی میں تمہارے مزید عشقیہ اشعار سننے کی مجھے ضرورت نہیں!"

زندگی میں پہلی بار فراش کی زبان کو جیسے تالے لگ گئے۔ کیا وہ اس کی باتیں سن رہی تھی؟ کیا چند لمحے پہلے کی باتیں وہ سن رہی تھی؟ اس کی نگاہ اتنی تیز ہے کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہے؟ جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں' یا وہ اس کے ساتھ کھیل رہی ہے؟" اس سے چہل' کر رہی ہے؟"

"ملکہ عالم" اس نے سر جھکا کر کہا "آپ کا اقبال بلند ہو۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ نورمحل فضا میں گلاب کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو چھوڑ کر اپنے خیمہ کی طرف جا چکی ہے۔

فراش نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ گر کر آنکھوں کو نمناک بنا رہا تھا۔ جب وہ پسینہ پونچھ کر جنگلے سے باہر نکلا تو ایک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"میرا خیال ہے : وہ نرا گاؤدی ہے!"

"ہاں! احمد" دوسرے نے جواب دیا "کیوں کہ وہ اتنا بہادر نہیں جتنا نظر آتا ہے۔"

شاعر نے بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھا تو اسے دروازے پر دو طویل القامت افغان پہرے دار نظر آئے۔ فراش نے جب اپنے پیش قبض پر ہاتھ ڈالا' تو پہرے داروں نے بھی اپنے خنجر تان لئے۔ ان کے دانت ان کی سیاہ ڈاڑھیوں میں سے چمک رہے تھے۔ فراش جانتا تھا کہ ان سے زور آزمائی بے سود ہے۔ اس نے زمین پر تھوکا اور غصے کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔

"تلوار کا نہیں الفاظ کا دھنی ہے۔"

"ان میں سے ایک پہرے دار نے آوازہ کسا۔"

فراش غصے سے دانت پیستا اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور جو غلام اس کے کپڑے بدلوانے اور شراب پیش کرنے کے لئے آگے بڑھے انہیں بے تحاشا برا بھلا کہنے لگا۔ آخر کس طاقت نے اس عورت کو تنہا رات کے وقت باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ جہاں گیر کو متاثر کر لیتی ہو اور شہزادہ خرم بھی اس کے کہنے پر چل سکتا ہے' بشرطیکہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے دشمن نہ بن جائیں۔ اسی سوال میں غلطاں پیچاں وہ رات گئے تک اپنے بستر میں پڑا رہا اور نوکروں کو سزا دینی بھول گیا۔

جہانگیر جنوبی علاقوں کی گرمی کی تالاب نہ لا سکا۔ جن کی طرف وہ اپنے لشکر کے ہمراہ کوچ کر رہا تھا۔ اس رات اس کا چوڑا چہرہ زرد پڑ گیا اور تھکاوٹ نے اس کی آنکھوں کے ارد گرد حلقے ڈال دیئے۔ وہ اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح سینہ تان کر چل رہا تھا لیکن اسے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس نے ابھی تک افیون کی چسکی نہیں لی تھی۔ اسی اثنا میں وہ خواب گاہ جانے سے پہلے نور محل کے خیمے میں داخل ہوا۔

وہ خیمے کا بدلہ ہوا نقشہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ قالینوں پر پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ دور دیواروں پر پھولوں کے گجرے ان مشجری پردوں کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ جن پر زر دوزی کے کام میں انسانوں سے بھرے ہوئے باغوں کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ انسانی خطوط سنہری تاروں سے بنائے گئے تھے اور اس کام میں اتنی چابک دستی صرف کی گئی تھی کہ تصویریں منہ سے بولنے لگی تھیں۔ اس طلسم کو زیادہ پراثر' زیادہ دل کش بنانے کے لئے بیرونی ہوا ان نادیدہ پنکھوں کے ذریعے خیمے میں لائی گئی تھی' جو بالائی قمقمے کے نیچے گردش کر رہے تھے۔ شمعیں پھولوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں' ایک طرف ایک بڑا سا گول سوراخ تھا' جس میں سے الاؤ کی تیز نقرئی روشنی اندر داخل ہو کر چاندنی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ سنگ سفید کے فوارے چھوٹے ہوئے تھے اور ان سے پانی اچھل اچھل کر اپنی گزر گاہوں میں بہ رہا تھا۔

خود نور محل بھی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے غسل کرنے کے بعد جسم پر صندل کا تیل لگایا تھا اور اس عجلت کا کوئی معمولی سا اثر بھی اس پر نہ تھا جو اس نے جہانگیر کے لئے اپنے سنگھار میں صرف کی تھی' اس کے سیاہ بال چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی ایک جالی میں لپٹے تھے اور ایک باریک دوپٹہ سینے سے ہوتا ہوا اس کے شانوں پر پڑا تھا۔

جہانگیر کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ نور محل سے حسب معمول ایک دو باتیں کرکے پرتھوی کی قیام گاہ میں چلا جائے گا تاکہ سونے سے پہلے افیون کھا سکے۔ لیکن ایرانی خاتون کو جیسے کوئی بات ہی نہ کرنی تھی۔ وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے ایک فوارے کے کنارے بیٹھی رہی۔ گویا اپنے آقا کی آمد سے بالکل بے خبر ہے۔ جہانگیر اس کے قریب جا کر لیٹ گیا اور اس انتظار میں رہا کہ ابھی نور محل کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں پھیل جائیں گی۔ یا وہ اس کی جانب بچوں کے سے اشتیاق سے دیکھنے لگے گی لیکن ساتھ ہی جہانگیر کا رواں رواں افیون مانگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ "کیا اس کے لئے مجھے کہیں اور جانا ہو گا؟"

نور محل نے جیسے اس کے خیالات کی رو کو پا لیا کیونکہ اس نے فوراً کہا۔

"مجھے اپنے آقا کی محبت پر رشک آتا ہے!"

"تمہیں؟" وہ مسکرایا "لیکن کیوں؟"

"کیونکہ یہ نشہ انہیں مجھ سے دور لئے جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں ان کے دل میں ایک ہی آرزو اور ایک ہی طلب رہے۔"

"میرے دل میں تو کئی آرزوئیں ہیں! وہ ایک آرزو کون سی ہے؟"

نور محل نے بڑی تیزی سے جھک کر جہاں گیر کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کے ہونٹ اپنے سرتاج کے ہونٹوں سے مس کرنے لگے۔ جہانگیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے پتھر کی مورتی میں یکایک ایک لمحے کے لئے جان پڑ گئی ہے۔ اس نے اس تجربے کو خوش گوار پایا' وہ اس سے بالکل بے خبر تھا کہ نور محل کے دل کو بڑا دھکا لگا ہے۔ اس نے بڑی محنت سے خیمے میں چاندنی رات کا منظر پیش کیا تھا لیکن جہانگیر نے اس کی تعریف میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا تھا' بلکہ اس کے برعکس اس کے ذہن میں افیون اور پرتھوی گردش کر رہے تھے۔ نور محل نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کے دماغ سے وہ ان دونوں چیزوں کو نکال کر دم لے گی لیکن اس کے لئے وہ طریقہ کیا اختیار کرے؟ اس کا ابھی تک اسے خود بھی علم نہ تھا۔

اس کے مقابلے میں جہانگیر کچھ اور سوچ رہا تھا۔

"تم تین سال سے میرے حرم میں ہو لیکن میں تمہیں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔"

"آپ مجھے سمجھ بھی کس طرح سکتے ہیں؟"

اس کے نرم نرم ابرو کھنچ گئے: "میں شاہی محل کی کب ہوں؟ میری زندگی تو محتاجی

اور تلخی ہی میں گزری ہے جن دنوں مجھے لڑائی یا تباہی کی خبروں کا انتظار تھا ان دنوں بھی میں اپنے ہاتھ سے کام کرتی رہی۔ میرے عزیز رشتہ داروں کا شمار عام لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرے پاس کپڑے کی گڑیا اب بھی موجود ہے۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی: "اس گڑیا کا چہرہ بگڑ چکا ہے لیکن میں اس پر نیا رنگ نہیں کرنا چاہتی۔"

طبیعت کی رو کی یہ اچانک تبدیلی جہانگیر کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ شکار گاہوں میں جانے کے سوا وہ شاہی محل سے کبھی باہر نہ نکلا تھا اور ایسا کرنا شاید اس کے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ اندازہ کرنے کی کوشش کہ اس کی بیوی کا بچپن کیسا ہو گا لیکن مشکل کام سمجھ کر اس نے یہ خیال فوراً ہی ترک کر دیا۔ اس کی توجہ فوارے سے گرنے والے پانی کی ٹپ ٹپ کی جانب منعطف ہو گئی۔

"تمہاری آمد سے میرے دربار کی رونق دوبالا ہو گئی ہے!" فوارے سے پانی گرنے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ "لیکن مہرو! میں نے تو ایسی عورت کبھی نہیں دیکھی جو نئی گڑیوں سے کھیلنا نہ چاہتی ہو۔"

اس کی انگلیاں جہانگیر کے پپوٹوں سے کھیلنے لگیں۔

"لیکن میری گڑیا تو پرانی ہے اور بہت بوسیدہ ہو چکی ہے!"

"پھر تمہیں کون سا کھلونا پسند ہے؟"

"بہت سے!" فوارے کے ٹپ ٹپ میں نور محل کی یہ مدہم آواز اسے تسکین دے رہی تھی، جیسے اشارا کر رہی ہو کہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی وہ ان پہاڑوں کی سیر کریں گے جن کی برف پوش چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔

"اخاہ کشمیر؟" جہانگیر نے اونگھتے اونگھتے کہا۔

"وہاں عجیب و غریب پرندے ہوتے ہیں------ عقابوں کے لئے۔"

اس کے بعد وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا اور نور محل اس کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی کہ اس کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ رات گئے تک وہ بوندیں گرنے کا سماں دیکھتی رہی، ادھر پرتھوی جہاں گیر کی آمد کا بے سود انتظار کر رہی تھی۔

گجردم جب جہانگیر نماز فجر ادا کر رہا تھا، نور محل نے مریم کو بلایا لیکن ایک کنیز نے آ کر بتایا کہ مریم کا کہیں پتا نہیں۔ باہر کے خیموں میں اسے بہتیرا ڈھونڈا گیا لیکن وہ کہیں غائب

تھی۔

نور محل نے آچا کو طلب کیا۔ آچا نے افغان غلاموں سے بڑی سختی کے ساتھ بازپرس کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ باہر کے پہرے داروں نے بھی صاف کہہ دیا کہ انہوں نے کسی عورت کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔

مریم اپنے خیمے میں اس وقت موجود تھی جب نور محل واپس آئی تھی۔ اس کے بعد کسی نے بھی اسے نہ دیکھا تھا۔ وہ شیر کی جس کھال پر سوئی تھی وہ مڑی تڑی اس کی خواب گاہ کے ایک کونے میں پڑی تھی لیکن اس کے زیورات کی صندوقچی اور عطردان جوں کے توں پڑے تھے۔ اگر مریم رات کی تاریکی میں بھاگ نکلی ہوتی تو وہ زیورات ضرورت ساتھ لے جاتی لیکن نور محل جانتی تھی کہ لڑکی بھاگنے والی نہیں۔ تو پھر وہ کہاں ہے؟ یہ معما کوئی بھی حل نہ کر سکا۔

اتنے میں نوبت بجی اور جہانگیر نے کوچ کا حکم دے دیا لیکن نور محل کی نگاہیں ابھی تک کنیز کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ شاہی سواری کے ساتھ ساتھ پچاس ہزار کا لشکر بڑھا چلا آ رہا تھا لیکن مریم کا کوئی پتا نہ تھا۔

تاہم اس رات جب وہ ایک نئے پڑاؤ پر پہنچے---- اور انہیں ہر نئے پڑاؤ پر ایک نیا شاہی خیمہ تیار ملتا تھا---- تو مریم یکایک مل گئی۔

جونہی کہاروں نے کنیزوں کی ڈولیاں زمین پر رکھیں اور ان میں سے یکے بعد دیگرے خواصیں، کنیزیں اور لڑکیاں نکل کر ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگیں تو ایک ڈولی پر بدستور پردے پڑے رہے۔ ایک کنیز نے پردہ اٹھا کر دیکھا تو تکیوں اور گدوں پر پڑی ہوئی اسے مریم کی لاش نظر آئی۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ مریم کے بال گندھے ہوئے تھے اور اس کے رخساروں پر غازہ ملا ہوا تھا لیکن آنکھیں کھلی تھیں اور اینٹھی ہوئی انگلیوں پر کاغذ کا ایک پرزہ لپٹا تھا۔ جب یہ پرزہ نور محل کے پاس لایا گیا تو اس نے کھول کر دل ہی دل میں عبارت پڑھی۔

"ہر شب گرد پر واضح ہو کہ اسے قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے۔ کیونکہ ہر چھوٹے بڑے کے لئے قبر کھودی جاتی ہے۔"

یہ تحریر کسی پختہ قلم نے بڑے اطمینان سے لکھی تھی لیکن سواد خط نور محل کے لئے اجنبی تھا۔ اس کے پاس ڈولیوں کے محافظ آئے اور بتایا کہ یہ ڈولی دو اجنبی کہارعین اس

وقت لائے تھے جب لشکر خیمہ گاہ میں داخل ہوا۔ لیکن نور محل خیالات میں گم تھی اس کے کان یہ الفاظ سننے سے قاصر رہے۔ پہریداروں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت ہنگامے میں انہیں یہ تحقیق کرنے کا موقع نہ ملا کہ یہ ——— ڈولی کہاں سے آئی ہے' اور اسے کون اٹھا کر لایا ہے۔ جو کہار اس کے ساتھ آئے تھے' کوئی انہیں مرہٹے بتاتا ہے اور کوئی پٹھان' ڈولی زمین پر رکھتے ہی وہ مجمع میں کہیں غائب ہو گئے اب ان کا ڈھونڈنا ایسا ہی تھا۔ جیسے ریگ زار میں دو خاص ذروں کی تلاش!

نور محل کو کوئی حیرت نہ ہوئی' جب مریم کی لاش کا معائنہ کرنے کے بعد اسے بتایا گیا کہ مریم کی موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے اور قاتلوں نے اس کی لاش پر خوشبو لگا دی ہے۔

"یہاں سے کوئی بات باہر نہ نکلنے پائے" نور محل نے حکم دیا۔

اس نے لاش کو ایک نظر دیکھا اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ تہ کئے ہوئے کاغذ کو دوبارہ کھول کر پڑھا اور بین السطور کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس میں قتل کی دھمکی دی گئی تھی۔ اور یہ اشارا بھی مضمر تھا کہ اس کے شاہی محل سے بے پردہ نکلنے کی کسی کو خبر ہو گئی ہے۔ ممکن ہے یہ خبر زبردستی مریم ہی سے لی گئی ہو۔ جس کے بعد اسے زہر دے دیا گیا———

عجب نہیں یہ کام پرتھوی نے کیا ہو' وہ شاہی حرم کے پالتو چیتے سے بھی زیادہ بے رحم ہے———!

تاہم نور محل کو یقین نہ آیا کہ پرتھوی ایک کنیز کو قتل کرنے کے بعد اسے بھی ایک ناشائستہ تحریری دھمکی بھجوا کر مطمئن ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ شاعر فراش' جو مریم کی محبت کے گیت گاتا رہتا تھا اسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے گیا ہو' تاہم وہ مریم کی لاش واپس نہ کرتا لیکن ان دونوں کے علاوہ مریم کا دشمن بھی کون ہو سکتا تھا؟ شاہی حرم کے لڑائی جھگڑوں میں وہ کسی کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ پھر یہ کون تھا جس نے شاہی حرم کی محبوب ترین ہستی پر ضرب لگانے کی جرات کی تھی۔

بہرحال یہ ظاہر تھا کہ شاہی تخت کے ارد گرد جو لوگ جمع رہتے ہیں' ان ہی میں سے کسی نے مریم کو قتل کیا اور اس کی لاش بھیج کر گویا نور محل کو دھمکی دی تھی لیکن اس دھمکی کا سبب کیا تھا؟ اس کا انکشاف آئندہ چل کر ہو گا اور نور محل بھی خوب جانتی تھی کہ

ایک دن آئے گا جب اس کا انکشاف ہو گا اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جونہی انکشاف ہوا وہ مریم کا انتقام لے کر رہے گی۔ اسے زندگی میں تین ہستیاں محبوب تھیں جن میں سے ایک تو اس سے چھن گئی تھی' دوسری اس کی اپنی بیٹی لاڈلی تھی جسے اس نے آگرہ کے مضافات میں چھپا رکھا تھا۔ لیکن ارسلان اور بچی کی دایہ کے سوا کوئی بھی اس راز سے واقف نہ تھا اور تیسرا جہانگیر تھا------- ہندوستان کی قسمت کا مالک! جہانگیر کا کوئی بیٹا ہی اس کی جان کا دشمن ہو سکتا تھا لیکن ان کے لئے بھی کوئی وجہ اختلاف نہ تھی۔ بادشاہ کے خلاف طاقت آزمانا حماقت سے کم نہ تھا۔

جہانگیر سے اس کی محبت نئی نہ تھی بلکہ وہ اس کے عشق میں اس وقت مبتلا ہوئی جب اس کی عمر بمشکل چودہ برس کی ہو گی اس نے مرمریں جھلملیوں میں سے شہزادہ سلیم کو پائیں باغ میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ پھلواریوں میں چھڑی مار مار کر پھول گرایا کرتا تھا۔ وہ اب بھی اسے بادشاہ تصور نہ کرتی تھی بلکہ اس کے نزدیک جہانگیر اس عمر میں بھی ایک خوش طبع بے رحم سا لڑکا تھا جس کی آنکھیں عجیب عجیب باتیں دیکھنے کے لئے ہر لحہ کشادہ رہتی تھیں۔ وہ اس کے اپنے جسم کا ایک حصہ تھا------- خواہ وہ کتنا ہی تن آسان' بھاری بھرکم' اور دمے کا مریض کیوں نہ ہو-----!

وہ مسہری پر اپنی پھٹی پرانی گڑیا لئے لیٹی تھی کہ اتنے میں کنیزیں جہاں گیر کی آمد کے سلسلے میں اس کی پوشاک تبدیل کرانے آ گئیں۔

لشکر آہستہ آہستہ لمبی گھاس سے ڈھکی ہوئی گھاٹیوں پر چڑھنے لگا یہاں آبادی خال خال اور راتیں خنک تھیں۔ لشکر ایک شہر کی فصیل کے نیچے آ کر ٹھہر گیا جس کے آس پاس کئی جھیلیں تھیں اور وہیں سے راجپوتانہ کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔

یہاں اجمیر کے مقام پر لشکر مقیم ہو گیا۔ جہانگیر تو اس جنگ کی خبروں کے انتظار میں' جو میواڑ کے راجہ کے خلاف لڑی جا رہی تھی دامن کوہ میں شکار کھیلنے لگا اور شہزادہ خرم ایک تجربہ کار جرنیل کے ہمراہ فوج لے کر آگے بڑھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی' یا راجپوت------- جن کے چچا زاد بھائیوں سے مغل فوج میں شامل ہو کر خود راجپوتوں کے خلاف جنگ کی------- سابقہ لڑائیوں کی وجہ سے دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ چنانچہ وہ زیادہ دیر تک مغلوں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے لیکن اس لڑائی میں فتح کا سہرا چونکہ خرم کے سر بندھنا مقصود تھا اس لئے تجربہ کار جرنیل کو واپس بلا لیا گیا۔

بظاہر اسے بہت بڑی فتح حاصل ہوئی۔ اجمیر میں شاہی لشکر کو یہ خوش خبری ان الفاظ میں پہنچی کہ خرم نے بڑی ہوشیاری سے اس راجپوت رانا کو مطیع کر لیا ہے جس کے آباواجداد نے بھی فاتح اکبر کے آگے کبھی سر نہ جھکایا تھا۔ راجپوتوں کا سردار اطاعت گزاری کے لئے خود حاضر نہ ہوا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بھیج دیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے اس کے بیٹے کو تحائف سے گراں بار کر دیا بلکہ حکم دیا کہ راجپوت راناؤں کی مورتیاں بنا کر آگرہ میں جھروکے کے سامنے رکھ دی جائیں۔

خرم کو اس نے بے شمار انعام و اکرام سے سرفراز کیا حتی کہ میدان جنگ باقاعدہ دربار بن گیا۔ اس جوش و خروش میں بوڑھے جرنیل کو کسی نے یاد بھی نہ کیا۔

شہنشاہ کے تحائف میں نور محل نے بھی اپنے تحائف کا اضافہ کیا اور انگھڑ راجپوت شہزادے کو ایک شمشیر مرصع اور ایک شاندار ہاتھی اپنی طرف سے عطا کیا' اسے ہر وقت ایک نئی ضیافت کے اہتمام میں بھی مصروف رہنا پڑتا تھا۔ اس موقع پر شعراء نے قطعات تہنیت پیش کئے اور فتح کا جشن اس شان سے منایا گیا کہ لشکر گاہ پرستان کا نمونہ بن گیا۔

اتنے میں شہنشاہ جہانگیر کو اطلاع ملی کہ شمالی ہند کے پہاڑی دیہات میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے جس کا اثر لاہور تک محسوس کیا گیا ہے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ رات کو آسمان پر "موت کے شعلے" بھڑکتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک دن' صبح آگرہ کے بعض محلوں میں مکانات کی دیواروں پر کھریا مٹی سے دائرے بھی کھچے ہوئے پائے گئے۔

شاہی طبیبوں نے' جو جہاں گیر کے ساتھ رہتے تھے' بتایا کہ گذشتہ دو سال چونکہ خشک گزرے ہیں اس لئے یہ بیماری پانی کی کمیابی کے باعث پھیل گئی ہے۔ نجومیوں نے کہا کہ قطب شمالی کے پاس ایک دمدار ستارا دیکھا گیا ہے۔ شہنشاہ نے تھوڑی دیر اس نئی بیماری کے متعلق سوچا' جس نے ایک ہی دن میں ہزاروں آدمیوں کی بھینٹ لے لی تھی۔ اسی اثناء میں خبر آئی کہ طاعون آگرہ میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ خبر کاروان سرائے کا ایک بھنگی اس پہرے دار کے پاس لایا' جو نور محل کے خیمے کے باہر متعین تھا۔ اس نے افغان قلما قنیوں کو سنائی اور افغان قلما قنیوں نے فوراً" نور محل کے کانوں تک پہنچا دی۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر نور محل شہنشاہ کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پریشانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"شیخو بابا! میں باہر جانا چاہتی ہوں' پندرہ روز کے لئے میری حاضری معاف کر دیجئے۔"

"باہر کہاں؟" اس نے سوچا شاید کوئی نیا گل کھلایا جا رہا ہے۔

"کیا" "نور" اس "محل" کو چھوڑ جائے گا؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ میرے سرتاج' برا نہ مانیں------ مجھے اسی وقت جانا ہے۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے"

نور محل نے بے صبری کا اظہار تو کر دیا لیکن یہ بھول گئی کہ جہانگیر کو کسی عجلت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے بڑی لجاجت سے آگرہ جانے کی اجازت طلب کی۔ اس کا چہرہ یہ درخواست کرتے وقت تمتما رہا تھا۔ طاعون زدہ شہر میں اس کی بیٹی لاڈلی ایک دایہ کے پاس رہتی تھی انہیں کسی نہ کسی طرح------ بشرطیکہ وہ پہلے ہی روانہ نہ ہو گئیں------ ڈھونڈ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچانا تھا۔ وہ اپنے ساتھ افغان محافظوں اور خواجہ سرا عنبر کو لے کر فوراً" جانا چاہتی تھی۔

"کہاں؟ بیماری کے گھر؟" جہانگیر نے بے پروائی سے کہا "نہیں! یہ نہیں ہو سکتا!"

البتہ ہرکاروں کا ایک دستہ بھجوا دیا جائے گا جو آگرہ کے قلعہ والوں سے کہے گا کہ وہ بچی کو ڈھونڈ کر شاہی محل میں پہنچا دیں۔ نور محل کا اس طرح بھیس بدل کر محل سے باہر جانا' دیوانگی تھی'

"شیخو بابا------!" اس نے جذبات پر مشکل سے قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ کس طرح بتاتی کہ محل کے لوگ لاڈلی یا اس کی دایہ کو نہیں جانتے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی جان کی پڑے گی یا وہ نور محل کی بچی کو خیال کریں گے؟------ اسے مریم کی لاش کا دھیان آیا! اس سے پہلے وہ طاعون زدہ شہر میں رہ چکی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ اس وقت آگرے میں کیسی بھگدڑ مچی ہو گی!

"پھر پیغام میری طرف سے جانا چاہئے۔" نور محل نے کہا۔

"خدا تمہاری بچی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے!" جہاں گیر بچوں کے معاملے میں بڑا جذباتی تھا۔

نور محل نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا------ حالانکہ وہ ایسا شاذونادر ہی کرتی تھی------ اور اس سے معافی کی خواستگار ہوئی۔ جب جہانگیر نے اسے تہ دل سے معاف کر دیا تو وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

اس رات جب شہنشاہ آخری دربار کے بعد نور محل کے خیمے میں آیا تو اسے یہ دیکھ کر قدرے تعجب ہوا کہ نور محل کی تمام خواصیں ایک ایک کرکے اس کے پاؤں پڑ رہی ہیں۔ ایک کنیز نے اسے ریشمی دست بند پیش کیا۔ جسے دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا کہ یہی بازوبند اسے آگرہ کے قلعے میں دیا گیا تھا' جب نور محل نے شاہی حرم سے باہر نکلنے کا اعتراف کیا تھا۔

لیکن اب نور محل کو شاہی خیمہ چھوڑے چار گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ خلیل خاں کے لباس میں ارسلان کے پہلو بہ پہلو گھوڑے پر سوار آگرہ کی جانب ہوا ہو چکی تھی------؟

آدھی رات کے وقت وہ پہاڑوں سے اتر کر میدان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ستاروں کی مدہم روشنی میں جھاڑیاں ریت کی نسبت سیاہ نظر آ رہی تھیں اب چونکہ وہ پہاڑوں کی خنک فضا سے نکل آئے تھے۔ اس لئے گھوڑے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ لشکر کا ایک پڑاؤ وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ارسلان نے ایک کارواں سرائے کی سفید دیوار کی جانب اشارا کیا۔

انہوں نے گھوڑوں کا رخ سرائے کے محرابی دروازے کی طرف موڑ دیا۔ اندر اپلوں کی آگ جل رہی تھی۔ نور محل اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بوڑھے ترک نے آگے بڑھ کر سرائے کے مالک کو جگا دیا اور اس سے گھوڑے بدلنے کو کہا۔ وہ افغان تھا' اسے سواروں پر شبہہ ہو گیا۔ جو اتنی تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔

"وہ کہتا ہے کہ ہم نے گھوڑے شاہی اصطبل سے چرائے ہیں" ارسلان نے اس کی بات چپکے سے نور محل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمیں کچھ نہ دے گا۔"

"میرے پاس زیورات ہیں' ان میں سے کچھ اسے دے دو۔"

"واللہ۔ اگر ایک بھی نگینے پر اس کی نگاہ پڑ گئی تو وہ ہمیں لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ علیا حضرت! آپ یہیں ٹھہریں' میں اس سے بات کرتا ہوں"

ارسلان تاریکی میں گم ہو گیا اور اس کے فوراً" بعد نور محل نے زیر میان تلوار کی ضربوں کی آواز سنی جو تڑتڑ پٹھان کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ بھی سنائی دی۔ گھوڑے ہنہنانے لگے۔ ان کی آوازیں سن کر سونے والے جاگ اٹھے اور اوپر برآمدوں میں سے جھانک کر تلخ لہجہ میں پوچھنے لگے کہ ماجرا کیا ہے؟ لیکن اب مار کھانے کے بعد سرائے کا مالک خاموش تھا۔ ارسلان کے بازو ریچھ کی طرح تھے۔ اس نے دو تازہ

دم گھوڑے ان کے حوالے کر دیئے۔ ارسلان نے بڑبڑاتے ہوئے دونوں گھوڑوں کی زین بدلی اور سبک خرام عرب گھوڑا جو دونوں میں اچھا تھا' نور محل کو دے دیا۔

"وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔" ارسلان نے سڑک پر پہنچ کر نور محل کو بتایا "ان کتوں کے آگے ہڈی نہیں پھینکنی چاہئے۔"

رات کے اندھیرے میں ارسلان کے دل سے نور محل کا خوف دور ہو چکا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدم بقدم کوئی عورت نہیں بلکہ ایک دبلا پتلا احدی گھوڑے پر سوار جا رہا ہے لیکن جب آواز کانوں میں آئی' تو وہ مہرو کی تھی۔ اس قسم کی سواری سے اس کے مضبوط اعضاء پر کوئی خراب اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن کوئی ایک گھنٹے بعد اس کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھی کا بھی یہی حال ہو گا۔

"سنئے!" اس نے کہا "ذرا ستا لیں۔ گھوڑوں کو بھی آرام مل جائے گا اور علیا حضرت بھی آرام فرما سکیں گی۔ ابھی آگرہ دور ہے۔"

"کتنی دور؟ کتنے کوس اور سفر کرنا پڑے گا؟"

ارسلان نے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر انگلیوں پر گنتے ہوئے بتایا: "ہم پہاڑوں سے بڑی تیزی کے ساتھ اترے ہیں۔ سانبھر گزر چکا ہے۔ شاہی ہرکارہ یہاں سے بھاگ کر جائے تو ایک صبح چھوڑ کر دوسری صبح آگرہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن علیا حضرت کے لئے یہ ممکن نہ ہو گا اس لئے ہم انشاء اللہ پرسوں دوپہر گزر جانے کے بعد آگرہ پہنچ جائیں گے۔"

"اتنی دور!" نور محل نے بھورے رنگ کے عربی النسل گھوڑے کو راسیں کھینچ کر ٹھہرا لیا۔ اگرچہ ارسلان نے اونچی کاٹھی پر ایک نرم و گداز گدی رکھ دی تھی اور نور محل نے ریشمی پاجامہ پر چرمی برجیس بھی پہن رکھی تھی۔ اسے بھوک اور پیاس کا مطلق احساس نہ تھا۔ البتہ درد کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اسے رات کے وقت کاٹھی پر بیٹھے کئی برس ہو چکے تھے۔

"میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ کھانا ہم دوپہر کو کھائیں گے اور اسی وقت میں تھوڑا سا آرام بھی کر لوں گی۔ البتہ یہاں تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے ہیں۔ تم گھوڑوں کا خیال رکھنا!"

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دوردیہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں قریب ہی ایک خشک ندی کا پاٹ تھا اور اس کے کنارے ایک ٹوٹے پھوٹے مینار کے آثار تھے۔ نورمحل گھوڑے سے ارسلان کے سہارے اتری اور خاردار جھاڑیوں میں دو تین قدم آگے بڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ریشمی پگڑی کا ایک سرا کھول کر دانتوں اور انگلیوں سے پھاڑا اور چونکہ گھوڑے کی سواری کا اسے پرانا تجربہ تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی شیشی میں تیل بھی لائی تھی۔ اس نے پنڈلیوں اور رانوں پر تیل کی مالش کی اور اوپر سے وہ کپڑا باندھ دیا۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ارسلان نے اسے آواز دی۔ وہ جھٹ پٹکا اور صافا سنبھالتی ہوئی گھوڑے کی جانب بڑھی۔ دور سے گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ سنائی دے رہی تھی' جب وہ سڑک پر پہنچی تو بوسیدہ مینار کے قریب' ایک ٹیلے سے مشعل کی روشنی قریب آتی نظر آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تین گھڑسوار نمودار ہوئے۔ ایک باریش اور مہیب صورت راجپوت' ایک ملازم اور ایک نیزہ بردار------ نورمحل کا دل یہ سوچ کر دھک دھک کرنے لگا کہ شاید یہ متعاقبین کا ہراول ہے۔ تاہم ارسلان نے راجپوت سپاہی کی چھاتی پر شاہی نشان والا تھیلا دیکھ لیا تھا۔

"ہرکارے کے لئے سڑک تو اچھی ہے!" اس نے ہنس کر کہا۔

راجپوت نے تنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کیونکہ جرنیلی سڑک پر ان دنوں ڈاکو بھی عام تھے اور اس کے پاس شاہی مراسلہ تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے بڑے رعب سے کہا۔

"ایرانی امیر: خلیل خاں اور اس کا غلام!"

"تم کس کے آدمی ہو؟ اندھیری رات میں مشعل کے بغیر گھوڑے پر کون چڑھتا ہے؟"

نورمحل نے فوراً" جواب دیا۔ "ہم سردار مہابت خاں کے آدمی ہیں جس نے ہمیں شمال کی جانب طلب کیا ہے۔ بے شک ہم اس آفت زدہ علاقے سے بہت اکتا چکے ہیں" تاہم اپنے آقا کے حکم کی فوری تعمیل ہم پر فرض ہے۔ مہابت خاں کاہلوں کو پسند نہیں کرتے!"

ہرکارے کے ماتھے کی شکنیں دور ہو گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ راجپوت جاں باز اپنے جرنیل مہابت خاں سے محبت کرتے تھے اور خود نورمحل کے الفاظ میں بھی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ راجپوت سپاہی نے اپنے پیچھے آنے والوں کو آواز دی۔ گھوڑے

کو ایڑ لگائی اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں نشیب کو پھلانگتا سڑک پر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دور تک نور محل اور ارسلان نے بھی گھوڑے دوڑا کر ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن ارسلان نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کی رفتار کم کر دی اور مزے مزے چلنے لگا۔

"ان کے پاس گھوڑ دوڑ کے گھوڑے ہیں۔ اس لئے وہ ان سے پورا کام لیتے ہیں۔ ہمارے گھوڑے تو چھکڑے میں جوتے جانے کے قابل ہیں۔"

دراصل اس کا گھوڑا لنگڑا کر سڑک کی کنکریوں سے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ نور محل سوچنے لگی: شاہی ہرکارہ کیا پیغام لے کر آگرہ جا رہا ہے؟ کہیں جہانگیر نے انہیں تعاقب کا حکم تو جاری نہیں کیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پکڑے جائیں۔ ادھر ارسلان کا گھوڑا ناکارہ ہو چکا ہے۔ اب تازہ دم گھوڑے کہاں سے آئیں؟ سڑک کے کنارے کہیں کہیں دہقانوں کے جھونپڑے تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے پاس تازہ دم گھوڑے کہاں ہوں گے؟ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار سست کر لی تاکہ ارسلان پیچھے نہ رہ جائے۔ اتنے میں ارسلان کا گھوڑا ٹھوکریں کھاتا، پسینے میں شرابور اس کے قریب آ پہنچا۔

"اف توبہ" ترک نے کہا۔ "یہ تو ہل چلانے کے بھی قابل نہیں رہا۔"

ارسلان کا چابک کھانے کے بعد گھوڑا تھوڑی دیر تک اور دوڑا اور اس کے بعد پھر لنگڑانے لگا۔

"ارسلان! اب انتظار نہیں ہو سکتا تم صبح کو نیا گھوڑا لے کر میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔" اس نے اپنے گھوڑے کو چابک رسید کیا اور قبل اس کے کہ بوڑھا ترک اس کا مدعا پاتا وہ نکل گئی۔ اس نے چیخ کر کہا:

"علیا حضرت! کیا آپ میرا منہ کالا کرائیں گی؟ خدا ہی جانتا ہے کہ راستہ کتنا خطرناک ہے۔ ذرا ٹھہر تو جایئے! میں ساتھ ساتھ بھاگوں گا۔" ارسلان کی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی اور وہ اپنے پیچھے مکمل سکوت یا زین کے چمڑے کی چرچراہٹ چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ بعض اوقات جب عرب گھوڑا اپنے سر کو جھکا دیتا، تو لگام کا آہنی دہانہ اس کے دانتوں سے ٹکرا کر کھڑکھڑا اٹھتا۔ نور محل اس کی ایال تھپتھپاتی اور اس کے کان ملنے کے لئے آگے جھکتی بے شک وہ دبلا پتلا جانور تھا لیکن چال بڑی عمدہ چل رہا تھا۔

وہ تیز رفتار گھوڑا تھا۔ اس کے قدم بڑی مضبوطی سے اٹھتے تھے اور اس کی چال پہلے گھوڑے کے مقابلے میں نور محل کے لئے بڑی آرام دہ تھی۔ اب اسے سڑک بھی ایک

بھورے رنگ کا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی لیکن اس نے پروا نہ کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گھوڑا خود ہی اپنا راستہ تلاش کرے گا ایک دفعہ گھوڑے نے گردن اٹھائی اور اس کارواں کی جانب کان لگا دیئے جو سڑک کے کنارے رات بسر کر رہا تھا۔ نورمحل کی ناک میں اونٹوں اور دھوئیں کی کچھ بدبو سی آئی اور اس نے گزرتے گزرتے ایک چوکیدار کو کھانستے اور تھوکتے دیکھا۔ اس کے بعد سڑک قدرے روشن ہو گئی اور اسے سامنے افق کے پاس درختوں کی قطاریں سی دکھائی دینے لگیں۔

اچانک نورمحل کو ایسا محسوس ہوا جیسے سورج کی گرم گرم شعاعیں اس کے بوجھل پپوٹوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ تازہ ہوا کا ایک جھونکا سامنے سے گرد اڑاتا گزر گیا ہے۔ اس نے حیرت زدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بچپن ہی سے شاہی محل میں رہتی تھی۔ اس لئے آج تک اسے طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک عجیب و غریب دنیا میں آ نکلی ہے۔ جہاں جھونپڑوں کی چھتوں میں سے دھواں نکل رہا ہے اور سڑک کے کنارے رسی سے بندھے ہوئے اونٹوں کی قطاریں دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک لڑکا جو کالی بکریوں کا ریوڑ ہانکے لے جا رہا تھا' ٹھٹک کر اسے گھورنے لگا۔

سڑک پر حسب معمول گہما گہمی ہو گئی تھی۔ نورمحل کو سامنے درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک سفید مکان دکھائی دیا۔ وہ ٹھہر گئی کہ گھوڑا ذرا آرام کر لے اور دن کی گرمی بڑھنے سے پہلے کچھ پانی پی لے۔ اتنے میں خار دار جنگلے سے ایک چیچک رو دہقان باہر نکلا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نورمحل سے پوچھا:

"میں حضور کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"بس دودھ کا ایک پیالہ لے آؤ" اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

دہقان کا خیال تھا کہ گرد و غبار سے اٹا ہوا احدی سوار اس سے چارا مانگے گا اور اسے گالیاں دے گا لیکن جب اس نے شریفانہ گفتگو سنی تو وہ بڑا خوش ہوا اور بھاگ کر گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ لے آیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے گھوڑے سے ذرا ہٹ کر آ کھڑے ہوئے۔ نورمحل نے دودھ پیا۔ وہ اپنے میلے سرخ ہاتھوں کو دیکھ کر حیران ہوئی جن کی انگوٹھیاں وہ اتار آئی تھی۔

"اخاہ! حضور کی انگلیاں بالکل زنانہ معلوم ہوتی ہیں۔ کتنی نازک اور کتنی سبک!" اس نے اپنے میلے کچیلے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ جب اسے خالی پیالہ واپس ملا تو وہ چونک اٹھا

کیونکہ اس کی توقع کے بالکل خلاف اس میں ایک اشرفی پڑی تھی۔

وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے احدی کو آواز دی جو اب گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔

"حضور کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ یہ تو سونا ہے' خالص سونا' تانبے یا چاندی کا سکہ نہیں!" وہ چلایا۔

"تو خدا کا شکر بجا لاؤ۔" نور محل نے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ دہقان دھوپ میں کھڑا حیرت سے اس سوار کو دیکھتا رہا۔ جس نے جان بوجھ کر اسے اشرفی دی اور جس کی ہنسی جنت سے مشابہ تھی۔

جیسے جیسے دن چڑھتا گیا۔ جنت کی حور پر تکان طاری ہونے لگی۔ دھوپ خاصی تیز ہو چکی تھی' نور محل کی اونگھتی ہوئی آنکھوں میں گردوغبار نے ڈیرا جما لیا تھا اور جب بھی گھوڑے کی رفتار میں ذرا سستی آئی وہ خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔ سڑک ایک گردوغبار سے اٹے ہوئے پرشور رستے کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ اونٹوں کا ایک قافلہ چرخ چوں کرتے ہوئے چھکڑوں کے قریب سے گزرتا ہوا غالباً اجمیر کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں کہیں درختوں کا سایہ ہوتا آس پاس کے دیہاتی کھڑے ہو کر ان گھوڑ سواروں کو دیکھتے' جو مغل دربار میں حاضری کے لئے جا رہے تھے۔ نور محل کو ان کی وجہ سے بار بار گھوڑے کا رخ بدلنا پڑتا۔

دوپہر کے وقت نور محل کو ستانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک عبادت گاہ کے سامنے وہ گھوڑے سے اتری' ایک پختہ حوض میں اسے پانی پلایا اور کیلے کے باغ میں لے گئی۔ وہاں دو فقیر اس سے بھیک مانگنے آئے۔ جنہیں اس نے خالی ہاتھ واپس کر دیا۔ اس لئے کہ اس کے پاس اشرفیوں کے سوا کوئی سکہ نہ تھا اور اشرفیاں ظاہر کرنے کا یہ محل نہ تھا۔

اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ کر رسی ڈھیلی چھوڑ دی تاکہ وہ جی بھر کر گھاس چر لے جب گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی اتری' تو وہ خشک گھاس میں کلیلیں کرنے لگا۔ نور محل گھوڑے کے قریب ہی لیٹ گئی۔ اس کے کانوں میں سڑک کا شوروغل اور جھاڑیوں سے آنے والی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔ رفتہ رفتہ نیند اس پر غالب آ گئی اور اسے گردوپیش کا مطلق ہوش نہ رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو عصر کا وقت ہو چکا تھا اور گھوڑا اس کے پاس کھڑا ہنہنا رہا تھا۔

"دوست!" اس نے گھوڑے سے کہا "تم اس سفر میں میرے رفیق راہ ہو۔ کیا تم نے

کسی پردہ دار خاتون کو اس سے پہلے بھی اس حالت میں دیکھا ہے؟"

گھوڑا زور سے ہنہنایا اور نورمحل انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا نہ کرے! زین ڈالتے وقت گھوڑا بدک نہ جائے" نورمحل نے سوچا۔ اس نے زین اٹھا کر بمشکل گھوڑے کی پیٹھ پر رکھی۔ اگر گھوڑا ذرا بھی اکڑ جاتا نورمحل زین کسنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ جب نورمحل نے اس کے منہ میں لگام ڈالی اس وقت بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

"شاباش!" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "دیکھنا' اب لڑکھڑانا نہیں۔ میں پہلے کی طرح اچک کر سوار نہیں ہو سکتی تاہم ذرا تیز تیز قدم اٹھانا۔"

نورمحل گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس کے سامنے ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا اور عقب میں سورج چمک رہا تھا۔ گھوڑا ایک درمیانہ رفتار پر آ کر جم گیا اور کوس ایک ایک کرکے طے ہونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہوا چلنی بند ہو گئی اور پست و بلند کو جھٹ پٹے نے آغوش میں لے لیا۔ سڑک اب ویران پڑی تھی البتہ کہیں کہیں اپلوں کی سرخ آگ چشمک زنی کر رہی تھی۔ نورمحل کو ابھی تک ارسلان کا انتظار تھا۔ لیکن جب وہ نہ پہنچا تو نورمحل مجبور ہو کر ایک مندر کے پاس اتر پڑی۔ پجاریوں نے ماتھے پر راکھ سے "رام" لکھ رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کم از کم وہ جھگڑالو نہ ہوں گے۔ پجاری پہلے تو ایک خوبصورت ایرانی سوار کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے اپنے مہمان کی آؤ بھگت کی اور اسے کھچڑی اور پھل پیش کئے۔ جنہیں نورمحل نے چپ چاپ الگ بیٹھ کر بڑے مزے سے کھایا۔ ہرچند وہ آگرہ پہنچنے کے لئے بے تاب تھی' لیکن آج پہلی دفعہ عام لوگوں میں بیٹھ کر اسے آزادی کا ایک عجیب لطف محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں ہمہ وہ ایک پردہ دار خاتون تھی اور اس کے لئے دشوار تھا کہ وہ مردوں میں' چاہے وہ مندر کے پجاری ہی کیوں نہ ہوں' بیٹھ کر بے تکلفی سے کھائے پیئے۔

ایک اجنبی اسے گھور رہا تھا۔ جس کا جسم مضبوط اور ایک آنکھ غائب تھی۔ گوشت کی ایک بوٹی کھاتے ہوئے اس نے سڑک عبور کی۔ ہندو پجاریوں کی طرف دیکھ کر تھوکا اور گھوڑے کے پاس سے گزرتا ہوا نورمحل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی چادر کے کونے پر چکنائی کے داغ تھے اور اس کے منہ سے لہسن اور گوشت کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ اس نے کولھے سے ہاتھ پونچھے اور بولا۔

"حضور گھوڑا خریدیں گے؟ آپ کے اس لنگڑے اور نعل گھسے ٹٹو سے ہزار درجے بہتر ہو گا۔"

"نور محل نے نفی میں سر ہلایا اور کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ کیونکہ اسے آتے دیکھ کر اس کی بھوک مر گئی تھی۔

"میرے پاس بڑے تیز رفتار گھوڑے ہیں۔" اس نے زور دے کر کہا وہ گھوڑ دوڑ جیت سکتے ہیں اور آپ انہیں آگرہ میں زیادہ قیمت پر بیچ سکتے ہیں۔ چشم نبی کی قسم! دیا کی وجہ سے وہاں گھوڑے دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں۔ آیئے! ایک نظر گھوڑے دیکھ تو لیجیے!"

نور محل نے پھر انکار کر دیا۔ گھوڑوں کا یہ سنڈا مسٹنڈا تاجر خود آگرہ سے آیا ہے۔ پھر وہ سڑک پر کھڑے ہو کر گھورے "نبتا" سستے داموں کیوں فروخت کر رہا ہے؟ نور محل نے سوچا۔

"کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں؟" اس نے یکایک رسمی اخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا اصلی احدی بھی کہیں اس طرح گھاس پر خادم یا شراب کے بغیر بیٹھا کرتے ہیں؟ گھوڑا بتا رہا ہے! کوئی احدی اس پر سوار نہیں۔ تم کس قسم کے نوجوان ہو؟" وہ اسی طرح کی باتیں بناتا نور محل کے قریب آ گیا۔ اس کی ایک آنکھ اسے برابر گھور رہی تھی۔

"ارے تم تو مرد کے بھیس میں عورت ہو۔ مجھے اشرفی دے دو! میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں گا۔"

اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ نور محل کے جسم کو مس کرے۔ وہ تمام اشرفیاں اسے دے کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ خوف ظاہر کرنے کا موقع نہ تھا۔

"تیری قبر پر کتے موتیں!" وہ کرخت آواز میں چلائی اور ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تیرا منہ کالا ہو! اور تیری ڈاڑھی بچ جائے! کیا تیرے دیس میں عورتوں کے ناک نہیں ہے' جو تو غلطی سے مجھے عورت سمجھ رہا ہے۔"

گھوڑوں کا تاجر یہ تیز و طرار کوسنے سنتے ہی بوکھلا اٹھا اور ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا اس سے پہلے کہ وہ کوئی نئی چال سوچے' نور محل نے بے پروائی سے سڑک کے اس طرف دیکھا اور گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے بولی:

"میری رکاب پکڑنا' ممکن ہے میں تمہارا کوئی جانور خرید لوں!"

مغرز شہسواروں کا عام دستور یہی تھا کہ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے' تو اپنے سے کمتر درجے کے آدمی کو حکم دیتے کہ وہ گھوڑے کی رکاب تھامے پچاس قدم ان کے ساتھ آئیں۔ اسی طرح "ناک کٹنے" کا محاورہ بھی پنجاب میں عام تھا۔ گھوڑوں کے تاجر نے بہ غلبت اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن جب نور محل کاٹھی پر بیٹھی تو اس کے شک و شبہ کو ایک بار پھر تقویت ملی اور اس نے جھٹ لگام پکڑنی چاہی لیکن نور محل نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر سڑک پر پہنچ گئی۔

"اری مچھال!" وہ چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا "برجس والی ڈھڈو! شیطان کی خالہ! خدا کرے! تیری قبر گیڈر کھو دیں!"

وہ چلاتا رہا۔ اس کے پاس نہ تو پیچھے کے لئے کوئی گھوڑا تھا' نہ سواری کے لئے اس لئے وہ بک بک کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ تاہم نور محل کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھپ ٹھپ کرتا' اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ اس نے مڑ کے دیکھا تو ایک شخص بازو ہلاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح اچھل رہا تھا جیسے اس رفتار کا عادی نہ ہو۔ نور محل کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور اطمینان کا سانس لیا۔

"بھئی! میں تمہارے پائے کا شہ سوار نہیں ہوں لیکن یہ تو بتاؤ یہ عورت کا قصہ کیا تھا؟"

نور محل نے یاس و نومیدی کی حالت میں سوچا کہ سڑک بھی آنکھوں اور کانوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے جھٹ پٹے کے سبب نووارد اسے اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا اور یوں بھی وہ کوئی بے ضرر راگی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چغے میں سے "دنیا" کا سرا نکلا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

"وہ کتا ڈاکو!" نور محل نے کہا "وہ میرا کیسہ اڑانا چاہتا تھا لیکن ناکام رہا۔"

راگی نے یوں سر ہلایا جیسے وہ بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ دائیں بائیں سر ہلاتا رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں بجو کی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

"ہر طرف بدی پھیل گئی ہے۔ نیکی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔ "آج ہی صبح کا واقعہ ہے جب میں سفر کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ کتنا منحوس شگون تھا وہ! جب میں نے آگرہ کا رخ کیا تھا۔ جہاں لوگ کتوں کی

طرح مر رہے ہیں۔ شیو جی کی سوگند! میری دلی خواہش ہے کہ یہ سڑک آگرہ کے بجائے مجھے کہیں اور لے جائے۔"

"کیا لوگ واقعی بے تحاشا مر رہے ہیں" نور محل نے بے اختیار پوچھا۔

"اتنے کہ لاشیں مسجدوں اور مندروں میں ڈال دی جاتی ہیں۔ سنا ہے یہ بیماری چوہوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اول اول اس کا حملہ بلیوں پر ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ خوفناک مرض----- دیوتاؤں نے ایسی کڑی سزا پہلے کبھی نہ دی تھی----- انسانوں میں پھیل جاتا ہے۔ بھگوان شما کرے! یہ بیماری ایسی نامراد ہے کہ کسی کو نہیں چھوڑتی۔ بلکہ بلوان اور خوبصورت لوگ پہلے جاتے ہیں۔ ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ پھر خون کی قے آنے لگی ہے اور اس کے بعد ایک گلٹی....."

"چپ رہو------" نور محل اس کی باتوں کی تاب نہ لا سکی۔

"اس کا بس ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ گھر کا مالک کسی مندر میں چار تولے سونے کی گئوماتا کی مورتی چڑھائے' اس کا کوہان تانبے کا اور سینگ چاندی کے ہونے چاہئیں۔ ساتھ ہی گئوماتا کے دودھ کی ایک گڑوی بھی ضروری ہے۔ کھانے میں دودھ دہی اور گئوماتا کے پوتر گوبر کے سوا ہر چیز سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہی بہرے پن کا علاج ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بہن کو قتل کر دے تو دیوتا اس کے کانوں کو بہرا کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں کسی درباری یا رقاص' سگ بان یا مے فروش' جراح یا خواجہ سرا کے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھانی چاہئے۔ لیکن اوہ! تم تو مسلمان ہو۔ تمہارا تو علاج بھی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ وبا آگرہ کے کس علاقے میں پھیلی ہوئی ہے؟" نور محل نے پوچھا۔

"دریا کی طرف! اور سچ تو یہ ہے کہ راجدھانی کے پاپ اتنے بڑھ گئے تھے کہ یہ بلا آنی ہی چاہئے تھی!"

بندو نے ایک گہری آہ بھرتے ہوئے کہا' ایک تو دربار میں لوبھ کا پاپ پیدا ہوا' جس سے دھن دکھاوے کا لالچ بڑھ گیا۔ دوسرے راگ نے ڈیرے ڈالے جس سے جسمانی خواہشوں کی اندھا دھند پوجا ہونے لگی۔ تیسرے مدھ نے چھاؤنی چھائی' جس سے ہر طرف شراب یا غرور کا نشہ چھا گیا۔ اب دیوتاؤں نے ان پاپوں کی سزا دی ہے' اور مغرور مسلمان' سرائے کی مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔

"تمہاری اس کائیں کائیں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سچ مچ قبرستان کے کوے ہو!"

نور محل نے تنگ آ کر گھوڑے کو لگام کا سرا رسید کیا اور نحوست کے اس پیامی سے جان چھڑانے کے لئے آگے بڑھ گئی۔

"ٹھہرو' میں تمہیں ایک منتر بتاتا ہوں' تم بیماری سے محفوظ رہو گے۔" لیکن نور محل نے ایک نہ سنی اور رات کی تاریکی میں آگے بڑھ گئی۔ اس کے دماغ پر ایک ہی خیال مستولی تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد لاڈلی کے پاس پہنچ جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اسے ستانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے گھوڑا روکا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی شخص سڑک پر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن اس کا ضمیر گواہی دے رہا تھا کہ یہ ہندو راگی اس موٹے ڈاکو سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

گھوڑا آہستہ آہستہ لنگڑاتا جا رہا تھا اور نور محل بھی تھکن سے اونگھ رہی تھی کہ اتنے میں آفتاب نے افق پر سنہری کمندیں پھینکیں اور آناً فاناً اس کی شعاعوں سے سامنے کی سرخ پہاڑی صاف نظر آنے لگی۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک نیم برباد شہر کے آثار بکھرے پڑے تھے اور اس کے دامن میں سرکنڈوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی جھیل انگڑائیاں لے رہی تھی۔ یہ شہر کسی جذباتی رو میں شہنشاہ اکبر نے بسایا تھا لیکن اب وہ اجڑ چکا تھا نور محل باہر ہی باہر فصیل کے گرد ہوتی ہوئی سیدھی آگرہ جانے والی سڑک پر روانہ ہو گئی۔

اب منزل قریب آ رہی تھی۔ اس نے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنا چھوڑ دیا اور ساری تیزی عربی گھوڑے پر آزمانے لگی۔ گھوڑا شور و شغب اور گرد و غبار میں سے ہوتا ہوا اس ہجوم کے قریب سے گزرا جو آگرہ چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔ جب گھوڑے کو دریا نظر آیا تو اس نے گردن اٹھائی اور دلکی چال چلتا ہوا شہر کے دروازے میں داخل ہوا اور بازار سے گزرتا ہوا اس بیرونی محلے میں پہنچ گیا جس میں عائشہ کا مکان تھا۔ نور محل نے اطمینان کا سانس لینے کے بعد باگیں کھینچیں اور گھوڑا ٹھہر گیا۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا اور آیا کے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

اتنے میں وہ دونوں گھڑسوار سوار بھی جو اس کا تعاقب کر رہے تھے' گلی کوچوں سے ہوتے ہوئے آ پہنچے اور نور محل کے گھوڑے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ادھر ایک تیسرا سوار اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔ نور محل نے اسے جھٹ پہچان لیا۔ وہ وہی ہندو راگی تھا جو اسے راستے میں ملا تھا۔ وہ ایک نئے گھوڑے پر سوار تھا' اور جب اس نے جھک کر نور محل کو سلام کیا تو اس کی بے چین آنکھوں میں شرارت جھانک رہی تھی۔

"درمملکت! عقل مند بنو اور ہمارے ساتھ چلی آؤ۔ مجھے موٹے ڈاکو کی طرح دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔"

نور محل نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی تو دو مرہٹے گھوڑ سوار اس کے پاس کھڑے تھے۔ وہ خاصے اکھڑ اور گستاخ معلوم ہوتے تھے۔ یقیناً وہ جہاں گیر کے فرستادہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے جسم پر کوئی درباری نشان نہ تھا۔

"خاتون! ہم بڑی دیر تک تمہارا انتظار کرتے رہے" راگی بولا۔ "ہم فتح پوری دروازے پر کھڑے رہے۔ راہوت! ان کے گھوڑے کی باگ سنبھال لو!"

لیکن دونوں مرہٹے اچانک کسی جذبے کے تحت میان سے تلواریں نکال کر شور مچاتے ہوئے پیچھے مڑے۔ اتنے میں پائیں باغ سے ارسلان ڈھال لئے نمودار ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک لمبے قد کا پٹھان تھا جسے نور محل نے پہچان لیا۔ وہ آگرہ کے قلعہ میں نور محل کے محافظ دستے کا سپاہی تھا۔

ارسلان کے منہ سے غصے کے مارے آواز بھی نہ نکلی اور جو سوار سب سے پہلے اس کے سامنے آیا' اسی پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مدمقابل کی دو دھاری تلوار کو ڈھال پر روکا اور اپنی خمدار شمشیر سے اس زور کا حملہ کیا کہ مرہٹے کی زرہ بکتر چھاتی پر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ تیوراکر زمین پر گر پڑا۔ اسی دھکاپیل میں دوسرا سوار نور محل کے گھوڑے سے جا ٹکرایا جس سے گردوغبار کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ افغان سپاہی نے نیزہ تاک کر دوسرے مرہٹہ سوار پر دے مارا جس کے زخم کی تاب نہ لا کر وہ چیخ اٹھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گردوغبار صاف ہوا تو نور محل نے دیکھا کہ ایک زخمی اٹھنے میں کوشش کرتے کرتے پھر گر پڑا ہے دوسرا مرہٹہ سوار گھوڑے کی پیٹھ پر بھاگا چلا جا رہا تھا اور ہندوراگی کہیں روپوش ہو چکا تھا۔

ارسلان نے قریب المرگ مرہٹہ سوار کی زرہ بکتر سے تلوار پونچھی اور بولا :۔

"الحمد للہ' آپ یہاں ہیں۔ یہ کتے کون تھے؟"

اس کے جواب میں وہ محض سرہلا سکی۔ افغان سپاہی نے اسے سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا۔

جب نور محل عائشہ کے مکان میں داخل ہوئی تو وہ اپنے گھر والوں کا ماتم کر رہی تھی۔ لاڈلی دوڑ کر اس کے پاس آئی اور اسے سلام کیا۔

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد نور محل کے گھرانے کا ایک خواجہ سرا آ پہنچا۔ وہ افغان سپاہی کے کہنے پر پالکی اور کہار لایا تھا۔ جب نور محل پالکی میں بیٹھی تو اس نے ایک بار پھر اپنے تئیں پردے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ کہار آگرہ کے شاہی قلعے کی جانب دوڑنے لگے۔ ارسلان بھورے گھوڑے پر سوار ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ لاڈلی کہنی پر سر ٹیکے بڑی بڑی آنکھوں سے ماں کے چہرے کو گھور رہی تھی جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" لڑکی نے معصومیت سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" نور محل نے مسکرا کر کہا "مجھے کچھ پتا نہیں' جان من! اب تم میرے پاس رہو گی۔ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتیں۔"

نور محل تھک کر چور ہو چکی تھی۔ وہ دن رات کے بیش تر حصے میں سوتی رہی کبھی آنکھ کھلتی تو لاڈلی سے باتیں کرنے لگتی' جو بالائی منزل کی خواب گاہ سے آرائشی سامان سے کھیل رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لاڈلی کو دیکھتے دیکھتے کبھی نہ تھکے گی!

قلعہ آگرہ کے شاہی محل میں سکوت طاری تھا کیوں کہ اکثر لوگ اجمیر میں تھے۔ صدر دروازے کے پہرے دار شہر کی عورتوں کو قلعے میں داخل ہونے سے روکتے رہے' تاکہ وبا اندر نہ پھیل جائے۔ کبھی کبھی دور سے جنازے لے جانے والوں کے "تشہد" کی آوازیں آتی تھیں یا دریا کے کنارے مرگھٹ سے دھوئیں اٹھتے دکھائی دیتے تھے۔

اگلی صبح خواجہ سرا عنبر اجمیر سے آگرہ پہنچا۔ اس کے سیاہ چہرے پر اضطراب کی کیفیت نمایاں تھی۔ اور بدن کی کھال یوں معلوم ہوتی جیسے جھلس چکی ہے۔ اس سے پہلے وفادار حبشی خواجہ سرا کو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر کسی ایسی خاتون کی تلاش میں نکلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جو اس کی تحویل میں ہو۔ وہ اپنے ہمراہ جہانگیر کے حکم سے گھوڑسواروں کا ایک دستہ اور نجی خادم بھی لایا تھا۔ شہنشاہ نے نور محل کی اچانک گمشدگی کے بارے میں برسرعام کوئی اعلان نہ کیا تھا اور شاہی حرم میں بھی یہی مشہور تھا کہ وہ عنبر کے ہمراہ آگرہ گئی ہے۔

"اور بادشاہ سلامت؟"

"جہاں پناہ کی توجہ ابھی تک رانا زادے پر مرکوز ہے۔ وہ خوب سوتے ہیں۔ انہیں ایک نیا ساتھی مل گیا ہے۔ جو کالے پانی کو عبور کر کے آیا ہے۔ وہ پتلون' کوٹ اور ہیٹ پہنتا ہے اور لوگ اسے انگلینڈ کہتے ہیں!"

عنبر نے بتایا جہانگیر چاہتا ہے کہ جب تک آگرہ سے نقل مکان جاری اور راستہ بند

ہے نور محل قلعہ آگرہ ہی میں رہے لیکن کئی دن گزر گئے' اجمیر سے کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ بوڑھا خواجہ سرا گھبرانے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا یہ تاخیر معنی خیز ہے۔ اب اس کی خیر نہیں۔ ادھر جب اسے معلوم ہوا کہ عائشہ کے مکان کے سامنے دست بدست لڑائی بھی ہوئی ہے تو اس نے اپنے بال نوچ ڈالے اور بے اختیار سجدے میں گر پڑا۔ اس کے بعد وہ اصطبل میں ارسلان سے مزید حالات دریافت کرنے لگا۔

لیکن بوڑھا ترک پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ دراصل وہ خود دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اب کے اس کی بھی خیر نہیں! اس کی تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے!

"واللہ! اس کے سوا ہو گا بھی کیا؟ لیکن وہ کتے بھی جو علیا حضرت کو گزند پہنچانی چاہتے تھے۔ مدتوں اپنی چوٹ سینکتے رہیں گے۔"

ان تین میں سے جو دو آدمی زندہ بچ گئے تھے ان کے متعلق پھر کوئی بات سننے میں نہ آئی۔ نور محل نے سوچا کہ راگی کوئی جاسوس ہو گا۔ جسے جرنیلی سڑک پر اس کا تعاقب کرنے کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ یقیناً عائشہ کے دروازے پر اس نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ اس کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مریم کے قاتل کا غلام ہو اور اسے گرفتار کرنے میں ناکامی کے بعد اس کے آقا یا بیگم نے افشائے راز کے خوف سے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔

لیکن اسے بھیجا کس نے تھا؟ بہرحال وہ شاہی حرم کے قریبی حلقوں سے تعلق رکھتا ہو گا ورنہ اس کے آگرہ جانے کی اطلاع اسے کس طرح ملی؟ شاہی حرم کے اعلیٰ طبقے میں ضرور اس کا کوئی ذہین دشمن موجود ہے' جو اسے بدنام کر کے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

نور محل آگرہ کی حرم سرا میں زیادہ دن تنہا نہ رہ سکی۔ پہرے داروں کے باوجود بے شمار عورتیں دیوان عام میں آ کر بادشاہ بیگم کو اپنا اپنا دکھڑا سناتیں۔ ان میں کئی لڑکیاں ایسی تھیں جن کے ماں باپ طاعون کا شکار ہو گئے تھے اور اب وہ بے سہارا رہ گئی تھیں۔ اسی طرح کئی بیویاں آ کر بتاتیں کہ ان کے گاؤں میں جاگیردار باہم لڑ رہے ہیں اس لئے انہیں فتنہ و فساد سے بچایا جائے۔

بادشاہ بیگم کے خاص محل میں ایک اونچی ذات کی ہندو لڑکی پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ نور محل اس سے باتیں کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔ لڑکی نے شاہی آداب کے مطابق اس کی قدم بوسی نہ کی۔ کیونکہ اگر وہ اس کے جسم کو چھو لیتی' تو اس کے رشتہ دار اسے "اچھوت" قرار دے کر گھر سے نکال دیتے تاہم اس کی خوف زدہ آنکھوں کی ایک خاموش

کشش نے بادشاہ بیگم کو متاثر کر لیا۔

لڑکی نے اپنا نام جودھا بائی بتایا وہ ابھی بارہ برس کی تھی۔ اس کا شوہر ایک بوڑھا راجپوت تھا جو دو دن پہلے طاعون کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے رشتہ داروں کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پتی کے احترام میں ستی ہو جائے لیکن وہ زندہ جلنے سے ڈرتی تھی۔ اس نے روتے روتے یہ داستان نور محل کو سنائی۔ اس کے علاوہ اسے ایک نیچ ذات کے نوجوان لڑکے سے محبت تھی نوجوان نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ بیوہ ہو جائے گی تو وہ اسے لے جائے گا اور اپنی بیوی بنا لے گا۔ وہ جانتی تھی کہ لوگ اسے اچھوت کہہ کر باہر نکال دیں گے تاہم وہ اچھوت بننے سے اتنا نہ ڈرتی تھی جتنا آگ کے شعلوں سے۔ وہ اپنے بوڑھے پتی کی چتا پر کسی حالت میں بھی جانے کو تیار نہ تھی۔

"میں آگ کے قریب بھی جانا نہیں چاہتی۔ شعلوں کی گرمی میری رنگت جھلس دے گی۔" اس نے کہا "اور اس کے بعد وہ مجھے لینے بھی نہ آئے گا اور میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا کیونکہ وہ میرے شوہر کے رشتہ داروں اور برہمنوں سے بڑا ڈرتا ہے۔"

جودھا بائی نے بتایا کہ وہ گھر سے بھاگ آئی ہے اور اب شاہی محل میں پناہ کی خواستگار ہے کیونکہ یہاں سے تو برہمن بھی اسے اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ تاہم جب اس کے شوہر کی لاش جلا دی جائے گی تو اس کی کوئی عزت نہ رہے گی بلکہ وہ ہندو نوجوان بھی اس کا خیال چھوڑ دے گا جو اس سے چھپ کر محبت کا اظہار کرتا رہا ہے۔ یہ ساری مصیبت اس پر اس لئے پڑی کہ وہ بزدل تھی۔

"چھوٹا کمرہ صاف کرو۔" نور محل نے خواصوں کو حکم دیا "اور جودھا بائی کو اس کی مرضی کا کھانا کھلاؤ!"

لڑکی نے شکریے کے طور پر سر ہلایا وہ کھانا کھانے پر تیار نہ تھی۔

"اچھا جودھا بائی! اب کریا کرم کے بعد بات چیت ہو گئی" نور محل نے بڑے پیار سے کہا "یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔"

برہمنوں کے رسم و رواج میں دخل دینا خطرے سے خالی نہ تھا تاہم اسے لڑکی کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ترس آ گیا تھا۔

اگلے دن نور محل کو یکایک جودھا بائی کا خیال آیا لیکن جب اس نے آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ شاہی حرم سے کل ہی چلی گئی تھی۔ چند بوڑھی عورتیں، جو اس کی رشتہ دار معلوم

ہوتی تھیں' اس سے ملنے آئیں اور اسے بہلا پھسلا کر لے گئیں۔ جودھا بائی نے جاتے ہوئے خواصوں سے کوئی بات نہ کی۔

نور محل نے سوچا کہ یہ واقعہ "ستی" کی رسم ادا ہونے سے دو تین گھنٹے قبل ہی ہوا ہو گا۔ اس نے عنبر کو بھیجا کہ فوراً" جا کر جودھا بائی کی خبر لائے۔ چند گھنٹے کے بعد اسے متوقع خبر مل گئی۔

اسے بتایا گیا کہ جب برہمنوں نے چتا کو آگ دکھائی تو لڑکی اس کے اوپر کھڑی تھی۔ اس نے زیورات اتار کر ارد گرد کھڑی ہوئی عورتوں میں بانٹ دیئے۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بھنگ پلا دی گئی ہے۔ اسے بار بار سہارا دینا پڑتا تھا۔ وہ کبھی بھجن پڑھتی کبھی رونے لگتی۔ جب دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے آپ کو شعلوں کے حوالے نہیں کر سکتی۔ تو برہمنوں نے ان ڈنڈوں سے اسے دھکیلنا شروع کر دیا جن سے وہ آگ کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ جودھا بائی تیورا کر چتا سے باہر گرنے لگی لیکن ایک اور ڈنڈے نے اسے شعلوں میں دھکیل دیا۔ اس کے منہ سے صرف ایک چیخ نکلی۔

جودھا بائی کو بھی کسی نادیدہ طاقت نے نور محل کی حفاظت سے اسی طرح چھین لیا تھا جس طرح مریم کو!

"تقدیر میں یہی لکھا تھا" عنبر نے کہا "اعلیٰ حضرت بھی اسے نہ روک سکتے!" عنبر کو خفیہ طور پر ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ بوڑھے کو یقین تھا کہ پردہ اٹھا دینے کے بعد نور محل کے حوصلے غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں اور وہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ اب بھی جب وہ عنبر کی زبان سے جودھا بائی کی داستان سن رہی تھی تو اس کے چہرے پر تلخی کی تاریکی پھیل گئی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے------!

"کیا ہم پر پہلے ہی خاصی مصیبتوں کا پہاڑ نہیں ٹوٹ چکا؟"

عنبر نے اپنے ایک ایرانی ساتھی ہوشنگ سے شکوہ کرتے ہوئے کہا' جو ملکہ کا ایسا ہی وفادار تھا' جیسے کتا اپنے مالک کا۔

"ہم بھی ایک دو مہینے اور کھا پی لیں۔ اس کے بعد ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو دوسروں کا ہو چکا ہے اور کیا عجب ہے کہ خنجر کی انی یا تلوار کی نوک ہمارے جسم کے پار ہو جائے! کاش وہ پردہ نہ اٹھاتی۔"

ہوشنگ نے گلے میں پڑی ہوئی مالا کے منکوں کو انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا "ہاں اگر ایسا ہوتا تو کیا ہی بات تھی؟ لیکن جب تک جہانگیر اس سے محبت کرتا ہے کوئی دوسرا اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ پھر اس کی جگہ لینے والا بھی کون ہے؟ رہی پرتھوی تو وہ افیون کھلانے اور نفسانی خواہشات پوری کرنے کے سوا بادشاہ کی کیا خدمت کرتی ہے۔ ہندو خاتون کی طبیعت کا رنگ اصل ایک ہے لیکن ہماری بادشاہ بیگم" ------ وہ کچھ دیر تک فقرہ مکمل کرنے کے لئے الفاظ تلاش کرتا رہا---- "ہماری بادشاہ بیگم کی طبیعت کے کئی رنگ ہیں۔ وہ ہر شخص سے مختلف انداز میں پیش آتی ہیں۔"

"ہاں لیکن یہ انداز ضرورت سے زیادہ ہیں۔" عنبر نے کہا "پردے کے پیچھے سے حکومت کرنا بے شک جائز اور ایک اچھی بات ہے لیکن قانون توڑنا تو ٹھیک نہیں۔ لوگ اس کے خلاف ہو جائیں گے! تمہارے الفاظ تو اس پانی کی مثال ہیں' جو ریگ زار میں جذب ہو جائے۔ ارسلان نے آج کل سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے!"

خوش عقیدہ مسلمان سفید کپڑے اس وقت پہنا کرتے تھے جب انہیں کسی خطرے کا سامنا ہو۔ تاکہ موت آئے' تو انہیں مناسب لباس میں پائے۔

ہوشنگ مسکرایا "کیا ہماری بادشاہ بیگم کئی سال سے سفید کپڑے نہیں پہن رہیں"

"الفاظ!" عنبر نے ناک بھوں چڑھائی "الفاظ کیا ہوتے ہیں؟" وہ ابھی تک ہوشنگ کے طنز میں الجھا ہوا تھا۔

وہ دونوں اپنے شکوک و شبہات کے باجود نور محل کو پردے میں بحفاظت رکھنے کے ذمہ دار تھے لیکن ان کے لئے نور محل کو پابند بنانا اتنا ہی دشوار تھا جتنا بند ٹوٹ جانے کے بعد سیلاب کو روکنا۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ بڑی بے تابی سے نور محل کے آئندہ طرز عمل کا انتظار کر رہے تھے اور دل ہی دل میں متوقع تھے کہ وہ جہانگیر کے حکم سے انحراف کرتے ہوئے ان کے ساتھ اجمیر نہ جائے گی۔ لیکن زیادہ دیر تک دور رہنا بھی تو خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر شہنشاہ کی محبت کے جذبات سرد ہو گئے تو؟ پھر نور محل کے دشمن بھی تو جہاں گیر کے کان بھرتے رہتے تھے۔

ہفتوں پر ہفتے گزر گئے۔ نور محل نے نہ تو خط لکھا' نہ کوئی تحفہ بھیجا' البتہ اس نے قلعے کے اندر ہی مصروفیات میں اضافہ کر لیا۔ اس کے پاس بے شمار عورتیں التجائیں لے آنے لگیں جو مصائب کی چکی میں اس بری طرح پس رہی تھیں کہ کوئی انسانی طاقت ان کی مدد

گیری نہ کر سکتی تھی۔ بعض اوقات وہ خواصوں اور مغلانیوں میں جا بیٹھتی اور دیکھتی کہ سینے پرونے اور کاڑھنے بننے کے کام میں انہوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ رات کے وقت وہ بالا خانے پر جا کر مرمریں جھلملیوں کے پاس بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں تاروں بھرے آسمان کو تکتی اور تنہا گنگناتی رہتی۔

ہوشنگ جو اس قسم کی خواتین کی طبیعت سے خوب واقف تھا' جانتا تھا کہ نور محل خوش ہے۔ اس نے مبہم طور پر اس کی وجہ یہ سوچی کہ نور محل کو مدت کے بعد یہ موقع ملا ہے کہ وہ جہاں گیر کے جذباتی تقاضوں سے آسودہ ہو کر سانس لے لیکن ہوشنگ نے لاڈلی کو فراموش کر دیا تھا۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جگت سنگھ کی بیٹی اس کے دروازے پر ایک التجا لے کر حاضر ہوئی۔

جگت سنگھ کی بیٹی ایک زمانے میں بادشاہ کی چھوٹی بیگم رہی تھی لیکن حرم میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ جہانگیر نے اس سے قریباً" بارہ برس پہلے نکاح کیا تھا۔ تاکہ ایک بہت بڑے ہندو راجہ سے اس کا قریبی رشتہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہندو حرم کی سربراہ مقرر ہوئی لیکن اسے اپنے اونچے گھرانے پر اتنا فخر تھا کہ اس نے کبھی نور محل یا پرتھوی سے ملنا گوارا نہ کیا۔ اب جو وہ نور محل کے پاس آئی' تو اس کی آنکھوں میں حقیقی آنسو تھے اور اس کے رنج و غم میں تصنع اور بناوٹ کا کوئی دخل نہ تھا۔

"میرے سرتاج نے"------ غم کی اس شدت میں بھی اس نے جہاں گیر کو نور محل کا شوہر کہنا گوارا نہ کیا------شہزادہ خسرو کو ہتھیار ڈالنے کی اجازت دے دی ہے۔"

نور محل نے بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔ خسرو' جہانگیر کا پہلوٹی کا بیٹا تھا جو ایک راجپوت رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس نے راجپوتوں کی شہ پر اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ یہ قریب قریب اس وقت کی بات ہے کہ جہانگیر نے ابھی پورے اطمینان سے سلطنت کی باگ ڈور نہ سنبھالی تھی۔ اس کے بعد خسرو کا تعلق اس سازش سے بھی ظاہر ہو گیا جو جہانگیر کو زہر دینے کے لئے کی گئی تھی۔ اس پر شہنشاہ کے حکم سے اس کی آنکھوں میں گرم گرم سلائیاں پھیر دی گئیں اور وہ اندھا ہو گیا' لیکن شہزادہ عوام میں بے حد مقبول تھا۔ گرفتاری اور بصارت سے محروم ہونے کے بعد لوگ پہلے سے

بھی زیادہ اس کا احترام کرنے لگے۔ جب وہ راجپوت محافظ دستے کی جلو میں' گھوڑے یا ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتا' تو عوام پروانہ وار اس کے گرد ہو جاتے کہا جاتا ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد اس کی ایک آنکھ میں روشنی آ گئی تھی۔ لیکن کسی حد تک اور اب اس کا نام جہانگیر کے جانشینوں میں سرفہرست آنے لگا تھا۔ وہ بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا اور عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس کے علاوہ دربار کے جو ممتاز امراء خرم کے خلاف تھے' وہ اس کی پشت پناہی کر رہے تھے' اس لئے عجب نہیں کہ وہ بھی جہانگیر کی جانشینی کا دعویدار تھا' ادھر خرم نے راجپوتوں پر زبردست فتح پائی تھی اور بادشاہ بھی اس سے بے حد محبت کرتا تھا' اس لئے عام خیال یہی تھا کہ جہانگیر کا جانشین وہ ہو گا۔

"کس کے سامنے ہتھیار ڈالے؟" نور محل نے پوچھا۔

"اپنے بھائی شہزادہ خرم کے سامنے!"

بظاہر یہ بات ناقابل یقین تھی۔ یہ سچ ہے کہ خرم اور خسرو میں کوئی ذاتی اختلاف نہ تھا لیکن ان دونوں کے درمیان تاج و تخت کی وراثت کا سوال حائل تھا اور بڑا لڑکا اس معاملے میں بے بس نظر آتا تھا۔

"یہ ہوا کیسے؟"

"ہتھیار ابھی نہیں ڈالے تو شاہی احکام ہی صادر ہوئے ہیں۔"

ہندو خاتون نے فخر سے سر اٹھایا۔ "آپ جانتی ہیں کہ شہزادہ خسرو کو رائے سنگھ ڈھلن کی سرپرستی حاصل ہے جو چار ہزاری کے منصب پر فائز ہے۔ جب اسے شاہی فرمان پہنچا تو اس نے کہا کہ شہزادے کو شہنشاہ نے میری تحویل میں دیا تھا۔ میں اور میرے چار ہزار بہادر مرجانا پسند کریں گے لیکن ہم شہزادے کو کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتے۔"

"شاہی فرمان کو لایا تھا؟"

"ایک مسلح دستہ شہزادہ خرم کے خدام اور آپ کے والد غیاث بیگ!"

"پھر کیا ہوا؟ نور محل نے چہرے سے مطلق یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اپنے باپ کا نام سن کر چونک اٹھی ہے۔

"پھر وہ چلے گئے ظاہر کہ شہزادہ خرم کے پاس اجمیر گئے ہوں گے تاکہ رائے سنگھ ڈھلن کے نام میرے سرتاج کا تحریری حکم لا سکیں۔"

نور محل کے لئے اتنی معلومات کافی تھیں۔ تاہم وہ اس انتظار میں رہی کہ شاید ہندو

خاتوں کچھ اور کہے۔ زردرو عورت نے جس کے جسم پر زیور کے نام صاف سیاہ موتیوں کا ایک ہار تھا' مرے ہوئے دل سے بتایا کہ حرم میں خسرو کی تمام بہنیں اور رشتہ دار غم سے نڈھال ہیں۔ وہ موت کی آندھی میں اپنی خاک بھی اڑانے کو تیار ہیں۔ انہیں کی منت و زاری سے متاثر ہو کر وہ ملکہ نور محل کے پاس آئی ہے تاکہ وہ خسرو کی جان بخشی کرا دے لیکن ہندو خاتون یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ نور محل نے درخواست کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "جگت سنگھ کی صاحبزادی کی آمد سے میری عزت افزائی ہوئی ہے۔"

جب وہ چلی گئی تو نور محل نے باپ کو بلایا۔ اسے شاہی حرم میں آنے کی اجازت تھی لیکن وہ چونکہ بے حد مصروف رہتا تھا اس لئے شاذ ہی آتا تھا۔ اس روز وہ شام کے وقت شاہی حرم میں وارد ہوا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی' کمر خمیدہ ہو چکی تھی تاہم پر تکلف لباس میں وہ اب بھی چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ اس کی پگڑی میں ایک بڑا سا نیلم آویزاں تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کے سلام کا جواب دیا اور اس کی نگاہیں ارد گرد کے نقرئی اور طلائی سامان کا جائزہ لینے لگیں۔ اسے ہیرے جواہرات سے خاص ذوق تھا' اور مال و زر کے صندوقچے تو گویا اس کی کمزوری تھے'۔

"تمہاری صحت مہر....."

لیکن نور محل بے صبری پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے والد کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ آپ نے خرم کے اس مطالبے کی تائید کی ہے کہ خسرو کو اس کے حوالے کر دیا جائے؟"

"یہ سچ ہے!" بوڑھے ایرانی نے بھویں تانتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو ہر حالت میں تمہارے سرتاج اور اپنے شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔" "خواہ یہ حکم آدھی رات کے بعد ہی کیوں نہ دیا جائے؟"

اگرچہ یہ نور محل کا قیاس ہی تھا تاہم وہ جانتی تھی کہ جہانگیر اس وقت مے و مینا سے شغل کر رہا ہو گا اور اس نے ایک ایسے فرمان پر دستخط کر دیئے ہوں گے جسے وہ دن کے وقت مسترد کر سکتا تھا۔ غیاث بیگ اپنے ہاتھ کی ابھری ہوئی نیلی رگیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اب تک اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نور محل کو بے خبر تو رکھا جا سکتا ہے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے وہ خاموش رہا۔

"ابا جان! سب سے پہلے اس کا خیال کس کو آیا؟ آپ کو!" اس نے جذباتی انداز میں

اپنے سر کو جنبش دی۔ "خواہش تو خرم کی تھی لیکن بیٹی! تمہارا اس سے کیا تعلق؟"

"میرا نہ سہی۔ ان لوگوں کا تو ضرور ہے جو نابینا شہزادے سے محبت کرتے ہیں۔ اسے خرم کے ہاتھ میں دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

غیاث بیگ نے اس کا جواب بڑی ملائمت سے دیا۔ اس کی دلکش آواز نے جیسے فقروں میں نغمہ بھر دیا ہو۔ اس نے کہا۔ "خرم کے پیش نظر شاہی وقار کے سوا کچھ نہیں وہ اپنے باپ اور اکبر کا وفادار ہے وہ عنقریب ایک لشکر لے کر جنوبی ہند میں جانے والا ہے۔ خسرو کے ہوا خواہ اس کے راستے میں کانٹے بو رہے ہیں وہ بغاوت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ اگر خسرو، خرم کے حوالے کر دیا جائے تو مصالحت خود بخود ہو جائے گی اور خسرو کے خرم کی پناہ میں آ جانے کے بعد نابینا شہزادہ خرم کے آدمیوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

"باایں ہمہ" نور محل نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"یہ غلط ہے!"

"لیکن ناگزیر ہے۔"

"اتنا ناگزیر کہ میرے سرتاج سے اس وقت دستخط کرائے گئے جب وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔"

غیاث بیگ کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ بادشاہ کا وفادار ملازم تھا۔ اس کا ایمان تھا------ رشوت کا سوال ذاتی ہے------ کہ جہانگیر ظل اللہ ہے۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے مہرو؟"

وہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ خسرو کی بظاہر معصومانہ معزولی کے پس پردہ آخر کون سی سازش کارفرما ہے؟ اس کی فطرت نے اسے متنبہ کیا تھا کہ جہانگیر کی بہتری اسی میں ہے کہ اس کے دونوں بیٹے تاج و تخت کے دعویدار رہیں۔ اس کی منطق اس سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

"بس اسے! عجوبہ پسندی کہہ لیجئے" اس نے جواب دیا۔ "عقل مندوں نے ٹھیک کہا ہے۔ بیٹی! کہ گندم خود لے لو اور بھس کٹائی کرنے والوں کے لئے چھوڑ دو۔ اب تک تو تم نے سلطنت کے کاموں میں دخل نہیں دیا۔ عورتوں کو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔"

نور محل نے بے خیالی میں سر ہلایا "اگر آپ تنہا ہوتے تو کیا اس حکم نامے پر دستخط

کراتے؟"

غیاث بیگ خاموش بیٹھا سوچتا رہا حتی کہ ایک حقیقی تشویش اسے لاحق ہوئی۔ "تمہیں اپنے سرتاج کا محل چھوڑے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ کیا تم واپس نہ جاؤ گی؟"

"کیا یہ آپ کی خواہش ہے ابا جان!"

"کس کی خواہش نہیں۔"

نورمحل نے سیاہ زلفوں کی اوٹ سے اپنے باپ کے چہرے کا جائزہ لیا اور کہا "آگرہ میں کتنا سکون ہے۔ کاش میرے مقبرے میں بھی ایسا ہی سکون ہو!"

دیوان غیاث بیگ کے جسم میں ایک نامعلوم سی جھرجھری پیدا ہوئی جس پر اس نے عقل سلیم کے زور سے قابو پا لیا۔

"اس طاعون کے گھر میں تم بھی محفوظ نہیں لیکن تمہارے حسن کو مقبرے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جہانگیر بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔ اس نے تمہاری طلبی کے پیغامات بھیجے ہیں"

"پیغامات؟ کب؟"

"کم از کم دو پیغام! کب کا مجھے پتا نہیں۔ شاید تمہیں پتا ہو!"

"مجھے تو کوئی پیغام نہیں ملا۔"

"تو پھر فوراً" اجمیر پہنچو۔ مصیبت ٹالنے کے لئے اپنے سرتاج سے معافی مانگو۔"

اچانک اس نے سر اوپر اٹھایا" کیوں نہیں؟ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گی مجھے اپنے سرتاج کے پہلو ہی میں رہنا چاہئے۔"

غیاث بیگ رخصت ہو گیا۔ وہ اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ اس رات جب لاڈلی ٹانگیں سکیڑ کے سو گئی تو نورمحل مرمریں جالیوں کے پاس بیٹھی خلاؤں کو گھورتی رہی اگرچہ آسمان پر چاند بھی نہ تھا اور ستاروں کی روشنی بھی کہرنے دھندلا رکھی تھی۔ اس کی خواہیں اس سوچ میں پڑی اونگھ رہی تھی کہ نورمحل آئینہ دیکھنے کے بجائے آخر اتنی دیر خلاؤں میں کیوں گھورتی رہتی ہے!

اس واقعے پر تین راتیں گزر چکی تھیں۔ جہانگیر اجمیر کی فصیل کے نیچے لشکر گاہ کے حمام شاہی میں مقربین خاص کے ساتھ بیٹھا گنجفہ کھیل رہا تھا۔ شہزادہ خرم عقبی کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ خلوت کب ہوتی ہے؟ لیکن آدھی رات گزر جانے

کے باوجود جہاں گیر ابھی سونا نہ چاہتا تھا۔ اس نے نئے انگریز سفیر کو جگانے کا حکم دیا اور اسے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ وہ بار بار سفیر کو "انگریزی خان کہہ کر مخاطب کرتا۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ سرطامس روکا نام صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر تھا۔۔۔۔۔۔ اور اسے اپنے ہاتھ کے پتے دکھاتا۔

اگرچہ درباریوں کو انگریز سفیر سے سخت نفرت تھی تاہم جہانگیر نے محض اس کی عزت افزائی کے لئے ایک دیوار پر شاہ جیمز کی تصویریں لگا رکھی تھیں ان کے علاوہ ایک اور تصویر بھی تھی، جس میں دو بحیری بیڑوں کو باہم لڑتے دکھایا گیا تھا۔

"گوارا ہیں یہ تصویریں!" جہانگیر نے گنجفے کے پتے دیکھتے ہوئے کہا! لیکن میرے مصور اتنی مہارت سے ان کی نقل اتار سکتے ہیں کہ تم اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکو گے۔"

اور شراب نوشی کے دوران میں بھی۔۔۔۔۔۔۔ سرطامس رونے عقل و تدبیر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر وہ مغل بادشاہ کی کسی چال میں آ گیا تو بازی ہار جائے گا۔"

"میری تو ہمت نہیں پڑتی" اس نے جواب دیا۔

اور ایک پرتگالی پادری نے اس کے الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کرکے شہنشاہ کو سنا دیا۔

"تم تصویروں میں تمیز نہ کر سکو گے یا اس کی کوشش ہی نہ کرو گے؟" بادشاہ صحیح بات معلوم کرنی چاہتا تھا۔

"نقل نقل ہے۔ اصل تو نہیں ہو سکتی۔" انگریز سفیر نے کہا۔ اس کا ترجمہ پرتگالی پادری نے ضدی سفیر کو ذلیل کرنے کے لئے عمداً" یہ کیا! اعلی حضرت کے مصور شاید اس کی ہو بہو نقل نہ اتار سکیں۔"

"تو شرط بدتے ہو؟" جہانگیر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"جیسی اعلی حضرت کی مرضی!"

"تو خلعت کے بدلے نیلگوں مخمل کی پوشاک رہی۔"

خلعت کی قیمت چند روپے سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں نیلگوں مخمل کی پوشاک پر جہانگیر کو تین اشرفیاں صرف کرنی پڑتیں۔

جب شرط طے ہو گئی تو اس نے حکم دیا کہ تصویریں شاہی مصوروں کے حوالے کر دی

جائیں تاکہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ان کی نصف درجن نقلیں تیار کر دیں لیکن نقلی اور اصل میں تمیز نہ ہو سکے ورنہ سزا دی جائے گی۔

"تمہاری گھوڑا گاڑی تو بہت اچھی ہے۔ لیکن اس میں اہل و عیال کے بیٹھنے کی جگہ نہیں۔"

پرتگالی پادری نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے انگریز سفیر کو بتایا کہ "اہل و عیال" سے شہنشاہ کی مراد "بیوی" ہے۔

سرطامس رو نے جواب دیا "میرے ملک میں کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کے اہل و عیال گھوڑا گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔"

پادری نے اس کا ترجمہ یوں کیا۔ "اس کے ملک میں حرم سرائے شاہی کی بیگمات کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اتنی عمدہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوں!"

جہانگیر کی پیشانی ایک لمحہ کے لئے شکن آلود ہو گئی۔ اس نے فراش سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ انگریز واقعی بڑے وحشی ہوتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کچھ خبر نہیں۔

"بے شک' بے شک" فراش نے کہا "وہ کتوں کی طرح بھونکتے ہیں۔ خدا جانے وہ گاتے کس طرح ہوں گے؟"

اس سے جہانگیر کو ایک نیا خیال سوجھا۔ اس نے سرطامس رو کو بہ اصرار شراب کا ایک جام پلایا اور اس سے کہا کہ وہ اپنی پسند کا کوئی گانا سنائے۔ مغل شہنشاہ کے سامنے انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سرطامس رو نے گلا صاف کیا اور اپنی مضبوط ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے جوتے وہ دروازے پر چھوڑ آیا تھا اور اسے شاہی موزے پہنا دیئے گئے تھے۔ وہ ایک بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی برس رہی تھی۔ اس نے سفارتی وقار کو ملحوظ رکھا اور جہانگیر کو سلام کرنے کے بعد ایک بحری گیت شروع کیا۔ جب وہ آخری بند پر پہنچا تو اس کی کرخت آواز میں ملایمت پیدا ہو گئی۔

THE KING SITS IN DUNFERMLINE TOUN

DRINKING THE BLUDE-RED WINE

O WHAUR WILLI GET A SKEELY SKIPPER

TO SAIL THIS GUDE SHIP OF MINE

"اس کا مطلب کیا ہے؟" جہانگیر نے پادری کے کان میں پوچھا۔

"اعلیٰ حضرت! ہے تو یہ وحشی جانوروں کی غراہٹ ہی لیکن اس کا تعلق سمندری جہازوں سے ہے جو تباہ ہو گئے۔"

"پھر یہ تمہارے اس بیڑے کا ذکر ہو گا' جسے انگریزوں نے اسی سال غرق کیا ہے!" جہانگیر کو یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے انگریزوں نے سورت کی بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر پرتگالیوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ اور اگر وہ گمنام انگریزوں کی' جو اسے شکاری کتے اور گھوڑا گاڑی کے سوا کچھ بھی بطور تحفہ نہ بھیجتے' حمایت کر رہا تھا تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ وہ سمندروں میں گستاخ پرتگالیوں کا اثرورسوخ گھٹانا چاہتا تھا؟

"I SAW THE NEW MOONLATE YESTREEN
WI THE AULD MOON IN HER ARM
AND I FEAR I FEAR MY MASTER DEAR
THAT WE SALL COME TO HARMI"

جب سرطامس رو نے گیت ختم کیا تو مغل شہنشاہ تفریح سے اکتا چکا تھا۔ اس نے محفل برخاست کر دی۔ گنجفے کے پتے ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بارہ بادشاہوں کو باقی پتوں سے علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بارہ بادشاہ ہونے چاہئیں۔ ایک گھوڑے پر' ایک ہاتھی پر اور ایک تخت پر'------ لیکن ابھی اس نے سارے بادشاہوں کو یکجا نہ کیا تھا کہ خرم اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور کسی نامعلوم وجہ سے اس وقت خرم کا آنا اسے ناگوار گزرا۔

"خوش وقت شہزادے! تم بالکل لومڑی کی طرح ہو!" اس نے کہا اور شہنشاہ کے پیچھے کھڑا ہوا معتمد بھی مسکرایا۔ جہانگیر نے حکم دے رکھا تھا کہ کے تفریحی مشاغل میں جو کچھ اس کی زبان سے نکلے' اسے قلم بند کرکے دوسرے دن اس کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر وہ سزائے موت کے کسی فرمان پر دستخط کرے' تو سزا کو دوسرے دن غروب آفتاب تک ملتوی رکھا جائے۔

جہاں گیر نے خرم کو جذبات سے عاری لہجے میں یہ کہتے سنا کہ اسے شہزادا خسرو کے متعلق شہنشاہ کا ایک ذاتی فرمان مطلوب ہے۔

"کیا یہ معاملہ طے نہیں ہو چکا؟" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا! "خوش وقت

شہزادے! اتوار کو میں ایک تالاب کے پاس گھوڑے سے اترا' تالاب کے وسط میں پتھر کی ایک عمارت تھی' جس کے ایک ستون پر کسی شاعر کی یہ رباعی کندہ تھی۔

یاران موافق ہمہ از دست شدند
درپائے اجل یگاں یگاں پست شدند
خوردیم زیک شراب در مجلس عمر
دورے دو سہ پیشتر زما مست شدند

جہانگیر جب رباعی پڑھ چکا' تو خرم نے محسوس کیا کہ شہنشاہ اس پر تبصرہ چاہتا ہے'

"ابا حضرت! یہ رباعی تو بری نہیں لیکن مجھے اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئی۔"

"ایک؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ مجھے یہ رباعی کھنڈروں میں ملی۔ میں نے ایک ستون پر اسے کندہ دیکھا۔ خدا جانے وہاں کون لکھ گیا۔ بہرحال جس نے لکھی اس نے شراب کی تعریف خوب کی ہے۔" جہانگیر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن بیٹا خرم! تم شراب کے ذوق اور فلسفے کو کیا جانو؟"

شہزادے نے ادب سے سر جھکا لیا اور ایک لمحے کے بعد بولا "فرمان' توجہ خسروانہ کا منتظر ہے۔ رائے سنگھ ڈھلن کو اجازت دی جائے کہ خسرو کو ہمارے حوالے کر دے۔"

جہانگیر نے ذہن پر زور دے کر پورے حالات یاد کرنے چاہے' لیکن اس کی نگاہیں چراغوں کے شعلوں پر مرکوز تھیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے ان کا شمار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سات شعلے تھے۔ لیکن شاید ایک لحاظ سے چودہ بھی تھے۔

"خسرو کی حوالگی کا فرمان؟"

یقیناً یہ کرنا ہی پڑے گا۔ اسے نابینا شہزادے سے محبت تھی۔ اس نے خسرو کی آنکھوں کے علاج کے لئے حاذق طبیبوں کو طلب کیا تھا۔

"اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق شاہی فرمان لکھا جا چکا ہے" خرم کی آواز نے اسے یقین دلایا۔ "لیکن رائے سنگھ کے اطمینان کے لئے اس پر شاہی مہر ضروری ہے۔" اس نے متعمد کو اشارا کیا جس نے مہر لگانے کے لئے سرخ روشنائی پیش کی۔ لیکن اس اثنا میں جہانگیر نے خریطہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ تحریر چونکہ خط شکستہ میں تھی اس لئے بہت سے الفاظ اس سے نہ پڑھے جا سکے۔ تاہم وہ مہر ثبت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

"کیا اس سے ہمارے وقار پر حرف نہیں آتا؟" اس نے بے توجہی کے عالم میں پوچھا۔

خرم کئی گھنٹے تک عقبی کمرے میں محض اس لئے منتظر رہا کہ وہ شاہی فرمان پر آج ہی مہر ثبت کرانی چاہتا تھا۔ وہ ایک ہفتے کے اندر فوج کی کمان سنبھال کر دکن جانے والا تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نابینا بھائی اس کی غیر حاضری میں شاہی دربار کے قریب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ خسرو کو تحویل میں لینا محض ایک معمولی سا حفاظتی اقدام تھا لیکن خرم معمولی سی احتیاط کو بھی نظر انداز نہ کرتا تھا۔ عین آخر مرحلے پر جب اس نے جہانگیر کو متذبذب پایا تو وہ سخت پریشان ہوا اور اس نے جواب میں کہا۔

"اسی طرح کیا میرا وقار بھی خطرے میں نہیں پڑتا؟"

جہانگیر اس لطیف نکتے پر بحث کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کاغذ کو الٹ پلٹ کیا اور ایک دفعہ پھر چراغ کے شعلوں کو دیکھنے لگا۔ یکایک اس نے حیران ہو کر گہرا سانس لیا۔ فرشی جھاڑ کے درمیان ایک عورت سفید لباس پہنے کھڑی اس کی جانب پراسرار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر کے بالوں کی زنجیر اور اس کے دست بندوں' پازیبوں اور گورے گورے برہنہ بازوؤں کے جوشنوں میں جڑے ہوئے نیلم اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ ان سے شعاعیں اس طرح پھوٹ رہی تھیں' جیسے رقص کر رہی ہوں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہو رہا تھا' جیسے وہ حرکت کر رہی ہے' حالانکہ وہ بالکل بت بنی کھڑی تھی۔ جہاں گیر اسی لمحے سمجھ گیا کہ یہ پرستان کا کوئی خواب نہیں' بلکہ نور محل ہے۔

خرم نے اسے کنکھیوں سے دیکھنے کے بعد سوچا کہ نہ جانے وہ پردے کے پیچھے کتنی دیر سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور رات کے ان لمحات میں' جو مغل شہنشاہ کی رنگ رلیوں کے لئے مخصوص ہیں' آخر وہ کون سی خودسرانہ خواہش ہے' جو اسے شاہی حمام میں لے کر آئی ہے۔ لیکن اسی لمحہ اسے نور محل کی قربت میں وہی قدیم مسرت محسوس ہوئی۔

"شیخو بابا" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "میں آگرہ سے ابھی واپس آئی ہوں۔ اپنے آقا کی قدم بوسی کے لئے ہم نے رات کو بھی سفر کیا ہے۔"

وہ بجلی کی طرح شمع انور کے درمیان سے نکل کر جہانگیر کے سامنے دوزانو ہو گئی۔ خرم کو دل ہی دل میں غصہ آیا لیکن وہ حسن کے اس انداز سپردگی کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ نور محل اپنی مرضی سے آگرہ گئی تھی اور واپسی کے وہ پیغامات بھی

اس تک نہ پہنچے تھے' جو شہنشاہ نے اسے بھیجے تھے۔ وہ اپنے باپ کی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"تم طاعون سے بچ نکلیں مہرو۔" جہانگیر بے اختیار بول اٹھا۔ "تم نے اتنی دیر کیوں کی آنے میں؟ یہاں بھی بیماری پھیل گئی۔ میں بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ میرے گلے (۹) میں تکلیف ہو گئی' اتنی شدید کہ سانس تک نہ لیا جاتا تھا' اب بھی بدن میں کمزوری باقی ہے' اور پھر نیند بھی نہیں آتی۔

اس کے پپوٹے سوج گئے تھے اور لب پژمردہ نظر آتے تھے۔ وہ بولتے وقت بھی ہانپتا اور کھانستا تھا۔ نور محل نے پہلی ہی نظر میں یہ تغیر بھانپ لیا تھا۔

"لیکن شکار------؟ وہ تو کیا چھوٹا ہو گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

جہانگیر نے بڑی حسرت سے سر ہلایا؟ "مہرو میں شکار کو نہیں جا سکا بیماری کے دنوں میں برابر جھروکے میں بیٹھ کر انصاف کرتا رہا ہوں۔

"بالکل بجا! رعایا کو جہاں پناہ کے رحم و کرم کی بے حد ضرورت ہے جیسی مجھے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں؟ وہ رحم کی طالب نور محل کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے لئے جھکا' اس کے ذہن میں ایک ہلکا سا احساس موجود تھا کہ نور محل نے اس کے احکام سے سرتابی کی ہے لیکن گلاب کے عطر کا ایک جھونکا اس احساس کو اڑا لے گیا------!

خرم کا خیال تھا کہ اس کا باپ ابھی ایرانی بیگم پر برس پڑے گا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے شاہی فرمان کو لپیٹ کر پٹکے میں رکھ لیا۔ نور محل نے اگرچہ کاغذ بالکل نہ دیکھا تھا لیکن خرم کو یقین تھا کہ وہ جہانگیر کو اس فرمان پر دستخط کرنے سے روکنے ہی کے لئے آئی ہے اس نے رسماً کہا:

"جہاں پناہ! میں اجازت چاہتا ہوں!"

"ہاں' تم جاؤ اور دروازہ بند کراتے جانا۔ کوئی شخص ادھر نہ آنے پائے"

جب خرم ادب سے باہر نکل گیا' تو جہاں گیر' نور محل پر برس پڑا' جو اس کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"آخر تمہارے دماغ میں کیا خلل آ گیا تھا کہ میرے دو بار بلوانے پر بھی تم حاضر نہ ہوئیں۔"

اگر اس کے جواب میں وہ کہتی کہ پیغام راستے ہی میں اڑا لئے گئے' تو اس کی حیثیت عذرلنگ سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا:

"میں حاضر تو ہو گئی۔"

جہانگیر کی پلکیں نم آلود ہو گئیں۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لینے کی کوشش کی۔ اس کی رگوں میں افیون اس طرح نغمہ زن تھی' جیسے پانی کی موجیں گنگنا رہی ہوں' یا ہوا کے جھونکے آہیں بھر رہے ہوں اور ہوا کے یہی جھونکے جہاں گیر کی پلکوں کی نمی کو اڑا لے گئے۔ کچھ دیر اس پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے نور محل کے بجائے ایک سفید مورتی ہے' جو شفاف ریت کے ڈھیر پر دوزانو بیٹھی ہے اور ہفت افلاک کے سورج اس کے پس پشت جھلملا رہے ہیں۔ اس کا چہرہ ایک ایسی جوت سے دمک رہا ہے' جو خود اسی میں سے پھوٹ رہی ہے۔

جہاں گیر کو اپنا جوڑ جوڑ تکلیف سے کراہتا محسوس ہوا اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ گرم ہوا کا طوفان اب بھی رواں دواں تھا لیکن اس کے جھونکے گلاب کے عطر میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ شفاف ریت کا تودہ' سفید ریشم سے بدل گیا تھا جسے نادیدہ ہاتھوں نے بنا ہو۔

جہانگیر آگے جھک کر پھیلی پھیلی آنکھوں سے نور محل کے آسمانی حسن کو دیکھنے لگا۔

"میری طرف دیکھو۔" جہانگیر نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے دور کہیں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ نور محل کی آنکھوں میں ابلتے ہوئے جذبات دیکھ رہا تھا لیکن وہ گھبراہٹ اسے نظر نہ آئی' جو ان جذبات میں جھلک رہی تھی۔

"یہ شمعیں!" جہانگیر نے کہا۔

نور محل نے نرم و نازک ہاتھ فانوس کی جانب بڑھایا اور ایک ایک کرکے تمام شمعیں گل کر دیں۔ جہانگیر کو گرم ہوا کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اور دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ اس نے نور محل کو آغوش میں لے رکھا تھا۔ اور نور محل کے ہونٹ اس کے حلق کو مس کر رہے تھے۔

گرم ہوا کے ایک جھونکے نے نور محل کی زلفیں جہانگیر کے چہرے پر بکھیر دیں اور وہ سوچنے لگا کہ جب آفتاب روپوش ہو چکا ہے تو اس کی تمازت کیوں برقرار ہے؟ ایک الم' جو

سر تا سر لذت تھا' اس کی رگ رگ میں تیرنے لگا۔ اور آخر کار اس کے دماغ میں پہنچ کر ایک مستقل ارتعاش بن گیا۔ اس کے ہاتھ نور محل کے بے حس و حرکت جسم پر تھرتھرا رہے تھے۔ اور اس کی توانائی ایک خاموش بہتے ہوئے پانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

نور محل اس کے سامنے بے جان سی پڑی تھی اور وہ حیران تھا کہ ہوا کی یہ عجیب و غریب سائیں سائیں اسے کیوں سنائی دے رہی ہے' اسے بخار سا چڑھتا محسوس ہوا' اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ مچھروں کو ہوا پہنچانے کے لئے اس نے اپنا منہ پھیرا۔ اور اسی لمحے نور محل اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل گئی۔

"یہ بیماری کا اثر ہے!" جہانگیر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

نور محل نے سر اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ آنچل سے اس کے ماتھے اور رخساروں کا پسینہ پونچھا اور اس کے بعد اسے مور چھل سے ہوا دینے لگی۔

"جان من! یہ بیماری ہی کا اثر ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو تھکانا نہیں چاہئے! ایسی حالت میں آرام اور نیند بہتر ہے۔"

"میں روازنہ جھروکے سے بیماروں کو لے جاتے دیکھتا تھا..... انشاء اللہ! یہ کمزوری رفع ہو جائے گی..... اب تم آگئی ہو!"

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد جب نور محل نے مور چھل ہاتھ سے رکھا جہاں گیر گہری نیند سو رہا تھا۔ پردوں میں سے ملگجی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی جس میں جہانگیر کے بیمار چہرے کے خطوط نمایاں ہو رہے تھے۔ قالین پر گنجفہ کے پتے اور جام بکھرے پڑے تھے۔ نور محل ساکت و صامت بیٹھی جاگ رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش ابھرنے لگے۔ سامنے پردے پر شیر کے شکار کی ایک تصویر تھی' جسے نور محل کی محویت نے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

اب وہ پھر مہرو تھی——— لاڈلی سے ذرا بڑی——— جو قلعہ سرخ کی مرمریں جھلملیوں سے نو عمر شیخو بابا کو پھولوں کے درمیان چہل قدمی کرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک وہ ایک طلسمی ساعت تھی' جب نوخیز شہزادے نے مڑ کر جھلملیوں کی طرف دیکھا تھا اور مہرو کی نگاہیں اس سے چار ہوتی تھیں۔ اس خیال سے ایک لرزش——— ایک جھرجھری سی اس کے جسم میں تیر گئی۔ اسی طرح اس کے نزدیک وہ لمحات بھی بے حد قیمتی تھے جب اس نے جہانگیر کے قہقہوں کی گونج سنی اور اسے یہ احساس ہوا کہ جہانگیر بے

حد خوش ہے۔

اس کی گڑیا کا چہرہ بڑا دل کش تھا' جس کے کان میں اس نے بے اختیار ہو کر اپنی محبت کا راز کہہ دیا تھا۔ اب جہانگیر شہنشاہ تھا۔ ظل اللہ جو عوام کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا تھا۔ بچپن سے نور محل کی یہ آرزو تھی کہ وہ انمول خزانے کی مالک بنے اور اب اس کا یہ دیرینہ خواب پورا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا انمول خزانہ------ جہانگیر------ اس وقت اپنے زرد چہرے کے ساتھ قالین پر بے سدھ پڑا تھا۔

نور محل اپنے باپ کے احکام اور جہانگیر کی تلون مزاجی سے محفوظ رہنا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے ان نادیدہ دشمنوں کا بھی کھٹکا لگا رہتا تھا جو ہمہ وقت اس کے درپے تھے۔

وہ جہانگیر پر اثر انداز ہو کر اسے اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتی تھی لیکن جہانگیر ضدی ہونے کے علاوہ نور محل کے مخالفوں کے نرغے میں تھا۔ وہ شہنشاہ ہونے کے باوجود ملکہ کی حفاظت نہ کر سکتا تھا' اور خود نور محل کے اپنے خدام بھی اس کے مفاد کی نگہداشت سے قاصر تھے۔ اس نے اپنے لئے اب تک کچھ طلب نہ کیا تھا اور وہ طلائی دربار کی ایک ملمع شدہ مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ جس کی حیثیت فرش پر بچھے ہوئے قالین سے زیادہ نہ تھی۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور اچانک اسے ایک راستہ نظر آیا' جو اس کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ اس رستے سے وہ نہ صرف اپنی بلکہ لاڈلی اور لاڈلی کے سوا دوسروں کی بھی حفاظت کر سکتی تھی۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ اختیار------ شاہی احکام کے نفاذ کے اختیار------ کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آ جاتی۔ اگر ایسا ہو جائے' تو وہ عورت ہونے کے باوجود اس مرد بیمار کی حفاظت بھی بخوبی کر سکے گی' جو اس کے زانوؤں پر سر رکھے بے چینی کی نیند سو رہا تھا۔

اس سال کے اختتام پر جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا کہ اس نے "نور محل" کو "نورجہاں" کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اب نور محل' شہنشاہ کی خواہش کے مطابق' نورجہاں بن گئی تھی۔ جہاں گیر بے اختیار مسکرا دیا' جب نور محل نے پہلی بار شاہی فرمان پر ماہرانہ انداز سے دستخط کئے۔

لیکن نور محل کے مرتبے میں جو نازک اور دور رس تبدیلی ہوئی تھی۔ اس کا حسین

پیراۂ اظہار فراش شاعر کے حصے میں آیا۔ اس نے کہا: ہم نے "چیتی بیگم" کھوئی اور "ملکہ عالم" حاصل کر لی۔"

☆☆☆

(۴)

چھ سال گزر گئے ــــــ!

یہ سال بڑے پرسکون تھے اور وہ غیاث بیگ کے لئے جو طمانیت لائے' الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اب تک اپنی بیٹی کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بے خبر رہا ہے' جو اب ایک عظیم سلطنت کے انتظامات میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

غیاث بیگ کو "اعتمادالدولہ" کا نیا خطاب بھی مل گیا تھا۔ اب اسے اپنی سواری کے آگے جھنڈا لہرانے کا حق حاصل ہو گیا تھا اور اس کے طبل بردار ولی عہد سلطنت! شہزادہ خرم کے طبل برداروں کے بعد ہوتے تھے۔ ساتھ ہی اس کی تنخواہ میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا' جو چودہ ہزار گھوڑ سواروں کی تنخواہ کے برابر تھی۔ نجی تحائف اور نذرانوں کے طور پر وصول ہونے والی معتدبہ رقم اس کے علاوہ تھی۔ جس کا صحیح علم اس جہاندیدہ ایرانی کے سوا کسی کو نہ تھا غیاث بیگ سونے میں کھیل رہا تھا اور ہر طرح مطمئن تھا۔ وہ بجا طور پر اپنے آپ کو "اعتمادالدولہ" کے خطاب کا مستحق سمجھتا تھا۔ مغل اس ملک پر فاتحوں کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے اور ہندوستان کی ساری دولت شہنشاہ جہانگیر کی ملکیت متصور ہوتی تھی۔ کسی امیر کی وفات پر اس کی اراضی' عمارتیں گھوڑے اور خزانہ تخت کے نام پر منتقل ہو جاتا تھا اور اس بات کا فیصلہ جہانگیر کرتا تھا کہ مرنے والے کی بیوہ یا بیٹوں کو کتنی جائیداد واگزار کر دی جائے۔ زندہ امراء شہنشاہ کی نگاہ کرم حاصل کرنے کے لئے اس کی خدمت میں نایاب ہیرے جواہرات پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور دولت کی یہ ریل پیل غیاث بیگ ہی کے حساب کتاب سے گزر کر خزانہ شاہی کا منہ دیکھتی۔

اتنی زیادہ رقموں کا حساب رکھنے کے لئے ایک نہایت ہوشیار اور ماہر حساب داں کی ضرورت تھی اور غیاث بیگ ایک جادوگر کی طرح سارا کام اس طرح نمٹا دیا کرتا۔ جس سے وہ خود بھی فائدے میں رہتا۔

اس نوع کے تمام دوسرے دولت مندوں کی طرح وہ بڑی ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے خیال میں مال و اسباب اور زر و جواہر جمع کرنا بے سود تھا کیوں کہ موت کے بعد یہ سب کچھ شاہی عمال کے قبضے میں چلا جاتا۔ گزشتہ چھ سال میں اس کے جمنا کے کنارے ایک نیا محل تعمیر کرایا تھا جو اس کے بیٹے آصف خاں اور شہزادہ خرم کے محلات کے درمیان واقع تھا۔ یہ محل پختہ اینٹوں اور سنگ خارا سے بنایا گیا تھا۔ جس میں ہرات کے نیلے ٹائیلوں سے حاشیہ کاری کی گئی تھی فرش سنگ سیاہ اور سنگ مرمر کا تھا۔ دروازے صندل کی لکڑی اور برآمدے بلور کے علاوہ مختلف قیمتی پتھروں سے مزین کئے گئے تھے۔ کتب خانے کی دیوار پر سنہرے عربی حروف میں۔ قرآن پاک کی یہ آیت کندہ تھی :۔

فذوقوا ما کنتم تکنزون'(۱۰)

وہ قیمتی اشیاء کی خریداری پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ بیش قیمت جواہرات ہاتھی دانت کا کام' قیمتی غالیچے' کوہ پیکر ہاتھی اور وسیع و عریض زمینیں اس کی دل پسند اشیاء تھیں۔ جنہیں وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ملکیت بنانے کا خواہش مند تھا۔

یہ تمام چیزیں ایک دن مغل شہنشاہ کے وسیع خزانے کی زینت بننے والی تھیں۔ اور غیاث بیگ زندگی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ لیکن بوڑھا ایرانی مدارالمہام کسی اور فکر میں غلطاں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی جائیداد شاہی قبضے میں نہ جائے گی۔ اس نے اس بات کا اظہار کبھی نہ کیا اور کتب خانے کی دیوار پر کندہ سنہری حروف دیکھ دیکھ کر دل میں امید کی اس کرن کو اجاگر کرتا رہا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی تمام عمر کی جمع کی ہوئی پونجی سے لطف اٹھا سکے گا۔

غیاث بیگ نے اپنے نظریہ کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کرنے کا درد سر کبھی مول نہ لیا وہ انتہائی وفاشعاری سے جہانگیر کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تخت کے نام پر مزارعوں سے پیداوار کا ایک تہائی بطور لگان کے وصول کر لینا زیادتی ہے لیکن اس کے معاوضے میں مغلوں نے رعایا کو بہت سی دوسری مراعات دے رکھی تھیں' اور سطح مرتفع کابل سے لے کر کلکتہ کی بارونق گودیوں تک ساری مملکت میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔

مغلوں نے انتہائی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابتدا ہی سے مفتوحین کو کامل مجلسی آزادی دے رکھی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو خود ذات پات کے تعصب اور

طبقاتی اختلافات میں بری طرح الجھے ہوئے تھے لیکن دربار میں ان سب کی حیثیت ایک سی تھی۔ جہانگیر نے بدھوں' چینیوں' برہمنوں یہاں تک کہ عیسائیوں کو بھی تمام مراعات دے رکھی تھیں۔

دیہات میں کھیا راج تھا۔ کسی شکار کی مہم یا لشکر کے گزرنے کی وجہ سے اگر فصلوں کو نقصان پہنچتا یا انہیں غذا اور چارا مہیا کیا جاتا تو کاشتکار اس کا معاوضہ طلب کر سکتے تھے۔ اگر وہ خوش قسمتی سے جہاں گیر کی توجہ حاصل کر لیتے تو انہیں فوری ادائیگی کا حکم دے دیا جاتا تھا کیونکہ جہانگیر کو اپنے عدل و انصاف اور انتظامیہ کی مستعدی پر ناز تھا' غیاث بیگ کے عہدہ سنبھالنے سے قبل ملک کی بہت تھوڑی زمین زیر کاشت تھی اور عوام لگان کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔

دربار کے تمام امراء اور متوسلین عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مرنے کے بعد ان کی جائدادیں ان کے وارثوں کو نہ ملیں گی تاہم اس طرح صاحب کردار لوگوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ غیاث بیگ جانتا تھا کہ تین چار نسلوں کے بعد کابل کے اس پار سرد علاقوں سے آنے والے ترک اور تاتار فاتحوں کی اولاد مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے گی۔

غیاث بیگ کو مغلوں کے کردار میں اب بھی اس قسم کی تبدیلی واضح اور نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

سو سال قبل ہندوستان کا پہلا مغل فاتح ـــــ بابر! صحیح معنوں میں ایک تاتاری تھا۔ وہ بے حد جسمانی طاقت کا مالک اور کشادہ دل انسان تھا جو اپنی غلطیوں پر ہنسنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا ہمایوں طبیعت کے اعتبار سے نسبتاً" نرم سانچے میں ڈھلا تھا۔ وہ ان علاقوں میں شمشیر آزمائی کرتا رہا' جو اس کا باپ اس سے پہلے فتح کر چکا تھا۔ البتہ اکبر غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے ذوق تعمیر کی آسودگی کے لئے فتح پور جیسا حسین شہر بسایا۔

کبھی کبھی غیاث بیگ کہہ اٹھتا "سلسلہ روز و شب یوں ہی جاری رہے گا' ستارے اپنی پامال گزرگاہوں میں اسی طرح گردش کرتے رہیں گے لیکن ـــــ ہندوستان میں ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے۔"

اس سے پہلے تمام مغل شہنشاہ فتوحات اور بغاوتوں کی سرکوبی میں مصروف رہے تھے۔

جہانگیر پہلا بادشاہ تھا جسے تخت ورثے میں ملا۔ اس کے متعلق غیاث بیگ کو ماننا پڑا کہ جہاں گیر جتنا عقل مند بظاہر نظر آتا ہے درحقیقت اس سے کہیں زیادہ ذہین و فطین ہے جہانگیر نے اکثر و بیشتر اکبر کے انداز حکومت پر اکتفا کیا' تاہم وہ اکبر کی طرح فتح پور جیسے شہر کی منصوبہ بندی نہ کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پانی کی قلت کے باعث اسے فتح پور چھوڑنا پڑا۔ اس نے تاریخی عمارات کے سلسلے میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ غیاث بیگ نے سمجھ لیا کہ وہ حالات کو اپنا رخ اختیار کرنے کا موقع دے رہا ہے اور یہ بات مغلوں کے مزاج کے عین مطابق تھی۔

جہانگیر نے طاقتور اور باقاعدہ فوج رکھنے کے بارے میں بھی زیادہ سرگرمی نہ دکھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ہزاروں لاکھوں سپاہی اپنی تاتاری شان و شوکت کے مظاہرے سے عوام کو متاثر کر لیتے تھے لیکن وہ تیمور کے جفاکش اور سخت جان فوجیوں سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ بہرحال ان کے طمطراق نے اہل ہند کے دلوں پر حکومت کی سطوت اور دبدبہ قائم کر دیا تھا۔

سرحدوں پر حقیقی جنگ ناگزیر ہو جاتی۔ جہانگیر نے یہ کام اپنے لائق ترین جرنیلوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ راجہ بکراجیت جنوبی ہند کی فوجوں کا نگران تھا اور مہابت خاں افغانستان کے پہاڑی دروں کی حفاظت پر مامور۔ سرحدی علاقوں کے باشندے صرف تلوار کی طاقت کے قائل تھے اور ان کی سرکوبی تلوار ہی کے ذریعے سے ہو سکتی تھی۔

غرض غیاث بیگ کے اطمینان کی وجوہ موجود تھیں۔ وہ سلطنت جس کا تصور' تیمور کے ذہن میں ابھرا' جس کا خاکہ بابر نے تیار کیا اور جس میں رنگ حقیقت اکبر نے بھرا' اب وہ جہانگیر ایسے حکمران کے عہد میں بھی بدستور قائم تھی۔

لیکن اس کی وجہ جہانگیر کی تن آسانی اور آرام طلبی نہ تھی بلکہ ان افراد کی غیر معمولی قابلیت تھی جن کے ہاتھ میں نظم و نسق کی حقیقی ڈور تھی ---- یعنی وہ خود شہزادہ خرم' آصف خاں اور مہابت خاں ---- شہزادہ خرم کو چھوڑ کر دوسرے تمام افراد اس ملک کے لئے اجنبی تھے اور انہیں مغل سلطنت کی غیر معمولی دولت اس ملک میں کھینچ لائی تھی۔

سلطنت مغلیہ اب ٹھوس اور پائیدار بنیادوں پر قائم ہو چکی تھی اور ایشیا بھر میں اس کی شہرت اب بڑے بڑے علماء فضلا کے لئے باعث کشش بن رہی تھی۔ حتیٰ کہ ملک خطا کی ذہانت نے بھی اس کی نشوونما میں حصہ لیا۔ جہانگیر کا دربار روئے زمین پر تمام بادشاہوں

کے مقابلے میں نکتہ رس' طباع اور فلسفیانہ ذہنوں کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا۔

اکثر اوقات غیاث بیگ دوسرے وزراء سے مملکت کے مستقبل' مشرق بعید کی روز افزوں تجارت' پرتگیزوں اور انگریزوں کے ذریعے سے یورپ کے ساتھ کاروباری تعلقات اور قحط سالی کے مقابلے کی تدابیر پر بحث کیا کرتا تھا۔ ہندوستان کو چندر گپت اور اشوک کے سنہری عہد کی یاد تازہ کرنے کے لئے امن کی ضرورت تھی اور مغل فاتحوں نے اسے امن بخش دیا تھا۔

غیاث بیگ اپنے محل کے بلند و بالا ایوانوں میں ٹہلتے ہوئے مستقبل کے خوش آئند نقشے کھینچا کرتا تھا لیکن جب وہ بازاروں سے گزرتا تو اسے مکانوں کے بند دروازوں کے پیچھے سے طاعون کی بلا جھانکتی نظر آتی۔ یہ مکان کئی سال پہلے مقفل ہوئے تھے اور انہیں دوبارہ آنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اسے گدلے دریا میں مچھلیوں کے لئے جال پھینکنے والوں کے نحیف ڈھانچے دکھائی دیتے اور اس کے کانوں میں بھکاریوں کی درد ناک صدائیں گونجنے لگتیں "یاحق' یاحق" بیماری نے ہمیں آ دبوچا ہے!" مندروں میں بیماروں کا ہجوم رہتا اور سکھ پھونکے جاتے ـــــ انسان' جو جانوروں سے مشابہ تھے' جنگلوں میں مارے مارے پھرتے' گھاس پھونس یا چوری کا غلہ کھا کر گزارا کرتے اور رات کو کسی ویران مندر کے کھنڈروں میں پڑ رہتے۔ اندھے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بچے یا کتے کے سہارے سڑکوں پر کسی ایسے معجزے کی تلاش میں رہتے جو انہیں بصارت عطا کر سکتا۔۔۔۔!

غیاث بیگ یہ تمام باتیں دیکھ کر سوچتا کہ لاتعداد عقائد کے حامل افراد کی اس انوکھی سرزمین میں ہر شخص جدا جدا راستے پر گامزن ہے۔ یہاں لاکھوں پجاری ہیں جو لوگوں کو دیوتاؤں کے ذکر سے مطمئن کرنے کا فن جانتے ہیں۔ یہ پجاری مغلوں کی آمد سے پہلے بھی دیوتاؤں کی سیوا کرتے تھے' انہوں نے دوسرے فاتحوں کو بھی اس ملک میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ سب انسانیت کے اس ہجوم میں غائب ہو گئے جس کی پشت پر آج عظیم الشان مغلیہ سلطنت کا تخت بچھا ہوا ہے۔

کون جانے! یہاں کس کی حکومت ہے؟ خدا کی؟ عورت کی؟ یا فاتح کی؟

چھ برس بعد ـــــ اس سال پہلی دفعہ دھواں دھار بارشیں ہوئیں۔ دریاؤں میں طغیانی آگئی جس سے پل اور دیہات بہہ گئے۔ جنگل بھی پانی کی تاب نہ لا سکے اور بڑے بڑے درخت اکھڑ کر دریاؤں میں تیرنے لگے۔ دریائے جمنا عجیب شور مچاتا قلعہ آگرہ کی

دیواروں سے ٹکرانے لگا اور موسم شناس بڑے بوڑھوں نے پیش گوئی کر دی کہ اب طاعون کا رہا سہا اثر بھی زائل ہو جائے گا۔

بارشوں نے غیاث بیگ کو بھی اپنے محل کی چار دیواری میں محصور کر دیا تھا۔ اس اثناء میں وہ اپنے منشیوں اور منیموں کی نگرانی سے غافل نہ رہا' جو باہر سے آنے والی اطلاعات نقل کرتے تھے یہ اطلاعات مختلف صوبہ داروں کے پاس سے کیچڑ میں لت پت ہرکارے لے کر آتے تھے۔ ان میں مویشیوں کی فہرستیں' جمع بندیاں' لگان کی وصولی کی رسیدیں' چھوٹے مواضع اور پرگنوں کی فردوں کا انبار شامل تھا۔ اس انبار میں اس خزانے کی تفصیلات بھی تھیں جو روانہ کیا جا چکا تھا' چوروں کی شکائتیں بھی' اور ڈاک کے ان ہرکاروں کے نام شاہی لشکر کی ہدایات بھی جو بادشاہ کے نام پر سونے کی ترسیل سے لے کر پالکیوں کے لئے زمروں اور کابلی سیبوں تک ہر چیز کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ غیاث بیگ کے سامنے صرف اہم حسابات پیش کئے جاتے تھے۔

وہ اس ہنگامے سے دور ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی سفید ترشی ہوئی ڈاڑھی کے اوپر اس کا جھریوں بھرا چہرہ مرجھا چکا تھا تاہم اس کی بھوری آنکھوں میں تجسس اور تفکر کی روشنی بدستور جھلک رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ پیچھے بیٹھے ہوئے معتمد سے سرگوشی کے لہجے میں کوئی راز کی بات کہتا اور وہ جھٹ اسے فارسی میں لکھ لیتا' ان تمام مصروفیتوں کے ہجوم میں غیاث بیگ ان کثیر التعداد ملاقاتیوں کو بھی مایوس نہ کرتا تھا جو اس سے مختصر سی گفتگو کے لئے کثیر رقم خرچ کرتے اور انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گزارتے' وہ ان سب کی باتیں بڑی سنجیدگی اور توجہ سے سنتا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت کا یہ بوڑھا معتمد نیند اور آرام کی ضروریات سے بالکل بے نیاز ہے۔

ایک رات جب بادل کھل کر برس چکے تھے اور تاریک بھیگی چھتوں کے اوپر تارے چمکتے نظر آ رہے تھے' غیاث بیگ کو اطلاع ملی کہ اس کا بیٹا! آصف خاں کتب خانے میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ لشکر سے اسے کوئی اطلاع دینے آیا تھا۔

غیاث بیگ اس وقت ختن کے ایک چینی تاجر سے گفتگو میں مصروف تھا جس نے اسے زبرجد سے لدے ہوئے بیس اونٹ مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ قافلہ تبت کی برفانی اور سنگلاخ چٹانوں سے گزر کر آنے والا تھا۔ لیکن غیاث بیگ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف اس بات کا یقین حاصل کرنا چاہتا تھا کہ زبرجد خالص ہو اور تمام پتھر

خوبصورتی سے ترشے ہوئے ہوں۔ چینی تاجر نے قیمت کے متعلق اشارا کیا تو اس نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا "چی۔ ان۔ مو! میں انہیں شاہی خزانے کے لئے نہیں خرید رہا ہوں بلکہ اپنی بیٹی کو تحفہ دینا چاہتا ہوں۔"

چینی تاجر نے احترام سے سر جھکاتے ہوئے قیمت سات لاکھ سے ایک دم چھ لاکھ روپے کر دی لیکن وہ حیران تھا کہ نور محل اتنی بڑی مقدار میں زبرجد کیا کرے گی؟

غیاث بیگ ایک پیش خدمت کے سہارے اٹھا اور چینی تاجر سے مخاطب ہو کر بولا "چی۔ ان۔ مو! میں پانچ لاکھ سے ایک پائی زیادہ نہیں دوں گا۔ بشرطیکہ زبرجد اتنا ہی نفیس ہو جتنا تم بتاتے ہو۔ البتہ بار برداری کے اخراجات کے لئے تم چالیس ہزار روپے پیشگی لے سکتے ہو۔" پھر اس نے قدرے توقف سے کہا۔ "میں اب زیادہ برساتیں دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہوں گا اور تم بہت جلد کسی اور دیوان کو بے وقوف بنانے میں اپنی مہارت صرف کر سکو گے میں یہ زبرجد اپنی بیٹی کو اس لئے دے رہا ہوں کہ اسے وہ میرے مقبرے کی تعمیر میں استعمال کرے۔"

غیاث بیگ کتب خانے میں پہنچا تو اس کے بیٹے : آصف خاں نے' جو قلمی کتابوں کی الماریوں کے درمیان کھڑا تھا' اسے سلام کیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ آصف خاں بھاری بھرکم ہو چکا تھا' سیاہ ترشی ہوئی خوبصورت ڈاڑھی ہالے کی طرح اس کے روشن چہرے کو دلکش بنا رہی تھی۔ حسب معمول شاہانہ خلعت زیب تن کئے ہوئے تھا' جس میں زری کے پر تکلف کام نے ایک اکڑاؤ سا پیدا کر دیا تھا۔

آصف خاں نے قدرے شوخی سے کہا۔ "خدا کی قسم ابا جان! مجھے آپ کی صحت پر رشک آتا ہے۔"

"اس لئے کہ میں زندہ رہنے اور کام کرنے کا گر جانتا ہوں۔" غیاث بیگ نے رک رک کر جواب دیا لیکن اس کی آواز میں نغنگی اب بھی موجود تھی۔ پھر اس نے دفعتہ" گفتگو کا رخ بدل کر پوچھا!

"لشکر کی کیا خبریں ہیں؟"

آصف خاں نے مٹھی بھر شکر پارے منہ میں ڈالے' جو خدام اس کے لئے لے آئے تھے اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا! "جہاں پناہ نے آپ کے چوہتر قیراط کے نیلم کی بڑی تعریف کی۔ میں نے اسے بارگاہ عالی میں پیش کرتے وقت شبھ گھڑی دیکھ لی تھی۔ وہ

گزشتہ دو مہینوں سے سارسوں کے جفت ہونے' پھر مادہ کے انڈے دینے اور انڈوں میں سے بچے نکلنے کے عمل کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ پہلے جہاں پناہ انہیں جفت ہوتے دیکھنے کے خواہش مند تھے' اس کے بعد انہوں نے مادہ کو انڈا دیتے دیکھا اور جب درباریوں نے یہ مرحلہ طے ہونے پر اطمینان کا سانس لیا تو وہ روزانہ ان کے پاس جا کر نر اور مادہ کو باری باری انڈا سیتے دیکھنے لگے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم لشکر کے امیر ہر روز اپنے خادموں سے پوچھتے تھے کہ آج سارسوں نے کیا کیا؟ تاکہ ہمیں اپنے آقا کے دل پسند مشغلے کا علم ہو جائے۔ خدا خدا کر کے انڈے سے سارس کے ایک خوبصورت سے بچے نے جنم لیا اور اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔

اب جہاں پناہ بڑے خوش ہیں اور کشمیر کے سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد آصف خاں نے کسی قدر خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا! اس میں شک نہیں کہ یہ پہاڑیاں حسن فطرت کا لاثانی شاہ کار ہیں اور ہندوؤں کے نزدیک مقدس بھی۔ لیکن مجھے پہاڑی رستوں پر ہچکولے کھانا اچھا نہیں لگتا۔

یہ تو میں جانتا ہوں۔ "لیکن تم خبر کیا لے کر آئے ہو؟"

"اعلیٰ حضرت نے ایک نیا سکہ ڈھلوایا ہے۔"

غیاث بیگ نے منتظر نگاہوں سے دیکھا۔ جہانگیر نے ایک نئے طلائی سکے کی تیاری کا حکم دیا تھا جس پر انتہا پسند مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سکے پر نہ صرف برج افلاک کے جانوروں کی تصاویر کندہ تھیں بلکہ ہونٹوں سے جام شراب لگائے ہوئے شاہ کی تصویر بھی تھی۔ غیاث بیگ حیران تھا کہ نہ جانے اس بار شہنشاہ کو کیا سوجھی ہو۔"

آصف خاں نے خاموشی کے ساتھ اپنی کمر سے ایک ریشمی بٹوہ کھولا اور اس میں سے سونے کا ایک نیا سکہ نکالا' جس پر دو سرکندہ تھے۔ غیاث بیگ نے اطمینان اور حیرت کا سانس لیا۔ سکے پر شہنشاہ کے ساتھ اس کی اپنی بیٹی کی تصویر نقش تھی اور پشت پر یہ شعر کندہ تھا!

بہ حکم شاہ جہاں گیر یافت صد زیور
بہ نام نور جہاں بادشاہ بیگم زر'

ہے نا خوبصورت؟ آصف خاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا یہ معجزہ نہیں کہ ہمارے

خاندان کی ایک لڑکی : مہرو کی شبیہہ ملکہ کے روپ میں پیش کی جائے۔

"مہرو کی شبیہہ!"

جیسا کہ بیٹے نے کہا تھا یہ فی الواقع معجزہ تھا۔ پردہ نشین ملکہ کا چہرہ ایک ایسی چیز پر نقش تھا جو عوام کے ہاتھوں سے گزرنے والی تھی۔ غیاث بیگ اسی لمحے سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس چیز کا خیال کس کے دل میں پیدا ہوا؟ جہانگیر کے؟ یا نور محل کے؟ یقیناً ٹکسال کو سکہ ڈھالنے کا حکم تو جہانگیر ہی نے دیا ہو گا لیکن اس کی خواہش کس کے دل میں پیدا ہوئی؟

آصف خاں نے شیرینی کی طشتری ایک طرف رکھ دی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابا جان! اب ہماری کامیابیاں نقطہ عروج کو پہنچ چکی ہیں ـــــ میری بہن کو شاہی فرامین پر دستخط کرنے کا حق پہلے ہی سے حاصل ہے اور وہ دربار عام میں نقاب ڈال کر ظل اللہ کے عقب میں بیٹھتی ہیں' اگر میری اور آپ کی طرح انہیں بھی کوئی منصب عطا کیا جا سکتا' تو وہ تیس ہزاری سے کم نہ ہوتا ـــــ اور شہزادہ خرم کے بعد یہ سب سے بڑا منصب تھا!

لیکن باہر کے لوگ کیا کہتے ہیں؟ نئے سکے کے متعلق چہ مے گوئیاں تو ضرور شروع ہو گئی ہوں گی؟ غیاث بیگ نے پوچھا۔

"بعض لوگ ہنستے ہیں جو یقیناً اچھی بات نہیں لیکن وہ کہہ کیا سکتے ہیں؟ یہ بات تو ایک ادنیٰ خاکروب بھی جانتا ہے کہ جہانگیر ایک کھوکھلا ستون ہے' جو آپ کی بیٹی کے سہارے قائم ہے!"

"اللہ معاف کرے!" بوڑھے وزیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ خدا نہ کرے کہ یہ باتیں کسی اور تک پہنچیں' تم کیا کہہ رہے ہو! شہنشاہ غازی جہانگیر ہماری جانوں کا مالک اور اکبر اعظم کا بیٹا ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولو! یہاں تک کہ خواب میں بھی ..... لیکن وہ لوگ کون ہیں' جو ہنستے ہیں۔"

کوہستانی علاقوں کے کچھ امیر اور نظر بند رانا کے بیٹے کے راجپوت حاشیہ نشین! یہ کہتے وقت آصف خاں کی نگاہیں اس عبارت پر جم گئیں' جو کتب خانے کی دیوار پر خندہ تھی۔

"فذوقوا ما کنتم تکنزون۔" اس نے ایک خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔" آپ تو نہیں! ہاں اکبر کا بیٹا ضرور ان سے لطف اٹھائے گا۔"

"اس میں کیا شک ہے؟" غیاث بیگ نے فوراً جواب دیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد

کہنے لگا۔ "اچھا اب میں زیادہ باتیں نہیں کر سکتا' میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

آصف خاں کی اکھڑ طبیعت غیاث بیگ کی محتاط اور عیارانہ چالوں سے بالکل لگا نہ کھاتی تھی۔ یقیناً توشہ خانے کے نوجوان اور خوش طبع داروغہ : آصف خاں میں وزیراعظم بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں لیکن اس نے پر تکلف ضیافتوں کے سوا کسی بات کی کبھی خواہش ظاہر نہ کی۔ جب وہ چلا گیا اور اپنے پیچھے کمرے میں بوئے مشک چھوڑ گیا تو غیاث بیگ دیر تک نئے طلائی سکے کو اپنی انگلیوں میں الٹتا پلٹتا رہا۔

یہ معجزہ ہی تو تھا! چالیس سال قبل اس کے پاس صرف تین مویشی تھے۔ مہرو کی پیدائش کے وقت اس نے گڑگڑا کر قافلے والوں سے ٹھہرنے کی درخواست کی تھی۔ پھر اس کی ماں کو بے پردگی سے بچانے کے لئے اسے اونٹ کے پالان کا کپڑا کھولنا پڑا تھا۔ لیکن اب اس کے پاس لاکھوں روپیہ' ہزاروں اونٹ اور ..... دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔۔۔۔!

اس نے چوبدار کو بھیج کر خزانے سے ایک خاص کشتی منگوائی' جو زمردوں اور مختلف قسم کے نادر و نایاب جواہرات سے لبریز تھی۔ کچھ دیر تک وہ ان جواہرات کے رنگ کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا اور یہ سوچتا کہ ان بڑے نگینوں کو مزید ترشوا لیا جائے' تو ان کی چمک میں اضافہ ہو جائے گا لیکن اس دوران میں بھی وہ اپنی بیٹی کا خیال ذہن سے نکال نہ سکا۔

غیاث بیگ اس وقت کابل کا خزانچی تھا جب مہرالنساء نے آٹھ برس کی عمر میں پہلی بار نقاب اوڑھی۔ وہ اپنی گڑیاں اور کھلونے لے کر باغ میں اس کے پاس آ بیٹھی تھی جہاں وہ دن بھر کام میں مصروف رہتا تھا۔ وہ غیاث بیگ کے دیئے ہوئے تانبے کے سکے پہچان کر اپنی نازک اور حسین انگلیوں سے جلد جلد گنتی۔ اسی باغ میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ بیٹھ کر اسے لوگوں کے اخلاق و کردار کو سمجھنے کا شعور حاصل ہوا۔

گذشتہ چھ سال سے غیاث بیگ ہر کام میں اپنی بیٹی کی روشن دماغی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ اس زبردست قوت فیصلہ اور مشکل مسائل کی تہ تک پہنچ جانے کی غیر معمولی صلاحیتوں پر حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

وہ ہمیشہ عجلت اور بے صبری سے فیصلے صادر کرتی اور کبھی کبھی غیاث بیگ سوچنے لگتا : ہو سکتا ہے کہ عورت کی ذہانت' رسم و رواج میں جکڑے ہوئے اور لکیر کے فقیر انسانوں سے مات کھا جائے! لیکن ایسا سوچنا بے سود تھا۔ نور محل کی شدت احساس نے اب تک

اسے ہر مشکل پر غالب رکھا تھا۔ تاہم اس کا اقتدار کسی ٹھوس بنیاد پر نہیں' بلکہ اس کے حسن و جمال اور اثر و رسوخ پر قائم تھا جو وہ جہانگیر کے مزاج میں رکھتی تھی۔

سونے سے پہلے غیاث بیگ نے بیٹی کے نام ایک خط لکھا' جو صرف فارسی کے اس ایک شعر پر مشتمل تھا۔

ندانی مگر سکہ زر ناب
زر شک و حسادت شود ہم چو آب

ایک عام شخص کے لئے یہ الفاظ کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے لیکن نور محل کے لئے ایک کھلی ہوئی تنبیہہ تھے۔ ایک ہفتے کے اندر غیاث بیگ کو خط کا جواب مل گیا۔

ایک باریک اور معطر کاغذ کے پرزے پر بڑے حسین رسم الخط میں یہ مصرع لکھا تھا :۔

"بندہ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم!"(۱۱)

غیاث بیگ بیٹی کے اس حسن ذوق پر خوش ہوا لیکن اسے یہ محسوس کر کے بڑی تکلیف ہوئی کہ اس نے باپ کی نصیحت پر کان نہیں دھرا۔ وہ جس محبت کی پجارن تھی وہ یقیناً جہانگیر ہی کے لئے تھی لیکن بہتر فرقوں کے ذکر کا بظاہر غیاث بیگ کی نصیحت سے کوئی تعلق نظر نہ آتا تھا۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ان کے بہتر فرقوں میں سے صرف ایک ناجی ہے۔ نور محل نے دشمنوں اور حاسدوں کو گمراہ فرقوں سے تعبیر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ان کی چالوں سے واقف ہے۔ اس مصرع سے دراصل وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے جہانگیر کی محبت کے سوا کوئی شے درکار نہیں۔

ادھر غیاث بیگ برسات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا' ادھر اس نے جاسوسوں کے ذریعے سے بازاروں' سراؤں اور مسجدوں میں لوگوں کی باتیں سننے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہ لوگ طرح طرح کی کہانیاں لے کر واپس آتے عوام کو نور محل کے اقتدار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ بعض لوگ کھل کر اس کا ذکر کر لیتے تھے لیکن نابینا شہزادہ خسرو کے ساتھی برملا یہ شکایت کرتے کہ نور محل شہزادہ خرم کی طرف داری کر رہی ہے جسے بادشاہ نے خسرو کا نگراں مقرر کیا تھا۔ چند ملا بھی مذہبی جوش میں دیوانے ہو کر فتوے دے رہے تھے کہ اب اس سرزمین پر ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت آئے گی کیونکہ یہاں عورت کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس دم دار ستارے کا چرچا تھا جو کچھ دن ہوئے افق پر نمودار ہوا

تھا۔

متواتر آٹھ راتوں تک زمین سے ایک روشنی بلند ہو کر آسمان پر نیزے کی شکل اختیار کرتی رہی جس کی ایک لمبی دم بھی ہوتی تھی ---- ہر رات یہ روشنی پہلے دن کے مقابلے میں جلد طلوع ہوتی اور ساری رات ستاروں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی پو پھٹتے غائب ہو جاتی۔ نجومیوں کا قول تھا کہ یہ دم دار ستارے بادشاہوں کے زوال کی نشانی ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت حال خدا ہی بہتر جانتا ہے جو عالم الغیب ہے۔

بے فکرے اس شگون کو نور محل کے عروج سے وابستہ کر دیتے کیونکہ آج تک ہندوستان کی تاریخ میں کسی عورت کو اتنا اقتدار حاصل نہ ہوا تھا' نہ کسی دوسرے اسلامی ملک ہی میں کسی پردہ نشین خاتون کو یہ مرتبہ ملا تھا۔ چنانچہ نور محل بے کار اور بے فکرے لوگوں کے لئے روز بروز اہم ترین موضوع بنتی گئی لیکن اس ساری بحث میں اضطراب یا بے چینی سے زیادہ تجسس کو دخل ہوتا تھا اور سب اس بات پر متفق تھے کہ یہ دس سال' جو نور محل سے شادی کے بعد گزرے ہیں' جہانگیر کے عہد حکومت کا زریں ترین دور ہیں اور اس اثنا میں عام خوشحالی اور امن و امان میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

لیکن غیاث بیگ ان باتوں سے مطمئن نہ تھا۔ وہ بازار کی خوش گپیوں میں کسی خطرے کے آثار نہ دیکھ سکا اور بظاہر ہر چیز بڑی مبارک نظر آتی تھی۔ شاید یہ سکون ہی اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ آنے والے طوفان کی صداؤں پر کان دھرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کا جی کام کرنے کو نہ چاہتا اس لئے وہ بیشتر وقت دفتر کے بجائے اپنے جواہرات کی کشتیوں کے معائنے میں گزارتا تھا یہاں تک کہ ایک روز اس نے شاہی لشکر سے جا ملنے کا فیصلہ کیا جو کشمیر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

نور محل بھی لشکر کے ساتھ تھی۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ آگرہ سے کشمیر تک لشکر کی رہنمائی کرتی رہتی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد جہانگیر کو طاعون زدہ علاقوں سے دور رکھنا ہوتا تھا لیکن دراصل وہ اسے شہروں کے شور اور ہنگاموں سے نکال کر آزادانہ نقل و حرکت اور سیر و شکار میں مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

غیاث بیگ نے رخت سفر باندھنے کا حکم دیا اور جلد جلد منزلیں مارتا ہوا مرکب جہانگیری کے عقبی دستوں سے جا ملا جو اب پہاڑ کی ترائی میں خیمہ زن تھا۔ وہاں اس نے بیٹی کو ایک بارہ دری والے باغ کی تعمیر کی نگرانی میں مصروف پایا اور وہ دونوں اکٹھے خیمے میں

پہنچے۔

تنہائی میسر آتے ہی غیاث بیگ نے کہا۔ "مہرو! کیا تم بھول گئیں کہ آرزوؤں کی آگ کو مصلحت کی راکھ سے ڈھانپ دینا چاہئے؟"

نورمحل خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

غیاث بیگ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آگرہ میں نئے سکے کا بڑا چرچا ہے۔ ملا اور مذہبی دیوانے ان شہد کی مکھیوں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہیں۔ جن کے چھتے کو چھیڑ دیا گیا ہو' اور اب انہوں نے ہر شخص کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ جس ملک میں عورت کا راج ہو اس پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔"

"نیا سکہ میرے سرتاج کی خواہش سے جاری کیا گیا ہے" نورمحل نے سادگی سے جواب دیا "اور مجھ میں اتنی قدرت نہیں کہ لوگوں کی زبان بند کر سکوں۔"

غیاث بیگ نے آہستگی سے سر ہلایا۔ بیٹی سے بحث کرنا اس کے لئے انتہائی دشوار تھا۔ وہ حق بات کہنے سے گریز نہ کرتی خواہ دوسرا کتنا ہی برا مانے۔ اس نے سفری صندوقچے سے چند کاغذات نکالے جن کی تحریر بڑی گنجان تھی اور انہیں خاموشی سے نورمحل کے حوالے کر دیا۔ وہ بڑی تیزی سے کاغذات پڑھنے لگی اور غیاث بیگ اس کی نگاہوں کی برق رفتار جنبشوں کو تکتا رہا۔

"یہ میری ساری جائیداد کی فہرست ہے ---- وہ مختصر سی پونجی' جو خدائے بزرگ و برتر نے مجھ حقیر انسان کو عطا کی" غیاث بیگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "عام لوگ میری جائیداد کا جو اندازہ کرتے ہیں۔ یہ اس سے کہیں زیادہ ہے اور میں نے اسے ایک خاص مقصد کے تحت محفوظ رکھا ہے۔"

"واقعی یہ بہت زیادہ ہے۔"

بوڑھا ایرانی یوں مسکرایا جیسے اسے خراج تحسین ادا کیا گیا ہو۔ "الحمد للہ! کہ یہ سب' کچھ تمہارے لئے ہے۔"

"نورمحل کو اس پر مطلق تعجب نہ ہوا۔ وہ اپنے باپ کے ارادوں سے آگاہ تھی۔"

"لیکن کیسے؟"

غیاث بیگ نے بڑے سکون سے اپنے تمام منصوبے اس کے سامنے اگل دیئے۔ نورمحل کے پاس پہلے ہی ضرورت سے کہیں زیادہ دولت موجود تھی۔ اگر اس کی زمینوں اور

خزانوں کا اندازہ کیا جاتا تو وہ ایشیا کی امیر ترین عورت ثابت ہوتی۔ اس کے مادی وسائل بڑے بڑے امرا حتیٰ کہ شہزادہ خرم سے بھی زیادہ وسیع تھے اور اگر وہ جہانگیر سے درخواست کرتی تو وہ بڑی خوشی سے اس کے باپ کی ساری جائیداد اسے بخش دیتا' کیونکہ شاہانہ تحائف دینے میں اسے خاص طور پر مسرت ہوتی تھی۔ جہاں تک غیاث بیگ کی جائیداد کا تعلق تھا۔ شاہی عمال اس کی حقیقی مالیت کے نصف کا بھی اندازہ نہ کر سکتے تھے۔ دراصل نور محل کے سوا کسی کو پوری جائیداد کی تفصیلات بتانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔۔۔!

نور محل نے اگرچہ بڑے دھیمے لہجے میں باپ کا شکریہ ادا کیا تاہم وہ دوسرے امکانات پر غور کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اچانک مسکرائی اور اس نے بڑے پرجوش انداز میں کہا "پھر تو مجھے نشان شاہی رکھنے اور میرے طبل برداروں کو شہزادہ خرم کے سوا تمام شہزادوں کے آگے آگے رہنے کا حق مل جائے گا۔"

"معاذ اللہ!" وہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "کیا تمہیں کبھی عقل نہ آئے گی کہ اس طرح طاقت و قوت کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے۔ کسی کو اپنے چہرے سے جذبات پڑھنے کا موقع نہ دو۔"

لیکن نور محل بدستور مسکراتی رہی۔ "کیا انہوں نے میرا چہرہ اتنا پڑھ لیا ہے کہ ابا جان مجھے ملامت کر رہے ہیں؟ یقیناً میں بہت کچھ سیکھ چکی ہوں۔ خیر' چھوڑیئے! آیئے! آپ کو دکھاؤں کہ آج میں نے کیا دریافت کیا ہے؟"

وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے چلا لیکن یہ سوچتا ہوا کہ اس کی لاکھوں کی جائیداد نے نور محل کے دل میں ہلچل کیوں نہیں مچائی؟ اور جب وہ کانٹوں کی ایک باڑ کے قریب پہنچا تو اور بھی حیران رہ گیا۔

یہاں اس نے جھونپڑیوں کے درمیان' جن پر سفیدی کی ہوئی تھی' ایک عمر رسیدہ انسان کو دیکھا۔ قریب ہی ایک اور موٹا تازہ آدمی بیٹھا تھا جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑی میں پرندے ہی پرندے تھے۔ کچھ اڈوں پر' کچھ پنجروں میں۔ کوئل سے لے کر کبوتر تک سبھی ان میں شامل تھے۔ لیکن تمام کے پٹیاں بندھی تھیں۔

"یہ پنجراپول ہے۔ پرندوں کا شفاخانہ!" نور محل نے بتایا ---- "فرخ ان سب کی تیمارداری کرتا ہے حتیٰ کہ وہ تندرست ہو جاتے ہیں' اور پھر انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے بوڑھے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "فرخ! ذرا دیوان صاحب کو چوہے

لا کر دکھاؤ!" سفید ریش فرخ خاموشی سے اٹھ کر ایک پٹجرہ اٹھا لایا جس میں روئی بچھی ہوئی تھی اور قریباً نصف درجن سفید چوہے تھے۔

یہ سب "یتیم" ہیں۔ فرخ نے اعلان کیا۔ "ان کی ماں مر چکی ہے۔ کیا غریب نواز دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں غذا کس طرح دی جاتی ہے؟"

جب غیاث بیگ نے اخلاقاً" سر ہلایا تو فرخ دودھ سے بھرا ہوا ایک پیالہ اور ایک سفید پر لے آیا۔ اس نے پر کو دودھ میں ڈبویا اور باری باری ہر چوہے کے منہ میں چند قطرے ٹپکائے۔ نور محل یہ سب کچھ بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

"ہمارے پاس بعض بے ماں کے بچھڑے بھی ہیں" فرخ نے بتایا "اس کے علاوہ ہم زخمی گایوں کی تیمارداری بھی کرتے ہیں۔"

دیوان نے اس سے پوچھا "تمہارے اس نائب کے ہاتھ کیسے ضائع ہو گئے؟"

"اس نے چوری کی تھی جس کی سزا میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔ چنانچہ اب نہ یہ کھانا کھا سکتا ہے نہ روزی کمانے کے قابل ہے۔ البتہ اپنے بازوؤں سے بچھڑوں کو اٹھا لیتا ہے اور پانی بھی بھرتا ہے۔" فرخ نے بتایا۔

"خدائے رحیم تمہیں اس کی جزا دے گا" غیاث بیگ نے کہا۔ اس نے انگلی سے چاندی کی ایک انگوٹھی اتاری جس میں یاقوت جڑا ہوا تھا اور فرخ کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میری طرف سے یہ انعام قبول کرو۔"

نور محل متوقع نگاہوں سے دونوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ فرخ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور اس نے دبی زبان سے کہا۔ "خدا سخی کا بھلا کرے۔ لیکن غریب نواز! ہمیں روپے پیسے کی ضرورت نہیں' اس شفا خانے پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ باقی رہا کھانا پینا تو اس کا بندوبست ملکہ عالم کی مہربانی سے ہو جاتا ہے۔"

جب وہ احاطے سے باہر نکلے تو ایرانی نے اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مہرو! کیا تمہاری ذمہ داریاں پہلے ہی کچھ کم ہیں کہ تم نے پرندوں کا شفاخانہ کھول لیا ہے؟"

"یہ تو تفریح طبع کے لئے ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "میں روپے پیسے کے جنجال سے اکتا کر ایک آدھ گھنٹے کے لئے یہاں آ جاتی ہوں۔"

"لیکن تمہیں روپے پیسے کی کیا فکر ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا "تمہارے پاس تو

زبرجد سے لدے ہوئے اونٹوں کا ایک قافلہ منگوانے کے اختیارات بھی ہیں۔"

"پھر بھی میں چوہوں کو کھاتے پیتے دیکھنا پسند کرتی ہوں۔" نور محل نے کہا۔ "لیکن ابا جان! کیا آپ کے دل میں کبھی خراسان واپس جانے کا خیال بھی آیا؟ بس دو ہم' دو اونٹ اور ایک ارسلان!"

"بیٹی! اب خدا کے فضل سے وہ بادہ پیمائی کا زمانہ گزر چکا۔" غیاث بیگ نے چاندی کی انگوٹھی چھینگلی میں دوبارہ پہنتے ہوئے کہا "اور اب کبھی واپس نہ آئے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے!"

تاہم نور محل کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی جس نے غیاث بیگ کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیا۔

"کیا تم نے سمرقند کی نیلگوں پہاڑیوں کی طرف جانے والی سڑک کبھی نہیں دیکھی؟ آخر میرے آباؤ اجداد کی سرزمین تمہارے دماغ میں اتنی کیوں رچی ہوئی ہے۔"

"شاید اس لئے کہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو سن لو کہ وہ دیوتاؤں کی اس سرزمین سے ہرگز خوبصورت نہیں" اس نے شمالی افق کے اس پار ابھرتی ہوئی دھندلی پہاڑیوں کی جانب اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "مہرو! کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ تم کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں شالامار باغ کی جھیل کے کنارے لطف و آرام کے دن گزارو گی!"

"شالامار! ہاں پہاڑ کی لطیف آب و ہوا سے میرے آقا کو فائدہ پہنچے گا۔ ابا جان! آپ بھی تو کمزور ہو چکے ہیں۔ آپ کو آگرہ واپس نہ جانا چاہئے۔ ہمارے ساتھ ہی چلئے! اور وہیں اپنے عملے کو بھی بلا لیجئے!"

غیاث بیگ نے سر ہلایا "لیکن ابھی تو کچھ عرصہ مجھے یہیں آرام کرنا ہے میں تھک گیا ہوں اور شاید ---- "تمہارے پرندوں کا معالج سلطنت کے ایک وزیر کے لئے نیند کا کوئی نسخہ تجویز کر سکے!"

وہ پائیں باغ میں سنگ مرمر کے ایک نئی شہ نشین پر بیٹھے حافظ کے شعر پر بحث کر رہے تھے کہ خواجہ سرا عنبر دوڑتا ہوا آیا۔ نور محل کے اشارے پر اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ شاہی حرم سرا کی ایک خبر لایا ہے نور محل اسے لے کر اپنی آرام گاہ میں چلی گئی ---- وہاں کی خنک فضا میں بیٹھ کر اس نے بتایا کہ جہاں پناہ نے پرتھوی کو ---- جو

کسی زمانے میں بادشاہ کی منظور نظر رہ چکی ہے "دار موت" کی سزا دی ہے۔ نور محل کے منہ سے بے اختیار نکلا ---- "پرتھوی کو پھانسی کی سزا دی جا رہی ہے اور مجھے علم تک نہیں؟"

"علیا حضرت! یہ واقعہ عین طلوع آفتاب کے وقت ہوا" عنبر نے بتایا۔ "بنگالی خواجہ سرا رام بھاؤ کو حاضری کا حکم ملا۔ کسی نے شکایت کی تھی کہ اس نے کل رات پرتھوی کو اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا۔ ہائے جب جوتوں سے اس کی مرمت کی گئی تو اس نے روتے روتے اپنا قصور مان لیا۔ اس پر جہاں پناہ نے فیصلہ صادر کر دیا۔ اسی جھگڑے میں اعلیٰ حضرت کو قیلولہ کرنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ رام بھاؤ بہت برا نکلا۔ وہ نمک حرام تھا۔ پاجی!

"انہیں سزا کس طرح دی جائے گی؟"

"غروب آفتاب کے وقت پرتھوی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا اور خواجہ سرا کو کتوں کے آگے ڈال دیا جائے گا۔ وہ واقعی اس کا مستحق تھا۔"

"بس! خاموش!"

نور محل خواجہ سرا کی خوشامدانہ باتوں سے اکتا گئی تھی۔ دراصل حبشی خواجہ سرا کا خیال تھا کہ پرتھوی اور اس کے حامی نور محل کے دشمن ہیں اس لئے ان کی پھانسی کی خبر سن کر وہ خوش ہو گی اس طرح اس کی راہ کے تمام کانٹے دور ہو جائیں گے۔ لیکن نور محل کو شاہی حرم کی ان عورتوں کا خیال آ رہا تھا جو قصوروار ہوتے ہوئے بھی محض اس لئے سزا سے محفوظ تھیں کہ ان پر اب تک کوئی الزام نہیں لگایا گیا تھا۔

شاہی حرم کے واقعات شاذ و نادر ہی اس کی چار دیواری سے نکلتے اس کے باوجود آگرہ اور یہاں لشکر گاہ میں جہانگیر کی کم و بیش اکیس بیویاں جمع تھیں۔ پچھلے کئی برس سے، نور محل کے سوا چند ہی بیگمات تھیں، جن کے پاس جہانگیر گیا تھا۔ اسے کسی مطربہ یا نئی کنیز میں شاذ ہی کشش محسوس ہوتی۔ اس کے حرم میں سینکڑوں خواصیں اور کنیزیں موجود تھیں لیکن ان میں چند ہی اتنی خوش قسمت ہوتی تھیں کہ بادشاہ کی چشم توجہ کو اپنے غیر معمولی حسن یا گلے کے رس سے اپنی طرف کھینچ سکیں۔ عام طور پر یہ ان درباریوں کو بخش دی جاتی تھیں جنہیں شہنشاہ خاص طور پر نوازنا چاہتا۔ اسے وہ آرمینی لڑکی اب تک نہ بھولی تھی جس کی شادی اس انگریز سے کرنے پر جہاں گیر کو بہت اصرار تھا، جو پہلی بار دربار میں حاضر

ہوا تھا لیکن شاہی حرم کی اکثر خواتین کو مرد کا چہرہ دیکھنا شاید ہی کبھی نصیب ہوتا۔ البتہ دربار خاص چلمن کے پیچھے یا سفر کے وقت پالکی کے پردوں میں سے کسی مرد پر نگاہ کا پڑ جانا اور بات ہے۔

شاید مردوں کی قربت ان عورتوں کی قسمت ہی میں نہ لکھی تھی!

حرم سرا کی بعض ہندو بیگمات رات کو افیون کھانے کی عادی تھیں اور نور محل' جو حرم کی سربراہ تھی' یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ ان میں سے بعض دلیر یا بزدل عورتیں چوری چھپے مردوں سے ملتی ہیں لیکن ان میں سے فرار کوئی بھی نہ ہوتی کیونکہ فرار ہونا ناممکن تھا۔ اگر کوئی شخص انہیں پناہ دیتا یا ان سے باتیں کرتے پکڑا جاتا تو وہ ان کے جرم میں برابر کا شریک ہوتا۔

آخری دس سال میں نورجہاں کو زیادہ گھناؤنی خبریں ملیں جن میں لڑکیوں کے باہم معاشقے اور معمر حرموں سے نوجوان خادماؤں کے خلط ملط ہونے کی داستانیں تھیں۔

نور محل کو یہ بھی علم تھا کہ بعض عورتیں خواجہ سراؤں کو بغیر کسی ظاہری وجہ کے بڑی بڑی رقمیں اور جواہرات دیتی ہیں۔ نور محل حسن و رعنائی کے بعض ایسے مجسموں کو بھی جانتی تھی جن کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کا بظاہر ایک ہی مقصد نظر آتا تھا۔ چاہنا اور چاہے جانا ـــــ لیکن وہ اپنی پیاس بجھانے کی خاطر نوجوان اور ڈیل ڈول والے خواجہ سراؤں کے پیچھے ماری ماری پھرتی تھیں۔ یہ خواجہ سرا اپنی اس مانگ پر خوش بھی ہوتے تھے اور ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں دونوں دونوں ہاتھوں سے لوٹتے بھی تھے ایک دفعہ نور محل کو ایک افریقی خواجہ سرا کے قتل کا حکم دینا پڑا جس نے ایک لڑکی کو اپنی طرف ملتفت پا کر اس سے روپیہ بٹورنا شروع کر دیا تھا۔

پرتھوی کے بارے میں نور محل کا خیال تھا کہ جہانگیر گزشتہ پانچ سال سے کبھی اس کے پاس گیا ہے نہ اسے اس نے کوئی تحفہ دیا ہے اور آج یہ حسین رقاصہ رام بھاؤ کے ساتھ غروب آفتاب کے وقت موت کے گھاٹ اترنے والی تھی۔

"ملکہ عالم!" عنبر نے جو دیر سے اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے کہا "کیا یہ انصاف نہیں؟ پرتھوی ایک کمینی اور بے شرم عورت ہے' کیا آپ کو اس کا سالن میں دھتورا ڈالنا یاد نہیں؟ کیا اس شام اس کی کنیز ہمارے مطبخ میں نہیں آئی تھی؟ اس نے ملکہ عالم سے ملاقات کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔"

"کیا وہ اب بھی مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ہاں ---- لیکن آپ کو کیا پڑی ہے؟ سرکنڈوں میں آگ لگی ہو تو شیر کو نہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔"

"مجھے اس کے کمرے میں لے چلو۔ جاؤ اطلاع کرو۔"

نور محل نے اس وقت کپڑے بدلنے یا بناؤ سنگار کرنے کی کوشش نہ کی۔ تھوڑی دیر عنبر کے پیچھے پیچھے چلنے کے بعد جب اس نے اپنی بھاری نقاب الٹی' تو اپنے آپ کو پرتھوی کی خواب گاہ کے سامنے کھڑا پایا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے تھے اور اندر چاندی کی کارنسوں پر شمعیں روشن تھیں۔ خود پرتھوی ایک بہت بڑے شیر کی کھال پر خاموشی سے نیم دراز تھی۔ اس کے دونوں طرف مشک میں سے ریشمیں تکیے رکھے تھے' پانچ سال قبل وہ جہانگیر کی چہیتی تھی لیکن اب ..... اس کی صراحی دار گردن کے خطوط گہرے اور نمایاں ہو گئے تھے اور اس کے رسیلے اور مترنم لب بھدے اور بے جان نظر آتے تھے۔ چست ساڑھی کے اندر اس کی چھاتیاں بے ڈول نظر آ رہی تھیں اور زلفیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عرصے سے منت پذیر شانہ نہیں ہوئیں۔ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے نور محل کو تکنے لگی۔

"ہمیں تنہا چھوڑ دو" نور محل نے عنبر کو حکم دیا۔

لیکن بوڑھے حبشی کی کھلی آنکھوں سے نافرمانی ٹپک رہی تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس کی کمر میں بندھے ہوئے خنجر کا دستہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر اس کی کھال بھی کھینچ لی جائے تو بھی وہ نور محل کو دشمن کی دسترس میں اکیلا چھوڑ کر نہ جائے گا۔

"پیچھے کھڑے رہو پردے کے پاس۔" نور محل نے جھنجلا کر کہا۔

اس پر وہ رضامند ہو گیا اور پردوں سے ایک گز کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی اس کی پشت میں خنجر نہ بھونک دے۔ وہ ہندو رقاصہ کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"ملکہ عالم کی خدمت میں سلام! پرتھوی نے گلوگرفتہ آواز میں کہا "کل جب آپ غسل کے لئے جا رہی ہوں گی اور آپ کے بدن پر حسب معمول سورج کی زندگی بخش شعاعیں پڑ رہی ہوں گی تو آپ کی یہ کنیز سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو گی اور کسی

زبان پر اس کا نام تک نہ ہو گا۔"

نور محل خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ پرتھوی اس سے جہانگیر کی خدمت میں سفارش کی استدعا کرے گی لیکن اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ معاملہ براہ راست جہانگیر کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ اسی وقت اپنا فیصلہ صادر بھی کر چکا تھا۔ اب رقاصہ یا خواجہ سرا کی معافی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش بیٹھی پرتھوی کی خواہش معلوم کرنے کا انتظار کرتی رہی۔

پرتھوی کی آنکھوں میں، جن کی چمک افیون نوشی کے باعث ماند پڑ چکی تھی، حسد و رقابت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ اس کے مقابلے میں نور محل حسن و جوانی کا ایک نادر شاہکار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اب بھی اتنی ہی حسین، اتنی ہی نازک اور اتنی ہی سروقد تھی جتنی جہانگیر کے حرم میں داخل ہوتے وقت نظر آتی تھی۔ صرف اس کے ہونٹوں کے خطوط اور ابروؤں کے خم پر کسی قدر سیاہی جھلکنے لگی تھی۔

"تم پہلے کیا تھیں؟" پرتھوی نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا "---- فتح پور کی ایک معمولی چھوکری!"

نور محل اب بھی خاموش رہی ---- وہ پرتھوی سے اور بہت کچھ سننے کی توقع رکھتی تھی۔

"یقیناً دیوتا تمہاری اب تک رکھشا کرتے رہے ہیں۔ تم ایک بیوہ تھیں اور تم نے اپنے پنچ ذات شوہر کے کالے کلوٹے خون کو چھپانے کے لئے اپنے جسم پر سفید لباس لاد رکھا تھا۔ میں جانتی ہوں اسے تم سے شادی کرنے کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔"

عنبر کا سانس، سسکاریاں بن کر نکلنے لگا۔ لیکن نور محل مسکراتی رہی۔ جیسے اسے پرتھوی کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔

"ہاں ہاں، میں وہی ہوں اور تمہارے زہر دینے کے بعد بھی زندہ ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے پرتھوی کی نگاہیں شرمیلی لڑکی کی طرح جھک گئیں لیکن فوراً ہی اس نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔

"شو جی کی سوگند! میرے لئے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کون پہلے موت کا بھوگ اٹھاتا ہے لیکن نور محل بیگم! تم سے پہلے میں نے ایک اور ہستی کو بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا، یقیناً تم مریم کو بھولی تو نہ ہو گی جو کبھی تمہاری منظور نظر اور

تمہاری "شب گردیوں" کی محرم راز تھی۔ میں اسے بہلا پھسلا کر تمہارے خیمے سے باہر لے آئی۔ پھر ہم نے پانی کے ذریعے اسے شدید اذیت پہنچائی' جو اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اس لئے میں نے اسے دھتورا کھلا دیا اور اس زہر کا بھی جسم پر کوئی نشان باقی نہیں رہتا لیکن تم ابھی تک زندہ ہو اور تم میں ذرا بھی تغیر نہیں آیا۔"

"ہماری بیگم کے حق میں اچھا ہی ہوا" عنبر نے پردے کے پیچھے سے کہا۔

"ناپاک عورت! کیا تم نے جہاں پناہ کو یہ فرماتے نہیں سنا کہ ملکہ عالم سے پہلے اعلیٰ حضرت شادی کی لذتوں سے آشنا ہی نہ ہوئے تھے؟"

"خاموش!" نور محل نے چیخ کر کہا اور بوڑھے خواجہ سرا نے اپنی زبان کو قفل لگا دیا۔ لیکن پرتھوی نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

"اے ہے! وہ خوب جانتا ہے ..... خوب جانتا ہے کہ شاہی فرمانوں پر اب کس کے دستخط ہوتے ہیں اور نئے سکوں کے نمونے کون تیار کرتا ہے؟ بھگوان کرے یہ ہاتھ جھڑ جائیں اگرچہ طاعون نے انہیں چھوا تک نہیں۔"

"علیا حضرت! آیئے! چلیں" عنبر نے تنگ آ کر کہا "یہ لو گالیاں بک رہی ہے۔"

"خدا کرے تجھے ایسے ڈراؤنے خواب آئیں کہ تو رات کو سو بھی نہ سکے" رقاصہ چلاتی رہی۔ "تجھ پر گیش اور ہنومان کا قہر نازل ہو۔ تجھے کبھی چین نہ آئے تیری آرزوؤں کا خون ہوتا رہے۔ تیری بچی بے اولاد مرے اور اسے کوئی ایسی بیماری چمٹے جو طاعون سے بھی اذیت ناک ہو۔ تو بوڑھی ہو جائے اور ایک ایک پیسے کو محتاج رہے تیری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے!"

"خدا نہ کرے کبھی ایسا ہو" عنبر بڑبڑایا۔ اس کا ہاتھ اپنے خنجر پر تھا۔

"حتیٰ کہ تیرے پاؤں مڑ جائیں----"

"نوج! جو ایسا ہو----"

"تجھے وہ روگ لگیں کہ تیری بوٹی بوٹی گل جائے جس طرح گیدڑ کی لاش چیلیں نوچتی ہیں اور تیرے لئے اپنے مقبرے کے سوا کوئی دروازہ کھلا نہ رہے۔"

"ملکہ عالیہ! چلئے۔"

غم اور غصے کی شدت سے پرتھوی کا دم ٹوٹ گیا اور وہ مضمحل ہو کر شیر کی کھال پر گر پڑی اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

"میں نے تمہاری بددعائیں سن لی ہیں۔" نور محل کی صاف آواز نے اسے یقین دلایا "ابھی کچھ اور کہنا ہے!"

لیکن پرتھوی ان دونوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی شیو کی مورتی کی طرف رینگنے لگی۔ اس نے مورتی کے سامنے زمین پر سر پٹک پٹک کر واویلا مچائی۔ اس کے منہ سے ایک ایسی زبان میں بددعائیں نکل رہی تھیں جو نور محل نہ سمجھ سکی۔

"نٹ راجہ" کی مورتی اپنے چھ بازو پھیلائے ایڑیوں کے بل کھڑی تھی۔ جیسے ان تینوں انسانوں کو بیک وقت بلا بھی رہی ہے اور دھتکار بھی رہی ہے۔ اس کے کا کے لبوں پر حسین بلاوے کی ایک عجیب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

نور محل جانتی تھی کہ یہ مورتی اس رقاص کی ہے جو زندگی اور موت دونوں کا بلاوا دیتا ہے لیکن نہ جانے نور محل کو اس وقت اس سے نسبت سی کیوں ہونے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آہ و بکا کرنے والی عورت پر اس مورتی نے ظلم و شیطنت کا سایہ ڈال رکھا ہے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہو۔" نور محل نے پرتھوی سے پوچھا۔

سیاہ بالوں والے سرنے، جو پسینے میں شرابور تھا، تھکے ہوئے انداز میں نفی کے طور پر جنبش کی۔

"بس! ان سے کہہ دو کہ دیر نہ کریں۔"

ان تمام باتوں کے باوجود جونہی ایرانی بیگم رخصت ہوئی رقاصہ نے تالی بجائی جس پر ایک خوفزدہ کنیز اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"لکھو" اس نے حکم دیا دکن میں شہزادہ خرم کے نام پرتھوی رقاصہ کا سلام پہنچے۔ میں مر رہی ہوں۔ خدا تمہیں زندہ و سلامت رکھے۔ کسی زمانے میں تم، میں اور ایرانی عورت، شہنشاہ کے دل میں بستے تھے لیکن اب مجھے موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ دیکھنا کہیں اس کے بعد تمہاری باری نہ آ جائے۔"

پرتھوی نے خط پڑھ کر لفافے میں بند کیا اور اس پر اپنی انگشتری سے مہر لگا دی۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اسے کسی تیز رفتار ہرکارے کے ذریعے سے شہزادے تک پہنچا دیا جائے وہ جانتی تھی کہ یہ مکتوب خرم کے محتاط دماغ میں شبہ کی کوئی نہ کوئی لہر ضرور پیدا کر دے

گا۔

اس ساری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر بغور اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور خواص کو سنگار کرنے کا حکم دیا ---- خواص نے پرتھوی کو اس کے تمام دل پسند جواہرات سے لاد دیا ---- غالباً وہ موت کے دیوتا کے سامنے اپنی تمام تر رعنائیوں اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

اس رات' غروب آفتاب کے بہت دیر بعد ---- جب نماز عشاء بھی پڑھی جاچکی تھی ---- نور محل اپنی خواب گاہ میں شال اوڑھے لیٹی تھی۔ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت جلد کی کتاب تھی۔ قریب ہی ایک فانوس روشن تھا۔ کتاب دراصل تزک جہانگیری کا مسودہ تھا' جس کے سرورق پر جہانگیر کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی اور اسی لئے یہ کتاب اس نے نور محل کو بھجوا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رات کو آکر جہانگیر اس کے متعلق مختلف سوالات کرے گا اس لئے اس کا فرض ہے کہ کتاب اچھی طرح پڑھ لے اور اس کے ہر سوال کا جواب دینے کے لئے تیار رہے۔ اس نے تمام صفحات پر متجسسانہ نظر ڈالی۔

> احمد آباد میں سانپ کھانے والے دو نر بکرے ہمراہ تھے چوں کہ مادہ سرکار میں نہ تھی کہ جفت کراتے' جی میں آئی عربستان کی بربری بکری کے ساتھ جفت کرا کے دیکھیں کہ اس کا بچہ کس شکل و شمائل کا پیدا ہوتا ہے۔
>
> سات بربری بکریاں اس سے جفت کرائیں۔ چھ مہینے کے بعد ان میں سے ہر ایک نے فتح پور میں ایک ایک بچہ دیا۔ چار مادہ اور تین نر۔ نہایت خوش نما خوش رنگ اور خوش ترکیب۔ ان میں جو نر بکرے سے مشابہت و مناسبت رکھتا ہے۔ سمند کی مانند اس کی پشت پر سیاہ لکیریں ہیں۔ سرخ رنگ والا بھی دوسرے رنگ والوں سے زیادہ خوش رنگ اور خوش تر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اصالت دوسروں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی شوخیاں' خوش ادائیاں اور اچھل کود کی کیفیت کیا بیان کی جائے۔ چند ادائیں دیکھ کر ہی دل بے

اختیار اس طرف کھنچنے لگتا ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ مصور بکری کے بچے کی اٹھکیلیوں کی بخوبی تصویر کشی نہیں کر سکتا' اس جگہ صادق ہے۔ اگر کبھی کسی ایک ادا کی تصویر کھینچ بھی لے' تو دوسری اٹھکیلیں' طرح طرح کی جست و خیز اور شوخیوں کی تصویر کشی میں بلاشبہ اسے اپنے عجز کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اس کے باوجود جس شخص نے یہ یادداشت قلمبند کی تھی۔ اس نے اسی دن ایک ایسی عورت کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا جس نے کبھی اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا تھا۔ ایک ایسے جسم کو ہلاک کر دینا جس نے کبھی اسے شعر کہنے پر مجبور کیا تھا ---- ایک ایسی زندگی کا جزو لاینفک رہی تھی۔ پھر اسے محسوس بھی نہ کرنا ..... نور محل نے جلد جلد ورق پلٹے' لیکن جب اس نے احمد آباد میں جہانگیر کی بیماری کا ذکر پڑھا تو اس کی نگاہ رک گئی۔

ہرچند (اطباء) ماش کا شوربا اور چاول کھانے کو کہتے تھے اور اس باب میں مبالغہ کرتے تھے۔ لیکن میں نے قبول نہ کیا جب سے میں سن تمیز کو پہنچا ہوں۔ یاد نہیں! کبھی میں نے یہ کھانا کھایا ہو۔ امید ہے : آئندہ بھی اس کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ صبح کو بھی طبیعت غذا کی طرف راغب نہ ہوئی تین دن اور دو راتیں فاقے سے گزریں۔

نور محل نے سوچا : جہانگیر نے ابھی شراب نہیں چھوڑی۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا' کہ جہاں گیر کی علالت نے اسے اس شہر سے برگشتہ کر دیا ہے :۔

اس سے پہلے ہم نے احمد آباد کو گرد آباد کہا تھا۔ اب اس کا سموستان نام رکھیں یا اسے بیمارستان' یا زقوم زار یا جہنم آباد کہیں کہ یہ تمام صفات اس میں موجود ہیں۔

جہانگیر کو نئے نئے نام رکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کشمیر جانے والی شاہراہ پر تمام تالابوں اور باغوں کے نام بدل دیئے تھے۔ نور محل یہ سوچ کر حیران رہ جاتی کہ اگر وہ شہنشاہ نہ ہوتا تو کیا کرتا ----؟ یقیناً وہ سارا دن جانوروں اور پودوں کے مطالعے میں لگا رہتا قدرت کے سربستہ راز کھولتا اور رات کو مسلسل ضیافتوں میں اپنے ہم مشربوں سے خوش گپیوں میں مصروف رہتا۔ یہ پھر تصویریں بنایا کرتا اور ان کا موازنہ اپنے مصوروں کے شاہ

کاروں سے کرتا ..... اچانک اس کی نگاہیں کتاب کے اس صفحے پر جم کر رہ گئیں جس میں جہانگیر نے ایک آسمانی شگون کا ذکر کیا تھا۔

پرگنہ جالندھر کے ایک موضع میں صبح کے وقت مشرق کی طرف ایک ایسا خوفناک دھماکا ہوا کہ قریب تھا اس صدائے وحشت افزا کے ہول سے لوگوں کی جان نکل جاتی اس شور و شغب کے دوران میں ایک روشنی اوپر سے زمین پر گری اور لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ ایک لحظہ کے بعد جب وہ دھماکا ختم اور دلوں سے ہول و سراسیمگی کا اثر زائل ہوا' ایک تیز رفتار قاصد' پرگنہ مذکور کے عامل' محمد سعید کے پاس دوڑایا گیا کہ اس سانحہ کی حقیقت معلوم کریں۔ وہ اسی لمحہ سوار ہو کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ زمین کے اس قطعہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دس بارہ گز زمین عرض و طول میں اس طرح جل گئی تھی کہ سبزہ اور گھاس کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ اور ہنوز زمین تپی ہوئی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ جلے ہوئے حصہ زمین کو کھودا جائے۔ جتنی زمین کھودی جاتی تھی۔ حرارت اور تپش بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جلے ہوئے لوہے کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ یہ اس قدر گرم تھا: گویا تندور سے نکالا گیا ہے۔ کچھ وقت کے بعد جب وہ سرد ہو گیا' تو (عامل مذکور) اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور ایک خریطہ میں رکھ کر سربمہر مابدولت کی خدمت میں ارسال کیا۔ میں نے حکم دیا کہ حضور شاہی میں اس کا وزن کریں۔ ایک سو اسی (۱۸۰) تولے نکلا۔ استاد داؤد کو حکم ہوا کہ ایک تلوار' ایک خنجر اور ایک چھری تیار کر کے ہمارے ملاحظہ میں پیش کیا جائے۔ عرض کی کہ تپک کے نیچے نہیں ٹھہرتا اور ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ میں نے فرمایا ایسی صورت میں دوسرا لوہا شامل کیا جائے۔ میرے ارشاد کے مطابق عمل کیا گیا۔ تین حصے آہن برق میں ایک حصہ دوسرا لوہا ملا کر دو تلواریں' ایک چھری اور ایک خنجر تیار کیا گیا' اور حضور میں پیش ہوا ..... مابدولت

نے فرمایا : ہمارے حضور میں آزمایا جائے۔ بڑی اچھی کاٹ تھی
اصیل تلواروں کے برابر۔

اس طرح جب ہندوستان بھر کے نجومی "آتشیں نیزے" کے ظہور کے بعد اس عجیب و غریب آسمانی شگون کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے میں مصروف تھے' جہانگیر نے اس سے ایک تلوار' ایک خنجر اور ایک چاقو بنوا لیا تھا۔ وہ لکھے پڑھے لوگوں کی نسبت بہت کم توہم پرست تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ حافظ شیرازی کے دیوان سے فال لے لیا کرتا۔ اور اس کے نتائج بھی حاشئے پر لکھ لیا کرتا۔ اسے مذہب سے زیادہ لگاؤ نہ تھا تاہم وہ نماز بڑی باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ جب اس کے دربار میں پنڈتوں اور ملاؤں کے درمیان کسی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی تو اس نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا تھا "بتاؤ کھانے پینے اور من مانی کرنے کی سب سے زیادہ آزادی کس مذہب میں ہے؟" اس پر دونوں مذہبوں کے علمبرداروں نے کہا عیسائیت میں! ..... نورمحل نے دیکھا کہ تزک جہانگیری کے آخری صفحات میں اس کا اپنا نام بار بار آتا ہے۔

جشن دسہرہ کے دن کشمیر میں' میں نے اپنے اندر گرفتگی نفس اور سانس کی کوتاہی کا اثر محسوس کیا۔ مجملاً بارش کی کثرت اور ہوا کی رطوبت سے سانس کی نالی میں' بائیں جانب' دل کے قریب گرانی و گرفتگی ظاہر ہوئی اور آہستہ آہستہ شدت اختیار کر گئی ..... چندے مناسب گرم دواؤں سے تدبیر کی گئی۔ بظاہر تھوڑا سا افاقہ ہوا۔ جب اس بلند جگہ سے نکلا' پھر مرض نے شدت پکڑ لی۔ اس مرتبہ چند دن بکری کا دودھ اور اس کے بعد اونٹنی کا دودھ استعمال کیا۔ لیکن اصل مرض پر ان دونوں میں سے کوئی مؤثر نہ ہوا ..... مجبوراً سب سے ہاتھ اٹھا کر اور ظاہری تدبیروں سے دل کا رشتہ توڑ کے اپنے تئیں حکیم علی الاطلاق کے سپرد کر دیا۔ چوں کہ نشہ جام سے تخفیف ہوتی تھی۔ ضابطہ اور معمول کے خلاف دن کو بھی شراب پینے لگا۔ رفتہ رفتہ مے نوشی میں افراط پیدا ہو گئی۔ اور ہوا گرم ہونے پر اس کا اثر محسوس ہوا۔ کمزوری اور تکلیف بڑھ گئی۔ نورجہاں بیگم نے جن کی تدبیر اور تجربہ ان طبیبوں سے بہتر ہے۔ خاص طور پر اس لئے

کہ اس میں مہربانی و دل سوزی شامل ہوتی ہے۔ شراب کم کرائی اور وہ تدبیریں عمل میں لائیں، جو وقت اور حالت کے مناسب تھیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی طبیب جو علاج معالجہ کر رہے تھے، وہ انہی کی صلاح و صوابدید سے کر رہے تھے۔ لیکن اب میں نے صرف انہی کی مہربانی پر مدار رکھا۔ شراب آہستہ آہستہ کم کر دی نامناسب چیزوں اور ناموافق غذاؤں سے پرہیز رکھتا ہوں امید ہے کہ حکیم حقیقی شفاخانہ غیب سے صحت کامل عطا فرمائے گا۔

جہانگیر کسی معاملے میں سنجیدہ نہ تھا۔ تاہم اسے اپنی صحت اور شکار کا بڑا خیال رہتا تھا۔ شہنشاہ ہند ہونے کے باوجود اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ کاروبار سلطنت وہ معمول کے مطابق سرانجام دیتا اور جب اس سے اکتا جاتا تو اپنا وقت جانوروں کی دیکھ بھال، تالیف و تصنیف اور نور محل کے ساتھ بسر کرتا۔

نور محل نے کتاب ایک طرف رکھی اور مقفل صندوق میں سے ایک لپٹا ہوا کاغذ نکالا جسے پہلے بھی وہ کئی بار پڑھ چکی تھی۔ یہ ایک خط کی نقل تھی جسے جہانگیر نے اس سے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

یہ خط مہابت خاں نے لکھا تھا نور محل جب اسے پڑھتی تو ٹہلتے اور مناسب الفاظ کی تلاش میں اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بلند قامت سردار کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ شائستہ تحریر مہابت خاں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے لکھا تھا:

"پادشاہ غازی! عمرت دراز باد ---- دو دوستوں کے درمیان"

میں غیر ضروری تکلفات کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا۔ جہاں پناہ اور میں اوائل عمر ہی سے ہمرکاب رہے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ میں ان کا جاں نثار غلام ہوں۔ اور ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔ کیا میں شہنشاہ اکبر کے زمانے میں "باز" تھا کہ اب جہانگیر کے عہد میں مجھ سے "کووں" سے بدتر سلوک کیا جا رہا ہے؟ کیا میں بیس برس سے شاہی دربار کا نمک خوار نہیں ہوں؟ لیکن اس کے باوجود مجھے میری مرضی کے خلاف دربار سے دور بھیج دیا گیا ہے اور اب میں نے سنا ہے کہ آج کل شاہی دربار اور سلطنت پر جہاں پناہ کی ایک بیگم کی

حکومت ہے' سلطنت کے اعلیٰ حکام بڑھانکتے ہیں کہ وہ اسی کے غلام ہیں ---- خدا کی قسم! میرے لئے یہ حیرت انگیز ہی نہیں ناقابل یقین بھی ہے۔ مجھے بڑے بڑے علما و فضلاء نے بتایا ہے کہ تاریخ میں اس سے قبل آج تک کسی عورت نے کسی حکمران پر اتنا اثر و نفوذ حاصل نہیں کیا ..... اگر سرچشمہ اقتدار ہی گدلا ہو جائے۔ تو اس سے پھوٹنے والی سوتوں کا کیا حشر ہو گا؟ مستقبل میں لوگ جہاں پناہ کے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے ایک عورت کو اس طرح ڈھیل دے رکھی ہے؟ عورت تو اس ملک کو گوبر کا اپلا بنا کر محض تماشا دیکھنے کے لئے نذر آتش ہی کرے گی ..... جہاں پناہ! یہ فراموش نہ فرمائیں کہ وہ اکبر کے بیٹے ہیں اور ان کے قدموں کے نیچے تیمور کا تخت ہے۔ انہیں تمام اختیارات خود سنبھالنے چاہئیں اور ان لوگوں کے آگے سرخرو ہونا چاہئے جو ان سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ان کی اور سلطنت مغلیہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں جہاں پناہ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف منعطف کرانی چاہتا ہوں۔ میں نے حکم عالی سے شہزادہ خسرو کی آنکھوں میں آتشیں سلائیاں پھیر دینے کا حکم دے دیا تھا۔ اب میری درخواست ہے کہ نابینا شہزادے کو خرم کی قید سے آزاد کر دیا جائے کیونکہ سلطنت کے امن اور خود جہاں پناہ کی جان کی سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے بعد تخت شاہی کے ایک سے زائد وارث ہوں۔ جہاں پناہ خسرو کی حفاظت کے احکام بھی صادر فرمائیں' تو بہتر ہو گا۔"

نور محل نے خط لپیٹ کر رکھا' تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اپنے کو ہستانی علاقے میں بسیرا کرنے والے شہبازوں کی طرح خونخوار اور چاق و چوبند..... اور اپنے بدن پر پہنی ہوئی زرہ بکتر کی طرح صاف' سیدھا اور دیانت دار! وہ اسے کتنی اچھی طرح جانتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ آج سے کئی برس پہلے وہ ایک احدی نوجوان کا بھیس بدل کر اس کے خیمے میں گئی تھی اور اس نے سردار کو اپنے متعلق باتیں کرتے سن لیا تھا تو وہ اسے کتنی حیرت ہو!

مہابت خاں نے خسرو کے بارے میں بڑا صحیح اور دانش مندانہ مشورہ دیا تھا۔ نور محل جانتی تھی کہ جہانگیر نے اس کا خط موصول ہونے کے دوسرے ہی دن نابینا شہزادے کو خرم کے پاس سے بلوا لینے کے احکام صادر کر دیئے تھے ---- اور خط پڑھنے کے تین چار روز بعد تک خود اس سے بھی کچھ کھچا کھچا سا رہا تھا' لیکن پھر یہ سب کچھ بھول گیا۔ البتہ نور محل کے ذہن کے گوشوں میں اس خط کا ایک ایک لفظ محفوظ تھا۔ وہ دیر تک نرم اور ریشمی گدوں پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ آخر اس نے ہاتھ بڑھایا اور روشنی گل کر دی ---- لیکن شمع بجھانے اور تاریکی میں ٹٹولتے رہنے سے کیا فائدہ تھا؟ اس کی خواہیں ٹانگیں سکیڑے دور لیٹی تھیں۔ اور بیداری کی تکلیف سے کراہنے والی عورتوں کی آوازیں نور محل کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

باہر ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے اڑنے والی خاک قناتوں سے ٹکرا رہی تھی' اتنے میں ایک بلی کی آواز سنائی دی۔ نور محل نے تکیے سے سر اٹھایا اور چیتے کی آواز پہچان گئی' یہ پرتھوی کا پالتو چیتا تھا اور اندھیرے میں اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد چیتا چلا گیا اور ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ اس کی مسہری کے ریشمی پردوں پر دستک دینے لگے۔ اس نے تاریکی میں انجانے ہاتھوں کو اپنی جانب بڑھتے محسوس کیا۔ آہستہ آہستہ ان ہاتھوں نے اسے آدبوچا اور ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

اگر وہ ان ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے بیمار باپ کے ساتھ کسی ایسے گوشے میں چلی جائے جہاں تنہائی ہو' جہاں چہروں کی قطاریں اسے نہ گھوریں اور جہاں اسے کوئی ڈراؤنی آواز نہ سنائی دے! ..... پرتھوی نے کہا تھا کہ وہ خالی ہاتھ کئی سال تک زندہ رہے گی۔ لیکن اب تو وہ تہی دست نہیں----!

صبح جب سورج کی اولین کرنیں شامیانے کے بالائی حصہ میں در آئیں تو نور محل سو رہی تھی اور دور چیتا مسلسل چیخ رہا تھا۔

اگلے چند دن تک نور محل نے ایسی ایسی پرتکلف ضیافتوں کا اہتمام کیا خود جہانگیر بھی دنگ رہ گیا۔ ایک رات اس نے لشکر کے تمام بڑے بڑے امیروں کو ایک مصنوعی باغ میں کھانے پر بلایا جہاں جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے خوش گلو موسیقار ایسے سروں میں نغمہ سرا تھے کہ معلوم ہوتا تھا واقعی پرندے چہک رہے ہیں' قریب ہی ایک آبشار نے طلسمی سماں باندھ رکھا تھا۔ اس موقع پر نور محل نے پینتالیس سرداروں کو خلعت

سے سرفراز کیا اور انہیں بیش قیمت جواہرات بھی تحفے میں دیئے۔

دوسرے دن وہ جہانگیر کے ساتھ قلعہ کانگڑہ دیکھنے گئی جو نیا نیا فتح ہوا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑیوں کے درمیان یہ قلعہ مضبوطی اور استحکام کا نادر نمونہ تھا اور بظاہر اس کی تسخیر ناممکن نظر آتی تھی لیکن مغلوں کے جری لشکر نے اس ناممکن کو بھی ممکن سے بدل دیا تھا اس لئے اس کے معائنے کے وقت جہانگیر کا سینہ فخر و غرور کے جذبات سے معمور تھا۔ اس نے جنگلی مرغوں کا شکار کیا اور انہیں اپنے سامنے ذبح کرا کے پکانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ آس پاس کے مندروں کو دیکھنے چلا گیا جن میں سادھو آلتی پالتی مارے گیان دھیان میں مصروف تھے۔ ان میں سے بعض نے اپنے بازو اس طرح اٹھا رکھے تھے جیسے وہ فولاد کے بنے ہوں اور بعض سورج کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ وہ "تزک جہانگیری" میں لکھتا ہے:

> اور سرب باسیوں میں بھی کئی گروہ ہیں۔ ان میں سے ایک قسم یہ ہے، جسے موتی کہتے ہیں۔ (یعنی بالکل مردہ) کہ ہر کام میں اختیار اپنا چھوڑ دیتے ہیں اور بندہ تسلیم ہو جاتے ہیں۔ زبان سے ہرگز نہیں بولتے۔ اگر دس روز تک ایک جگہ کھڑے رہیں تو قدم آگے یا پیچھے نہیں ہٹاتے۔ غرضیکہ اپنے اختیار سے کچھ حرکت نہیں کرتے اور مثل پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ جب اسے میرے حضور میں پیش کیا گیا اور اس کے حال کی تحقیق کی گئی تو میں نے اس میں ایک عجیب استقامت اور مضبوطی پائی۔ دل میں آئی! شاید یہ مستی میں بولے یا کچھ حرکت کرے۔ چنانچہ شراب دو آتشہ کے چند پیالے اسے پلوائے، لیکن اس کے حال میں سرمو فرق نہ ہوا۔ اور اسی طرح رہا، یہاں تک کہ مردوں کی طرح بے ہوش ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا لے گئے۔ حق تعالیٰ نے بڑا فضل کیا کہ اس کی جان کو کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ القصہ اپنے مرتبے میں عجیب و غریب استقامت رکھتا تھا۔

لشکر آہستہ آہستہ کشمیر کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں کی جانب بڑھتا رہا۔ لیکن غیاث بیگ پرندوں کے شفاخانے ہی میں ٹھہر گیا۔ وہ سخت بیمار تھا اور نور محل اس سے رخصت ہوتے وقت بڑی آزردہ نظر آ رہی تھی۔

ابھی لشکر گھوم کر پہلے درہ ہی سے گزر رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی' غیاث بیگ کی حالت نازک ہے۔ اس نے جہانگیر سے کہا کہ وہ فوراً واپس جانا چاہتی ہے جہانگیر بھی اس کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ اس واقعے کا ذکر بھی اس نے اپنی تزک میں ان الفاظ میں کیا ہے :۔

چوں کہ کانگڑہ اور اس کے پہاڑوں کی سیر ہمیشہ سے منظور نظر تھی۔ اس لئے بڑے لشکر کو وہیں چھوڑ کر میں مصاحبوں اور خدمت گاروں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کو گیا اور اعتمادالدولہ کو' اس کی بیماری کے سبب لشکر میں چھوڑ گیا۔ صادق خاں میر بخشی کو اس کی تیمارداری اور لشکر کی حفاظت پر مقرر کیا۔ دوسرے دن اعتمادالدولہ کا حال تنگ سن کر اور نورجہاں بیگم کی پریشانی کی بناء پر' بے اختیار لشکر میں لوٹ آیا۔ اور شام ہوتے اسے دیکھنے گیا۔ نزع کا وقت تھا کبھی ہوشیار ہو جاتا' کبھی بے ہوش۔ نورجہاں بیگم نے میری طرف اشارا کر کے اس سے پوچھا : پہچانتے ہو؟ ایسی حالت میں بھی جواباً انوری کا یہ شعر پڑھا۔

آں کہ نابینائے مادر زاد اگر حاضر شود
درچنیں آرائش عالم بہ بیند مہتری

دو گھڑی میں اس کے پاس رہا' جب ہوش میں آتا' تو عمدہ اور سمجھ کی باتیں کرتا۔ غرض اس مہینے کی سترہویں رات کو اس نے انتقال کیا۔ میں کیا کہوں کہ اس واقعہ سے مجھ پر کیا گزری۔ وزیر عاقل و کامل اور مصاحب دانائے مہربان تھا۔

از شمار دو چشم یک تن کم
در حساب خود ہزاراں بیش

باوجودیکہ اتنی بڑی سلطنت کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا اور انسان کے امکان و مقدور میں نہیں ہے کہ وہ دخل و تصرف کی زندگی میں ہر ایک کو اپنے سے راضی رکھ سکے۔ لیکن کوئی نہیں' جو اعتمادالدولہ کے پاس اپنی غرض لے کر گیا ہو اور وہاں سے ناراض

پھرا ہو۔ میرے خیرخواہوں کو خوش دل اور حاجت مندوں کو بامراد رکھتا تھا۔

..... دوسرے دن میں اس کے عزیزوں اور فرزندوں کی پرسش کو گیا۔ اس کے عزیز و اقارب میں سے اکتالیس آدمیوں اور اس کے نوکروں میں سے بارہ شخصوں کو سروپا دے کر ماتمی لباس اتروایا اور دوسرے روز کوچ کرکے قلعہ کانگڑہ کی طرف گیا۔

بوڑھے کی موت نے جہانگیر کے دل میں شفقت اور رحم کے جذبات بیدار کر دیئے۔ چنانچہ اس نے نہ صرف آگرہ میں غیاث بیگ کی تجہیز و تدفین کا انتظام کرنے میں نور محل کا ہاتھ بٹایا بلکہ سنگ مرمر کا ایک مقبرہ بھی تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر جب لشکر نے کشمیر کی سمت دوبارہ کوچ کیا تو وہ زیادہ سے زیادہ وقت نور محل کے پہلو میں گزارنے کی کوشش کرتا جو ہاتھی کی پشت پر رکھے ہوئے ایک بلورین تخت پر بیٹھی ہوتی۔ جہانگیر نے اس سارے عرصے میں اس سے غیاث بیگ کے مقبرے کی تعمیری تفصیلات یا اس کے جانشین کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔

اب وہ ایک خشک دریا کے طاس سے گزر رہے تھے تپتی جھلستی کنکریوں سے گرم گرم بھپکے نکل رہے تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر سیاہ چٹانیں آتشیں دیوار بنی کھڑی تھیں۔ اگرچہ کنیزیں برابر مور چھل کر رہی تھیں، لیکن بے جان ہوا میں نام کو خنکی پیدا نہ ہوتی تھی ---- نور محل جہانگیر کے پہلو میں خاموش لیٹی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ نور محل کی آنکھوں نے اس کے دل کو موہ لیا ہے اور اس کے مرمریں جسم کی رنگت اتنی شفاف ہے کہ اس میں اور نور محل کے سفید ریشمی لباس میں کوئی تمیز نہیں کی جا سکتی۔

نور محل کی خاموشی سے متاثر ہو کر جہاں گیر نے کہا! "جان من! کل ہم ان سرسبز و شاداب پہاڑیوں کی آغوش میں ہوں گے جہاں ہمیں کوہستانی چشموں کا تازہ اور شیریں پانی پینے کو ملے گا اور تم شالامار میں آرام کر سکو گی۔"

نور محل نے مسکرا کر سر اٹھایا اور حسین پلکوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ جہانگیر اس کی اس ادا سے ہمیشہ محظوظ ہوتا تھا۔

اس نے اس بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "آج صبح ہم نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دیوان حافظؒ سے فال نکالی اور جانتی ہو جب ہم نے آنکھ کھولی تو ہماری انگلی کے نیچے کیا

تھا؟"

"میں نے صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے سرتاج اسے پڑھ کر ضرور خوش ہوئے ہیں!" نور محل نے سادگی سے جواب دیا:

"یقیناً وہ بہت نیک فال تھی" جہانگیر نے کہا۔ حافظ کہتا ہے:۔

از صدائے سخن عشق ندیدم خوش تر
یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند'

یہ بات اس موقع پر کتنی صادق آتی ہے' جب ہم ان خوبصورت باغوں کی طرف جا رہے ہیں' جہاں ہم دونوں نے زندگی کے بہترین لمحات بسر کئے ہیں۔ ہمارا یہ سفر ہمیں جنت کی ایک جھلک دکھائے گا۔"

اس وقت جہانگیر پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو چکی تھی وہ سوچنے لگا اگر اس وقت شعر کہا جائے' تو وہ بہترین شعر ہو گا۔

اس نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد پھر کہا۔ "لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب تم ہمارے پہلو میں ہوتی ہو تو ہمارے لئے کشمیر کے پہاڑ اور دھوپ سے جھلسے ہوئے میدان یکساں ہو جاتے ہیں۔۔۔۔؟ نور محل! تم جانتی ہو کہ تمہارے بغیر ہم اپنی زندگی میں کتنا بڑا خلا محسوس کرتے ہیں؟"

نور محل نے کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کی نرم و نازک انگلیوں نے جہانگیر کا ہاتھ تھام لیا اور پیار بھرے انداز میں اسے سہلانے لگیں۔

جہانگیر نے ایک عجیب کیفیت سے متاثر ہو کر کہا: "شیخو بابا کے سوا تمہارا اب کوئی نہیں۔ تمہارے والد کا سوگ ہم دونوں منائیں گے اور یہ ہم دونوں کے درمیان ایک نیا رشتہ ہو گا۔"

"اس سے زیادہ ہمیں کیا چاہئے! لیکن سوچنا یہ ہے کہ ابا جان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔"

"اثنائے سفر میں یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟"

شادی کے دس سال بعد بھی وہ اسے حیرت میں ڈال سکتا تھا!

اس کا مطلب یہ تھا کہ دو مہینے تک اس کے نزدیک سلطنت کو کسی وزیر یا دیوان کی

ضرورت نہ تھی۔

غیاث بیگ کی علالت کے آخری ایام میں نظم و نسق پہلے ہی درہم برہم ہو چکا تھا اور کئی ماتحت افسروں کے آپس میں لڑنے بھڑنے کی اطلاعیں بھی موصول ہوئی تھیں۔ اس لئے انتظام کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے فوری طور پر کسی ذمہ دار شخص کا تقرر ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نور محل کو یقین تھا جہانگیر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کسی مستعد اور آزمودہ کار شخص کو غیاث بیگ کا جانشین نامزد کر دے گا جو اسی کی سی وفاداری اور دل سوزی کے ساتھ ان دونوں ---- جہانگیر اور نورجہاں ---- کی خدمت بجا لائے گا۔

لیکن جب اس نے اصرار کیا تو جہانگیر جذباتی ہو گیا اور اس نے بے سوچے سمجھے بہت سے نام گنوا دئے۔ نور محل خاموشی سے سنتی رہی اور اس دوران میں اس نے بھی ذہن میں ان آدمیوں کی ایک فہرست تیار کر لی جو اس کے خیال میں اس عہدے کے لئے موزوں سمجھے جا سکتے تھے۔ ان میں خان جہاں لودھی کا نام سرفہرست تھا۔ اس کی دیانت داری میں تو کسی کو شبہہ نہ تھا لیکن خون کے رشتے سے وہ جہانگیر کی بجائے جنوبی ہند کے حکمرانوں سے زیادہ قریب تھا دوسرا نام موٹا راجہ تھا جو ایک بوڑھا' بھاری بھرکم اور معزز راجپوت تھا۔ لیکن اس پر بھی نازک زمانے میں بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا! کاش شیخ فرید یا اکبر کا کوئی اور مصاحب زندہ ہوتا۔ اسے سرسری طور پر اپنے بھائی آصف خاں کا خیال آیا۔ جس کا جہانگیر سے قریبی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آصف خاں ظاہری شان و شوکت کا دلدادہ اور بزدل ہے۔ اور حیرت کی بات ہے کہ اس نے کبھی اپنے باپ کی جگہ لینے کی خواہش بھی ظاہر نہ کی تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟" جہانگیر نے نیم غنودگی کے عالم میں دریافت کیا۔ اگر خدا غیاث بیگ کی جگہ مجھے کسی ایرانی ہی کو مقرر کرنے کی توفیق عطا فرمائے!"

لیکن اس وقت تک نور محل اپنا فیصلہ دے چکی تھی ---- اس کی چشم انتخاب نے کسی کو بھی اس اعزاز کا مستحق نہ سمجھا تھا ---- چنانچہ اس نے جہانگیر کی طرف پر اشتیاق نظروں سے دیکھتے ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا:

"خدا نے آپ کو توفیق دے رکھی ہے۔ شیخو بابا! ایک ایرانی موجود ہے!"

"وہ کون ہے؟"

"آپ کی یہ کنیز!"

جہانگیر ایک دم چونک اٹھا۔ "تم؟ تم نے سوچا بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مہرو! کیا سلطنت مغلیہ کی دیوان ایک عورت ہو گی؟"

"ہاں! جہاں پناہ!" نور محل نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا' اس طرح کہ پاس کھڑی ہوئی کنیزوں کو بھی یہ محسوس نہ ہو سکا کہ اس نقرئی ہنسی میں اس نے کس ادائے دلبری سے کام لیا ہے۔

ذرا سوچئے تو! آپ نے پہلے ہی ابا جان کی ساری دولت اور جائداد مجھے بخش دی ہے ---- اگر میں ان کے مال و متاع کی وارث ہوں تو ان کے فرائض کا وارث بھی مجھی کو بننا چاہئے۔ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ میں سال ہا سال ان کا ہاتھ بٹاتی رہی ہوں ---- ہم غریب لوگ تھے' اور ہمیں صرف ظل سبحانی کی محبت اور عنایتوں کے سبب یہ رتبہ حاصل ہوا۔"

جہانگیر سوچ میں پڑ گیا اور نور محل نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ ساری باتیں اس کے ذہن نشین کرا دیں اس نے بتایا کہ وہ خزانے کے دوسرے عہدہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ بہرحال میں آخری فیصلے کا حق شہنشاہ ہی کے ہاتھوں میں رہے گا۔ دیوان کا کام تو صرف یہ ہو گا کہ وہ جہاں پناہ کی مرضی کے مطابق احکام جاری کر دیا کرے۔ اس کے علاوہ نظم و نسق کا سارا بوجھ صادق خان جیسے ماتحتوں اور عہدے داروں کے شانوں پر رہے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خزانے سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ البتہ شاہی مہر اس کے پاس رہے گی اور تمام ضروری کاغذات اس کی نظروں سے گزرنے کے بعد جہانگیر کے حضور میں پیش ہوا کریں۔

اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ بولی! "اس طرح ہم دونوں کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہ ہو گا۔"

جہاں تک مجلس مشاورت کا تعلق ہے میں سب کی بحث سنوں گی اور اعلیٰ حضرت کو کسی قسم کی تکلیف دیئے بغیر فیصلہ کر دیا کروں گی" اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ یہ سب کچھ پہلے ہی سے کر رہی ہے۔

جہانگیر بول اٹھا! "واقعی تم میرے لئے خدا کا بہترین عطیہ ہو.....

وہ سمجھ گیا تھا کہ نور محل کیا چاہتی ہے۔ اسے گوارا نہ تھا کہ جہانگیر غیاث بیگ اور نور محل کے اتحاد کے بعد کوئی غیر شخص دیوانی کے منصب پر فائز ہو۔ اس کے علاوہ جس

وقت جہانگیر چاہے' نور محل کے بجائے کسی اور کو دیوان مقرر کر سکتا ہے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر گزشتہ کئی سال سے ملک میں خوش حالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس لئے نئے دیوان کی ذمہ داریاں چنداں دشوار نہ ہوں گی۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال لینے کے بعد جہانگیر نے نور محل کی رائے سے اتفاق کرلیا اور وہ انکار کرتا بھی کیسے ---- نور محل رزم و بزم میں اس کی آٹھوں پہر کی جلیس و دمباز تھی----! وہ ضیافتوں اور سیر و شکار میں اس کے پہلو بہ پہلو رہتی۔

"لیکن مہابت خان کیا سوچے گا؟" نور محل نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے اچانک اس قہر مجسم سردار کے آتشیں خط کا خیال آگیا تھا۔

"کون' وہ افغان؟" جہانگیر نے بے نیازی سے کہا۔ پھر دفعتہ" لہجہ بدل کر بولا۔ "یقیناً اسے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"بجا فرمایا جہاں پناہ!" اس نے اچانک نگاہیں ہٹالیں اور جہانگیر نے اس کے رخساروں میں ایک عجیب سا خم پیدا ہوتے دیکھا۔"

"خسرو کے متعلق کوئی اطلاع ملی جہاں پناہ؟"

"شہزادہ کی؟" جہانگیر نے پھر پہلی سی بے نیازی سے جواب دیا۔ "ہمارا خیال ہے کہ وہ ہمارے پاس زیادہ محفوظ رہے گا۔ اس لئے ہم نے خرم کو حکم بھیج دیا ہے کہ وہ اسے آزاد شہریوں کے سے عزت و احترام کے ساتھ ہماری خدمت میں روانہ کر دے۔"

"وہ اب کہاں ہے؟" نور محل نے پوچھا۔

"آگرہ کے قریب پہنچ چکا ہو گا۔ ہمیں یقین ہے' وہ سلام کے لئے یہاں بھی آئے گا۔"

جہانگیر نے مضطرب ہو کر کروٹ بدلی۔ اور بہ مشکل سانس لیتے ہوئے کہا "کیا ہم نے فرائض کے بارے میں خاصی باتیں نہیں کر لیں؟ تم نے سری نگر میں جھیل کے کنارے جشن منانے کا کیا اہتمام کیا ہے۔"

☆☆☆

(۵)

لشکر آہستہ آہستہ درے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ رستے میں جب اچانک طوفان بادو باراں اٹھتا' تو ایسا محسوس ہوتا جیسے پیٹھ پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ جب قافلہ پہاڑوں میں سے چکر کھا کے گزرا تو جہانگیر کی نگاہ چٹانوں میں شور مچاتی ہوئی ایک آبشار پر پڑی۔ اسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ وہیں ٹھہر گیا اور حکم دیا کہ آبشار کے نیچے "نشاط محل" تعمیر کیا جائے۔ ہاتھیوں اور اونٹوں کو یہیں چھوڑ دیا گیا اور گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہو کر سب لوگ ان پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگے جو گرمی سے جھلس چکے تھے اور وہ دیو قامت دیو داروں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جو جنگل کے جھاڑ جھنکار سے غذا حاصل کرتے ہیں۔

درے سے آگے کشمیر کے سرسبز و شاداب مرغزار شروع ہو گئے۔ دو برفانی چوٹیوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ اب شاہی لشکر ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا جہاں تمازت اور گرد و غبار کا نام و نشان تک نہ تھا اور جہاں سڑک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے درخت پہرہ دے رہے تھے۔

جہانگیر کی طرح نور محل کو بھی کشمیر کے ہرے بھرے کھیت ہمیشہ اطمینان و سکون کا پیغام دیتے تھے۔ وہ ہندوستان کو پیچھے چھوڑ آئی تھی اور گرد و پیش کے نظر فریب باغوں نے اسے تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز سے بے خبر کر دیا تھا۔ وہ ایک بل کھاتے ہوئے دریا کے کنارے جس پر دس ہزار فٹ بلند پہاڑ کے ارغوانی سائے مچل رہے تھے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ اس وقت سورج کی کرنوں میں سنہری اور کہربائی رنگ جھلکنے لگا تھا۔

کچھ عرصے تک وہ سری نگر کی سیر کرتے رہے۔ گورے چٹے کشمیریوں سے گھلتے ملتے اور ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں' خوب صورت جھیلوں کا نظارہ کرتے۔ جنہیں نوخیز کشمیری لڑکیاں کھیتی تھیں۔ انہیں کشتیوں میں بیٹھ کر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے تعمیر کردہ باغوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یہاں کی دھوپ میدانوں کی دھوپ کی طرح جسم میں

چٹکیاں نہ لیتی تھی۔ نورجہاں کھلی فضاء میں جا کر لیٹ جاتی اور گھنٹوں بادل کے ان ٹکڑوں کو تکتی رہتی' جو کہر سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں کے اوپر آسمان میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ کہر کے پردے میں سے وہ سفید جگمگاتی برف کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ آبشاروں کا ترنم' کشتی کے پہلوؤں سے ٹکراتی ہوئی موجوں کا شور اور چپوؤں کی آوازیں سماعت کو لطف و لذت سے ہم کنار کرتی تھیں۔

راتوں کو وہ سطح آب پر جشن منانے کا بطور خاص اہتمام کرتی تھی۔ اس کے لئے شاہی بجروں کو انتہائی نفاست سے آراستہ کیا جاتا اور جھیل کے کنارے درختوں پر رنگا رنگ قندیلیں آویزاں کر دی جاتیں' اس کے بعد وہ جہانگیر کی معیت میں' جو عشرت و سرور کے ان لمحات میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا' ان لوگوں کے قریب سے گزرتی جو قندیلوں کی روشنی میں' قالینوں پر بیٹھے داد عیش دینے میں مصروف ہوتے تھے۔ ملاحوں کے گیت ان کے کانوں میں گونجتے لیکن کیف و سرخوشی کے اس عالم میں وہ ان کے دلوں تک نہ پہنچتے۔

ایک بار اسی کیفیت میں جہانگیر بول اٹھا:

"تم پرستان کی ایک پری ہو' جو دن کی روشنی میں خوابیدہ و مستور ہوتی ہے اور رات کے اندھیرے میں زندہ اور بیدار ہو جاتی ہے!"

نور محل نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا: "جہاں پناہ! آپ کو ظلمت کی پری سے ڈر نہیں لگتا؟"

"بخدا نہیں! ---- کتنے خوش گوار ہیں یہ لمحات! جی چاہتا ہے' جام و ساغر سے شغل کیا جائے!"

انہوں نے جھیل کے کنارے ایک دکان سے شکر پارے خریدے اور بچوں کے ایک ہجوم پر اچھال دیئے۔ بچے خوشی کے مارے چلا اٹھے اور انہیں معمول کے مطابق "پادشاہ سلامت" کا نعرہ لگانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

ایک دن جب نور محل مندر کے تالاب میں سنہری مچھلیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جہانگیر مرغابیاں پکڑنے چلا گیا۔ ان دنوں اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ بندوق سے جانوروں کا شکار نہیں کرے گا۔ اثنائے شکار میں اسے دشوار گزار پہاڑیوں پر چڑھنے کا خیال آیا۔

چنانچہ وہ دونوں ملازموں کو ہمراہ لے کر پہاڑوں پر دور تک چلے گئے ---- کیونکہ اس

اجنبی اور خاموش علاقے میں کسی دشمن کا خطرہ نہ تھا۔ انہوں نے خانہ بدوشوں کے خیموں اور ڈھلانوں پر چرنے والے ریوڑوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اور اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ وادی میں بہنے والی بل کھاتی ندی چاندی کی ایک لکیر بن کر رہ گئی۔

اتنی بلندی پر پہنچ جانے کے باوجود انہوں نے اپنے قدم نہ روکے اور برابر اوپر کی طرف چڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ ایک کھلی جگہ پہنچ کر انہوں نے الاؤ روشن کیا اور اس کے پاس بیٹھ کر پہاڑوں کی اوٹ سے ابھرنے والے چاند کا نظارہ کرنے لگے' جو برف پوش چوٹیوں کو ایک ایک کر کے نور کا لباس پہنا رہا تھا۔ انہوں نے ستاروں کی تاب ناکی پر بحث شروع کر دی۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ نشیبی میدانوں کے مقابلے میں چونکہ پہاڑوں کی فضا زیادہ صاف اور پاکیزہ ہوتی ہے' اس لئے یہاں ستارے زیادہ روشن نظر آتے ہیں لیکن بعض کی رائے میں اس کا سبب یہ تھا کہ پہاڑوں کی بلندی پر دیوتاؤں کا مسکن ہے۔

بحث کے دوران میں نورجہاں سوچ رہی تھی کہ کیا خراسان کے پہاڑ بھی؟ جنہیں اس نے آج تک نہیں دیکھا' انہی پہاڑوں جیسے ہیں۔

اونچے پہاڑوں کی ہوا نے جہاں گیر کی تکلیف میں شدت پیدا کر دی۔ حالانکہ شالامار کا قیام اس کے لئے راحت بخش ہوتا تھا۔ اس نے اس مقام کو اپنے تصورات کے مطابق ڈھالنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ باغ کے وسط میں نشاط محل تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کے چاروں طرف خوشنما فواروں اور پھولوں کے حسین تختوں کا جال پھیلا ہوا تھا ---- اس کے علاوہ باغ کی رونق میں اضافہ کرنے کے لئے دریا سے ایک نہر کاٹ کر لائی گئی تھی جس کے دونوں کناروں پر چناروں کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔

جہانگیر محل کے بالا خانے سے نہر کا بخوبی نظارہ کر سکتا تھا نہر کے طلسماتی پل اور چناروں کی گھنی محرابوں کے نیچے اچھلتے ہوئے فوارے اور جھیل کا نیلگوں پانی دیکھ کر اس پر ایک عجیب کیف طاری ہو جاتا تھا۔ سامنے ایک دیوار پر یہ شعر کندہ تھا!

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

ایک رات جہانگیر محل میں بیٹھا رقص و سرود کی ایک محفل سے لطف اندوز ہو رہا تھا

جس میں بعض نئے موسیقار بانسری اور جل ترنگ کے کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے اور نور محل نہر کے کنارے شامیانے میں بیٹھی رات کی دعوت کے لئے لباس منتخب کرنے میں مصروف تھی کہ اسے خسرو کے ایک پیغام کی اطلاع ملی۔

ایک خاص ہرکارہ دہلی سے چل کر ابھی ابھی سری نگر پہنچا تھا اور اب وہ تھکاماندہ اور گردوغبار سے اٹا ہوا عقبی کمرے میں انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنا پیغام کسی اور کو دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے ایک انگوٹھی اندر بھجوائی تو نور محل فوراً سمجھ گئی کہ وہ فدائی خان کی ہے جو دکن میں نابینا شہزادے کا مصاحب تھا۔ وہ اس ریشمی پردے کے پیچھے جا کر بیٹھ گئی جو اس کے اور ملاقاتیوں کے درمیان پڑا رہتا تھا۔

قاصد نے قالین کو بوسہ دیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا :۔

"ملکہ عالم! فدائی خان نے حضور کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ خسرو کا شہزادہ خرم کے خیموں میں انتقال ہو گیا۔۔۔۔"

نور محل کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا : "وہ کیسے؟"

"طبیبوں کا کہنا ہے کہ شہزادے کی موت درد شکم سے واقع ہوئی ہے لیکن ان کے مصاحب فدائی خان کا کہنا ہے کہ ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس رات شہزادہ خرم شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ رضا نامی ایک غلام نابینا شہزادے کے خیمے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد نکل آیا۔ اس کے سوا اور کچھ پتا نہیں چل سکا۔ لیکن شہزادے کو کوئی خطرناک بیماری نہ تھی گلا گھونٹنے والا بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کے جسم پر کوئی نشان تک نہیں!"

نور محل کو اس فرمان کا خیال آیا جو خرم کے نام خسرو کی واپسی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ پھر اس نے قاصد سے پوچھا :

"اس کا کوئی ثبوت ملا؟"

"نہیں ملکہ عالم ۔۔۔۔ اور جن درباریوں یا طبیبوں نے شہزادے کی طبعی موت کے تصدیق نامے پر دستخط کئے ہیں وہ بھی اس رات شہزادے کے پاس نہیں گئے تھے۔ انہوں نے صرف لاش دیکھی ہے۔"

"تم جا سکتے ہو! تمہیں روپے پیسے یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے پر مل جائے گی۔"

نور محل نے اسے بڑی بدحواسی کے عالم میں رخصت کیا۔ اس کے خیالات اپنے کمرے سے ہزاروں میل دور پرواز کر رہے تھے۔ خرم نے اپنے بھائی کو قتل کرا دیا تھا! شاہی فرمان ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کا غلام ایک ایسے وقت کمرے میں داخل ہوا جب شہزادہ تن تنہا تھا۔ یوں بھی اندھوں کے پاس کون ہوتا ہے؟ یقیناً خرم اس رات اتفاقیہ طور پر شکار کے لئے نہیں گیا ہو گا۔ لیکن قتل کا ثبوت کیا تھا ـــــ! درباریوں اور طبیبوں نے اپنے بیان میں اس کے طبعی موت مرنے کی تصدیق کی ہے ـــــ رہ گیا رضا ـــــ تو یقیناً اسے اب تک کہیں اور پہنچا دیا گیا ہو گا ـــــ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا ہو۔

کنیزیں اس کے بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد خوشبو لگا رہی تھیں۔ اسے شالامار کی دعوت شب میں بروقت پہنچنا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک خسرو کے قتل میں الجھی ہوئی تھی تاہم اس کے دل میں ذرا بھی وہم پیدا نہ ہوا۔ اس کے ضمیر نے گواہی دی کہ ولی عہد خرم نے خسرو کو راستے سے ہٹا کر تخت تک پہنچنے کے لئے زمین ہموار کر لی ہے اور اس طرح ایک ہی وار میں جہانگیر اور نور محل دونوں کو گھائل کر دیا ہے! یہ یقیناً قتل کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ جو نہایت ہوشیاری سے اور بروقت تکمیل کو پہنچایا گیا تھا۔

اس سے پہلے بھی مغل شہنشاہوں کی زندگیاں صعوبت انگیز رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اکبر نے بھی مایوسی اور حواس باختگی کے ہجوم میں ایک ننگی تلوار' چنے ہوئے پتھروں میں گاڑ کر' اپنا کام تمام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اکثر جہاں گیر کو یہ کہتے سنا تھا کہ سلطنت' قرابت کی قائل نہیں۔ بااین ہمہ وہ جانتی تھی کہ جہانگیر نابینا شہزادے کو دل سے چاہتا ہے اور سرد مہر لیکن کام گار خرم کو اس پر ہرگز ترجیح دینے کو تیار نہیں۔ جب تک خسرو زندہ تھا خرم کو اپنے باپ کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی جرات نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس صورت میں خسرو کے ہوا خواہ شاہی دربار کے طرف دار ہو جاتے ـــــ!

اب خرم نے خسرو کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ جب نور محل سوچتی کہ خرم کی حفاظت میں نابینا شہزادے کو کس طرح خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو وہ کانپ اٹھی۔ کاش اس کے باپ کی علالت اسے دکن سے توجہ ہٹا لینے پر مجبور نہ کرتی! کاش وہ جہانگیر کے اقدام کا انتظار کرنے کی بجائے ازخود خفیہ طور پر خسرو کو خبردار کر دیتی۔ بغاوت کے آثار اب اتنے ہی واضح ہو چکے تھے جتنے صنوبر کے درختوں کے وہ سائے جو اپنے بازو پھیلا کر اس کے خیمے کو آغوش میں لے رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ جونہی غیاث بیگ

نے آنکھیں بند کیں بغاوت کی چنگاریاں سلگ اٹھیں گی۔۔۔۔! محویت کے اسی عالم میں اس نے کنیز کو حکم دیا: "نقرئی تاج اور بلوریں کنگن۔۔۔۔! جواہرات میں سے گلابی موتیوں کے ہار کے سوا اور کوئی زیور نہ لانا۔"

اس نے انتہائی غیرجانب داری سے خرم کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شہزادہ دکن میں لڑنے کی بجائے اپنے حلیف جمع کر رہا تھا ۔۔۔۔ اس نے شورش زادہ مالوہ اور بنگال کے علاوہ جنوبی ہند میں بھی ایک کے بعد دوسرے سردار کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جاسوس اسے ہمیشہ یقین دلاتے رہے کہ خرم دکن کے راجاؤں کو مغلوں کا حلیف بنا رہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے پیش نظر صرف ایک بات تھی کہ وہ دکن میں اپنی فوج تیار کر لے جہاں تک قوت و بازو کا تعلق ہے' وہ اب جہاں گیر کے ہم دوش ہو چکا تھا۔ اور فوجی قیادت میں وہ جہاں گیر سے بھی آگے تھا۔ نور محل سوچنے لگی! خرم کا آئندہ اقدام کیا ہو گا۔

اس نے بے چین ہو کر کنگن پہنے اور نقاب اوڑھنے سے پہلے اطمینان کر لیا کہ اس کے بال درست ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ جہانگیر اس کے بناؤ سنگھار کی جزئیات تک کا خیال رکھتا ہے۔

اگر خرم کی جگہ وہ خود ہوتی تو کھل کر میدان میں نہ آتی؟ خرم نے تیر چلا کر وقت کو اپنے موافق بنا لیا تھا۔ اب وہ اس انتظار میں ہو گا کہ جہانگیر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جنوبی ہند کا طویل سفر کرتا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اگر جہانگیر ایسا کرے تو یہ اس کی غلطی ہو گی لیکن کیا وہ اپنے بیٹے کو بغاوت کے لئے آزاد چھوڑ دے؟ ایسا کرنا بھی حماقت سے کم نہ ہو گا۔ ہندوستان کی آنکھیں اپنے بادشاہ پر لگی ہیں۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ فرض شناسی سے کام لیتا ہے اور اپنے ضعف کے باوجود باغی بیٹے کی سرکوبی کرتا ہے یا نہیں؟"

"ملکہ عالم!" ایک کنیز نے اس کے کان میں آکر کہا۔ "جہاں پناہ دستر خوان پر رونق افروز ہو گئے ہیں۔"

نور محل جلدی سے اٹھی اور بجرے میں سوار ہو گئی' جو نہر کے کنارے اس کا منتظر تھا۔ "بارہ دری" میں جہانگیر دستر خوان پر بیٹھا ادرک کا حلوہ کھا رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف بے پردہ اور مسکراتی ہوئی کشمیری دوشیزاؤں کا جھرمٹ تھا۔ ان کے علاوہ شاعر اور مغنی بھی حاضر تھے۔

"تم نے طویل جدائی کے دکھ میں بھوک کے درد کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ جہانگیر نے

اسے دیکھتے ہی کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مرغابیوں کی ایک نئی بھوری قسم کے بھنے ہوئے گوشت پر "شراب کی چٹنی" ڈال کر اس کے ذائقہ کا تجربہ کروں۔"

نور محل نے دھیمی آواز میں کچھ جواب دیا اور اپنی جگہ جا بیٹھی۔ اچانک اس کی نگاہ سنہری حروف میں لکھے ہوئے سامنے کے شعر پر پڑی اور اس نے دہرایا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

جہانگیر نے خوش ہو کر کہا۔ "راحت جان! بر محل شعر پڑھ دینا بھی تم پر ختم ہے!"

اسی اثنا میں خرم کی عرض داشت پہنچی کہ خسرو نے آٹھویں تاریخ کو درد قولنج سے انتقال کیا ..... اس سے پہلے میں نے قراول اور شکاریوں کو حکم دیا تھا کہ شکار گاہ کرچھاک میں شکاروں کو گھیریں۔ جب میں نے سنا کہ وہاں شکار گھیرے میں آیا ہے' تو چوبیسویں کو مع چند مصاحبوں کے اس طرف روانہ ہوا اور ایک سو چوبیں جانور وہاں شکار ہوئے۔

"آپ کے نابینا بیٹے کی زندگی پر خرم نے عزت کی بازی لگا رکھی تھی" نور محل نے اسے یاد دلایا۔ "ایک مہینہ سے زیادہ ہوا آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ خسرو کو یہاں بھجوا دیا جائے لیکن اس نے پروا نہ کی۔"

"بے چارہ خسرو اتنا بیمار ہو گا کہ سفر نہ کر سکا۔"

"لیکن جہاں پناہ! اس کی بیماری کی اطلاع بھی تو آپ کو نہیں دی گئی۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بیماری ہی سے مرا ہے!"

"معزز آدمیوں کی حلفیہ گواہی۔"

"جو خرم کے وفادار ہیں! کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اب انہیں طلب فرمائیں اور وہ آپ کے حضور میں حلف اٹھا کر اپنے بیان کی تصدیق کریں۔"

جہانگیر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔

"خدا عالم الغیب ہے! مرنا شاید خسرو کی قسمت میں تھا۔ ویسے اس کی موت کے غم کو طول دینے سے بھی کیا حاصل؟"

نور محل کو جواب سے گریز کے لئے اپنے ہونٹ سینے پڑے جواب دینے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ جہانگیر کی بے پروائی پر اس کا جی رونے کو چاہتا تھا۔ خسرو کی موت کے بعد اس کی منکوحہ بیویوں کے بطن سے اب صرف دو بیٹے رہ گئے تھے جن میں پرویز بڑا تھا۔ لیکن وہ چوبیس گھنٹے شراب میں دھت رہتا۔ خرم اسے بجاطور پر "ناشدنی" کہتا تھا دوسرا خود خرم تھا جو اپنے باپ کا منظور نظر، جہاں گیری افواج کا سپہ سالار اور سلطنت کا بہت بڑا سہارا تھا۔ اگر بادشاہ کسی ثبوت کے بغیر علانیہ اس پر خسرو کے قتل کا الزام لگاتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اپنے حوصلہ مند اور خود پسند بیٹے کی دشمنی مول لے لیتا۔ اسے شبہہ ضرور تھا کہ نابینا شہزادے کے قتل کا حکم خرم ہی نے دیا ہو گا۔ لیکن یقین کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔

ان حالات میں اس کے نزدیک بہتر یہی تھا کہ اس الم ناک واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

نور محل کے لئے اس کے فیصلے کے خلاف کوئی دلیل دینا بے سود تھا۔ اگر وہ اپنے بیٹے کے جرم پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا تو کوئی کیا کر سکتا تھا؟ نور محل یوں تو جہانگیر کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو سکتی تھی لیکن بیٹوں کے معاملے میں دخل دینا اس کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ وہ جہانگیر کو متاثر کرنے کے لئے کسی اور موقع کی تلاش میں رہی جو اسے سرحد سے آنے والی ایک خبر نے خود بخود فراہم کر دیا۔

مہابت خان نے ایک مختصر سا پیغام بھجوایا کہ "قبائلی جمع ہو کر سوداگروں کو معمول سے زیادہ ہلاک کر رہے ہیں۔ انہیں جنگ کے لئے اکسایا گیا ہے۔"

"افغانستان کی پہاڑیوں میں لوٹ مار کوئی انوکھی بات نہ تھی لیکن کچھ دنوں سے مغلیہ سرداروں کو پے در پے شدید حملوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ ادھر حاکم ملتان خان جہاں لودھی نے بھی شاہی دربار کو نئے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ شاہ ایران کی فوجوں نے مغربی سرحد پر پہنچ کر قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔۔۔۔!

نور محل جانتی تھی کہ قندھار کے متعلق مغلوں اور ان کے طاقتور ہمسائے ایران میں ہمیشہ جھگڑا رہا ہے لیکن ایک طرف ایرانیوں نے چکنی چپڑی باتوں سے مغل شہنشاہ کو دھوکے میں رکھا اور دوسری طرف خفیہ طور پر اپنی فوجیں قندھار کے دروازوں پر پہنچا دیں۔ چونکہ اس شہر کی حفاظت کا معقول انتظام نہ تھا اس لئے ایک مختصر سے محاصرے کے بعد ایرانیوں

نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بغاوت کے یقینی خطرے کے ساتھ ساتھ مغربی سرحد پر بھی حملے کا قوی امکان پیدا ہو گیا تھا۔ جہانگیر کو جب ان حالات کا علم ہوا' تو اس نے برافروختہ ہو کر یہ اعلان کیا کہ ہم خود فوج لے کر جائیں گے۔

پہلے قندھار دشمن سے واپس لیں گے' پھر ایران پر چڑھائی کر کے اس کے پایہ تخت اصفہان کو تاراج کر دیں گے۔

نور محل نے جہانگیر کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی' حالانکہ اسے بخوبی علم تھا کہ اتنے بڑے حملے کے لئے کافی فوج نہیں ہے اور اگر لشکر کشی کی گئی تو سرحدی صحرا میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ پھر خرم کو میدان خالی مل جائے گا اور وہ تاج و تخت پر قبضہ کر لے گا۔

"افسوس! شاہ عباس نے آپ کی دوستی کا جواب دغا بازی سے دیا ہے اور اس کے گماشتے قبائلیوں کو آپ کے خلاف اکسا رہے ہیں۔"

نور محل نے یہ کہہ کر جہانگیر کے شعلہ غضب کو اور بھڑکا دیا۔ ادھر شاہی لشکر شمالی ہند کے دروں سے ہوتا ہوا واپس میدانوں میں آ رہا تھا۔ جہانگیر روزانہ دربار منعقد کر کے ایران پر چڑھائی کے لئے فوجیں فراہم کرنے کی تفصیلات پر بحث کرتا۔ اس نے شمال میں ہر جگہ قاصد دوڑائے کہ تمام امرائے سلطنت اپنی فوجوں' ہاتھیوں اور توپ خانوں کو لے کر ملتان میں جمع ہو جائیں۔ تاکہ وہاں سے قندھار کی جانب کوچ کیا جا سکے۔ ان تیاریوں میں نور محل نے اس کی پوری امداد کی اور اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ دہلی اور آگرہ کے شاہی خزانے شمال میں منتقل کرنے کے احکام صادر کئے جائیں۔ جہاں گیر اس خیال سے بہت خوش تھا کہ اب ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو جائے گا۔

"لیکن کمان کون کرے گا؟" نور محل نے حیران ہو کر پوچھا اور یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نکتے پر وہ دیر سے غور کر رہی ہے۔ پھر اس نے خود ہی کہا "شاہی پرچم اٹھانے کا اہل صرف ایک ہی شخص ہے ---- خرم! جو اب تک ہر معرکے میں کامیاب و کامران رہا ہے!"

"ہاں خرم!"

"تو پھر اسے طلب فرما دیجئے۔ وقت مناسب ہے! اسے فوراً لاہور یا ملتان پہنچنا چاہئے!"

"لیکن اس کے ہمراہ فوج کتنی ہو؟ وہ دکن کو یوں ہی تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"یہ اسی کی صواب دید پر چھوڑ دیجئے!"

چنانچہ خرم کے نام شاہی فرمان بھجوا دیا گیا اور نور محل بڑی بے تابی سے پیش آنے والے حالات کا انتظار کرنے لگی۔ جہانگیر سمجھ بھی نہ پایا تھا اور اس نے شہزادے کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ خرم کے دل میں یہ چور تھا کہ خسرو کا خون اس کی گردن پر ہے اس لئے وہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ جہانگیر اس سے کیا سلوک کرے گا؟ اگر وہ شاہی فرمان کی تعمیل کرے ---- اور جنگ کے زمانے میں دو ہی صورتیں تھیں' تعمیل یا بغاوت!---- تو ظاہر ہے شمالی ہند میں اسے اپنے باپ کے سایہ اقتدار میں رہنا پڑتا۔ نور محل کا خیال تھا کہ وہ جہانگیر کے غیظ و غضب سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا اس کی ---- نور محل کی ---- دشمنی سے! اگر وہ دکن چھوڑ کر چلا آیا اور اپنے ہمراہ پوری فوج بھی لے آیا تو وہ بھی جہانگیر کی مسلح فوج کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ بہرصورت اگر وہ ایران پر لشکر کشی کے لئے آمادہ ہو گیا' تو اس کے حامی ہندوستان میں منتشر ہو جائیں گے' جنہیں دوبارہ یکجا کرنا دشوار ہو گا۔

نور محل نے جہانگیر کو آمادہ کر لیا کہ وہ خسرو کی لاش آگرہ لانے کا حکم دے۔ چنانچہ خرم سے پہلے نابینا شہزادے کا تابوت آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ رستے میں وہ جہاں کہیں ٹھہرتا' خسرو کے سوگوار عقیدت مندوں کا تانتا لگ جاتا۔ کیونکہ وہ عوام میں بے حد مقبول تھا۔ ایسے تمام مقامات پر بعد کو زیارت گاہیں تعمیر کر دی گئیں' جہاں لوگ منتیں مرادیں لے لے کر آنے لگے۔ اس لئے کہ لوگوں میں نابینا شہزادے کے ولی ہونے کا چرچا ہو گیا تھا اور وہ اپنی حاجت روائی کے لئے اس کے آستانے پر آنے شروع ہو گئے تھے۔ صرف نور محل ہی سمجھ سکتی تھی کہ خرم پر اس کا کیا اثر پڑے گا' جو اسی راستے سے آ رہا تھا' یہ ایک عورت کا وار تھا' جو کاری ثابت ہوا۔

خرم نے شاہی فرمان کی تعمیل میں تامل سے کام لیا۔ اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ اس سلسلے میں شرائط طے کرنے لگا۔ اس نے بادشاہ کو لکھا کہ میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہوں لیکن اس شرط پر کہ پوری فوج کی کمان میرے ہاتھ میں رہے اور شمال مغرب میں جتنے شہر اور فوجی مراکز ہیں وہ سب میرے قبضہ میں دے دیئے جائیں۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ ایران پر تو کامیابی محال ہے۔ لیکن اس طرح وہ اپنا فوجی اقتدار جنوب سے شمال مغربی علاقے میں

منتقل کر سکے گا۔ اس نے مزید لکھا کہ وہ روانہ ہو چکا ہے لیکن برسات سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔

خرم نے دراصل نور محل کی فراست کا جواب بڑی ہوشیاری سے دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اس کا مطلب ایک ہی نظر میں تاڑ گئی اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ جہانگیر اس کا جواب کیا دے گا؟

قندھار کے سقوط نے مغلیہ اقتدار پر ایک کاری ضرب لگائی تھی اور جہانگیر پر اس کا اتنا اثر تھا کہ اس نے بذات خود ایران پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس نازک مرحلے پر اس کا بیٹا خرم اس سے سودے بازی کر رہا تھا! اس نے الٹے پاؤں قاصد کے ہاتھ خرم کو جواب بھجوایا کہ اگر اسے خود برسات کے بعد آنا ہے تو اپنی ساری فوج شاہی پرچم تلے فوراً روانہ کر دے' جس میں اس کے سارے سالار سادات بارہہ' شیخ زادے' افغان اور راجپوت گھڑسوار سبھی شامل ہوں۔

خرم نے اس فرمان کی تعمیل نہ کی اور اپنا ایک خوش گفتار ترجمان شاہی دربار میں بھیج دیا جس نے شہزادے کی وکالت کرتے ہوئے پوچھا کہ آخر شہنشاہ خرم سے کیوں ناراض ہیں؟ اس نے یہاں تک کہا کہ جہاں پناہ ایک عورت کے اشاروں پر چلنے لگے ہیں۔ شہزادہ خرم کیا کریں۔ جب دربار میں ان کی مخالف! نور محل کا راج ہو! کیا وہ اپنی جاگیروں اور لاؤ لشکر کو خیرباد کہہ کر فقیری لے لیں یا حج کے لئے مکہ روانہ ہو جائیں۔

نور محل پردے کے پیچھے بیٹھی بڑی توجہ سے یہ باتیں سن رہی تھی وہ سوچنے لگی کہ دمہ کے مریض بادشاہ پر اس تقریر کا کیا اثر ہو گا؟ اگر وہ چند ہفتے پہلے کشمیر ہی میں خرم کے خلاف محاذ قائم کر لیتی تو شاید اس وقت جہانگیر ترجمان کی باتوں سے متاثر ہو جاتا لیکن اس نے خرم کو خود ہی دام میں آنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اب جہانگیر سمجھ گیا تھا کہ اس کا بیٹا نافرمان ہے اور اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے فوراً ترجمان کو معمولی تحفہ دے کر' بغیر کسی جواب کے رخصت کر دیا اور رات کو نور محل سے شکایت کرتے ہوئے کہا!

"خرم یقیناً پاگل ہو گیا ہے۔ اس کا کیا علاج کرنا چاہئے؟"

"خرم آپ سے وفاداری کا دم بھرتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "اگر وہ سچا ہے تو آپ کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کرے گا بلکہ چپ چاپ دکن واپس چلا جائے گا۔"

اس سلسلہ میں جہانگیر نے "تزک" میں لکھا!

"فرمان ہوا کہ بعدازیں اپنے حالات درست کر کے راہ راست
اور شاہراہ ادب سے قدم باہر نہ رکھے۔ اور اپنی انہی جاگیروں پر
خوش رہے' جو دیوان اعلیٰ سے بطور تنخواہ پائی تھیں۔ ملازمت میں
آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرے اور قندھار کے حملے کے لئے سپاہیوں کی
جو جمعیت طلب کی گئی تھی وہ درگاہ والا میں بہت جلد روانہ کر دے۔
اگر حکم کے خلاف ظہور میں آیا تو اس کا نتیجہ سوائے ندامت کے
کچھ نہ ہو گا۔"

اس کے بعد ایلچیوں نے شہزادے کا آخری پیغام بادشاہ کو پہنچایا کہ اس نے جنگ کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں اور وہ فوج کے ہمراہ شمالی ہند کی جانب بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی معیت میں آزمودہ کار جرنیل راجہ بکرماجیت کے علاوہ راجگان دکن بھی ہیں۔

جہانگیر اس اطلاع کو سنتے ہی بدحواس ہو گیا۔ جو پہلے ہی لڑائی کی تیاریاں اور سفر کی منزلیں طے کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ وہ مسلسل شراب پیتا اور ہوش میں اس وقت آتا' جب شکار کو نکلتا۔ جن لوگوں نے اسے پیش آمدہ خطرات سے خبردار کیا انہیں اس نے جواب دیا!

"حکومت کے قابل صرف نور محل ہے۔ مجھے تو تھوڑی سی شراب اور تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت چاہئے اور بس!"

اس نے "تزک" لکھنی بھی چھوڑ دی اور اپنے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا۔

"ضعیفی کے سبب' جو دو سال پہلے عارض ہوئی تھی اور اب بھی
ہے' دل و دماغ ساتھ نہیں دیتے کہ وقائع و سوانح کی تحریر و تسوید
میں مصروف رہوں۔"

نور محل کے زور دینے پر وہ آگرہ کی جانب بڑھتا رہا' لیکن فوج اس سے فراہم نہ ہو سکی۔ اس کی قیادت کا تو ذکر ہی کیا! نور محل نے شمالی ہند کے تمام ہوا خواہان سلطنت کو حکم بھجوایا کہ وہ لاہور میں جمع ہو جائیں اور ایک ذاتی خط مہابت خاں کے نام بھی ارسال کیا جس میں افغان سردار کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ نئے شاہی لشکر کی کمان سنبھال لے کیونکہ وہی خرم اور بکرماجیت کی منظم فوجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ خرم اور بکرماجیت اب اجمیر کے

قریب پہنچ چکے تھے۔ اس اثناء میں نور محل نے شہزادہ شہریار کو ایک معمولی فوج دے کر افغانستان کی سرحد پر بھجوایا تاکہ قندھار پر حملہ کرنے کا ڈھونگ رچایا جا سکے۔

سردار مہابت خان کا جواب بوا پس پہنچ گیا جسے پڑھتے ہی نور محل کے سینے میں خوف و دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی ---- اس نے لکھا تھا۔

"کیا میں کہتا ہوں کہ مجھے دس سال کے لئے دربار سے نکال دیئے جانے کے بعد اب واپس آنے کا حکم دیا جائے۔ شاہی دربار میں غداروں کی کمی نہیں۔ میں غداروں کے ساتھ مل کر نمک حرامی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک خالی خالی نظروں سے اس کاغذ کو گھورتی رہی' جس کی عبارت جلی قلم سے لکھی ہوئی تھی۔ سردار کبھی خرم کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا اور اس کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ ممکن ہے جہانگیر پر اس کا ---- نور محل کا ---- اثر و نفوذ دیکھ کر سردار کو غصہ آ گیا ہو۔ اسے عورتوں کے متعلق سردار کی رائے یاد آئی اور وہ خط بھی جو سردار نے جہانگیر کو لکھا تھا۔ آخر نور محل نے اسے دوسرا فرمان بھیجا' جس کی حیثیت حکم کی نہیں' چیلنج کی تھی اور وہ سردار کے خط کی طرح مختصر تھا!

"کیا سردار مہابت خاں بھی مغلوں کا نمک حرام ہے! باغیوں کی فوج فتح پور کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اگر سردار نے کمان ہاتھ میں نہ لی تو یہ فرض میں ---- نور محل ---- خود انجام دوں گی!"

نور محل کا یہ پیغام بڑی تیزی سے مہابت خاں تک پہنچا دیا گیا۔ ادھر نور محل کو دارالسلطنت سے پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ باغی فتح پور کی سرخ فصیل تک آ پہنچے تھے راجہ بکرماجیت آگرہ پر یلغار کرنے ہی والا تھا۔ اتنے میں سردار مہابت خان کے رقعے کے بجائے اس کا ایک پٹھان ایلچی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ سردار مہابت خان اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور شام تک شاہی لشکر سے آ ملے گا۔

"کس وقت؟" نور محل نے بیتابی سے پوچھا:۔

"چاند نکلتے ہی! بلکہ ہو سکتا ہے سرشام ہی پہنچ جائیں' کیونکہ سردار اتنی برق رفتاری سے گھوڑا دوڑاتے ہیں' جیسے کوئی بھوت ان کا تعاقب کر رہا ہو۔"

عصر کے وقت آسمان پر گہرے بادل چھا گئے اور زور کی آندھی چلنے لگی۔ اس کے بعد

موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھانے کا وقت آیا' تو بارش اور تاریکی کی وجہ سے شوروغل معمول سے کچھ زیادہ تھا۔ اس ہنگامہ سے فائدہ اٹھا کر نورمحل خیمہ سے نکلی اور جوں توں رستہ طے کرنے لگی۔ اس مرتبہ بوڑھا ارسلان اس کے ساتھ نہ تھا۔ اس کے اصرار کے باوجود وہ اسے قنات کے دروازے پر چھوڑ آئی تھی۔ نورمحل سیاہ شال میں لپٹی ایک معمولی سے گھوڑے پر روانہ ہو گئی۔ فضاء پر دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ آگے بڑھی تو سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار رستہ روکے کھڑی تھی اور جب اس نے دوسرے راستے سے جانا چاہا۔ تو وہاں خیموں کے رسوں اور طنابوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اگر کوئی جگہ خالی بھی تھی' تو بارش سے بچنے کے لئے لوگ وہاں خیمے گاڑ رہے تھے۔

"خبردار! خبردار۔"

پہریدار برابر چلا رہے تھے' ان کے ہاتھ میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔ جنہیں وہ بھولے بھٹکے لوگوں کے سروں پر بے تحاشا چلا رہے تھے۔ ایک طرف سے چیخ سنائی دیتی' تو دوسری طرف سے گھٹی ہوئی آوازیں بلند ہوتیں۔ اتنے میں کئی دکانوں کی چھتیں اڑ کر زمین پر آ رہیں اور اس کے شور میں دوسری تمام آوازیں دب کر رہ گئیں۔ اچانک ایک اور ہنگامہ برپا ہوا : شاید کوئی مست ہاتھی چھوٹ گیا تھا' کوئی امیر اپنے گھڑسواروں سمیت تنگ رستے سے گزر رہا تھا اور گھوڑوں سے بچنے کے لئے لوگ چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

دراصل کشمیر سے روانگی کے بعد لشکر میں ایک عام بدنظمی پیدا ہو گئی تھی۔ نورمحل کا خیال تھا کہ شہنشاہ کی صحت دفعتہ" گر جانے سے افسر بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اپنے غیر منظم ماتحتوں پر ان کا' رعب باقی نہیں رہا ہے اور ماتحتوں کی بے یقینی نے چوپایوں کو بوکھلا دیا ہے۔ اسے کئی دفعہ سامنے ننگی تلواریں لہراتے دیکھ کر پیچھے مڑنا پڑا لیکن خوش قسمتی سے اسے جلتے ہوئے الاؤ کی ایک جھلک نظر آ گئی' جس سے شاہراہ تک پہنچنا اس کے لئے آسان ہو گیا اور وہ خیموں کے عقب سے ہوتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ وہاں کوئی حفاظتی دستہ نہ تھا' البتہ چند مسافر موجود تھے جو لٹ جانے کے خوف سے تیز تیز چل رہے تھے۔

شاہی لشکر نے دریائے جہلم کے کنارے پر الاؤ ڈال رکھا تھا جس سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ریتلا گھاٹ تھا' گھاٹ پر پہنچ کر نورمحل نے دیکھا کہ وہاں ٹیلے اور جھاڑیاں

ہیں' جن سے تیز ہوا کے جھونکے شور مچاتے گزر رہے ہیں۔ اس خیال سے کہ لشکر کے باہر تنہا عورت کو دیکھ کر ہر کوئی شبہ کرے گا' وہ گھوڑے سے اتر گئی اور اسے ایک جھاڑی کے قریب لے جا کر باندھ دیا۔

چند آدمی مغرب کی طرف سے گھاٹ کی سمت آ رہے تھے۔ نور محل جانتی تھی کہ مہابت خان اسی راستے سے آئے گا۔ وہ سواروں کی ہر ٹولی کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ جسم پر شال ہونے کے باوجود وہ کانپ رہی تھی۔ لیکن اس کا سبب سردی کے سوا کچھ اور تھا!

نور محل کو حالات کا بخوبی علم تھا۔ شہزادہ خرم اور دوسرے باغی شہنشاہ کی بیماری سے فائدہ اٹھا کر میدان میں نکل آئے تھے۔ اس لئے اب مسلح فوج ہی بغاوت کا طوفان روک سکتی تھی۔ شمالی علاقے میں وفادار عنصر کی کمی نہ تھی اور آدمی بھی اتنے تھے کہ خرم کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن وہ انتشار اور غلط فہمیوں کا نہ جانے کیوں شکار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ لشکر کے محافظ بھی حالات کی اہمیت سے بے خبر تھے۔ جہاں گیر کے مقربین میں بھی یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ آپس میں مل کر کوئی لشکر فراہم کر لیتے' حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ فوراً کوئی فوجی ہاتھ فوج کی کمان سنبھال لیتا۔ اگر ایک مہینہ اور گزر گیا تو خرم آگرہ پر قابض ہو جائے گا۔۔۔۔!

مہابت خان اس کی امیدوں کا واحد سہارا تھا۔ راجپوت اس کی پرستش کرتے اور افغان اس سے ڈرتے تھے۔ راجاؤں اور نوابوں کو بھی اس کی قیادت پر اعتماد تھا اور اسے دیکھتے ہی لشکر میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔ نور محل اس کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ اگر مہابت خان پہل کرے اور ان باغیوں سے جا ملے' جن کی فتح موجودہ حالات میں یقینی ہے' تو اس کا انجام کیا ہو گا؟ اگر اس پٹھان نے سچ کہا ہے تو اس گھاٹ سے گزرتے وقت اس کی تیوری چڑھی ہو گی۔ اس کا سبب اس کا اپنا خط تھا۔ زیر نقاب وہ آپ ہی آپ ہنسی! کم سے کم وہ آ تو رہا ہے!

اتنی دیر میں یہ اس نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ جس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی' وہ کتنا نازک تھا۔ اتنے میں دور ساحل دریا پر ایک مشعل جھلملائی اور کیچڑ میں سے گھوڑوں کے گزرنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تقریباً بیس آدمی نمدے کے بھورے فرغل پہنے' کیچڑ میں لت پت دریا کے کنارے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ پانی میں سے چھپ چھپ

کر گزرنے لگے۔ نور محل نے سنا کہ وہ پہاڑی علاقوں کی کرخت پشتو میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے دور شاہی لشکر کے الاؤ کی جانب اشارہ کیا۔

نور محل گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ چمڑے کی بھیگی ہوئی زین پر بیٹھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ رستہ پار کر کے اس نے گھوڑا ٹھہرا لیا۔ سپاہی اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اور ایک نے آواز بھی کس دیا۔

"ارے شیطان خانے میں تجھے کوئی شکار نہیں ملا کہ تو گھاٹ پر اپنے کاروبار کے لئے آئی ہے!"

اتنے میں مہابت خان اس کے قریب سے گزرا۔ جس کی سیاہ ڈاڑھی دیکھ کر نور محل نے اسے فوراً پہچان لیا اور اس کا وہ نام لے کر پکارا جو ہندوستان میں کسی کو معلوم نہ تھا۔

"غیار بیگ کے بیٹے!"

مہابت خان نے یک لخت لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا۔

"بھیک مانگنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟" اس نے اپنے گھوڑے کا منہ اس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

"سردار! مجھے نور محل نے آپ کی طرف بھیجا ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا "اور کہا ہے کہ ....."

"نور محل سے تو میں بات کر سکتا ہوں' اس کی خادمہ سے نہیں!" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن نور محل نے پیچھے سے آواز دی۔

تمہیں اس وقت تو مجھے چھوڑ کر جانے کی جلدی نہ تھی' جب تم بہار کی سرائے میں ملا سے چوسر کھیلتے وقت ملک عنبر کی دغا بازی کی باتیں کر رہے تھے۔"

اگرچہ یہ برسوں پہلے کی ایک اتفاقیہ یادداشت تھی جب وہ ایک سپاہی کے بھیس میں ادھر ادھر پھرا کرتی تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہابت خان کے ذہن میں یہ بات اب بھی تازہ ہے۔ ایک امیر نے فقرہ چست کیا: "خدا کی قسم! سچی محبت اسی کو کہتے ہیں۔"

مہابت خان نے اپنے آدمیوں کو بڑے درشت لہجے میں حکم دیا کہ وہ ادھر ادھر اتنے پرے ہٹ کر کھڑے ہوں کہ ان کی باتیں نہ سن سکیں۔ جب نور محل' گھوڑے پر سوار اس کے پہلو بہ پہلو جا رہی تھی تو مہابت خان نے رائے قائم کی یقیناً کوئی جادوگرنی ہے۔

"اگر تمہارے پاس کوئی پیغام ہے' تو صاف الفاظ میں بیان کر دو۔ میرے پاس ایرانی

فریب کے لئے وقت نہیں ہے!"

نور محل نے اس کا جواب قہقہے میں دیا : "میں نور محل ہوں۔ لیکن اب تجھے دھوکا دینے کا کوئی خیال میرے دل میں نہیں ہے۔"

"تجھے!" افغان نے سر ہلایا "کیا تم نے مجھے کوئی جاٹ چرواہا سمجھا ہے کہ ایسی باتوں پر ایمان لے آؤں!"

"سردار! تم ہی نے تو صاف صاف الفاظ میں بات کرنے کو کہا تھا یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ تم کسی کنیز سے نہیں بلکہ خود نور محل سے بات کرو گے۔ میں نے یہاں آنے کی محض اس لئے جرات کی ہے کہ شہنشاہ ---- میرے آقا کو تمہاری بے حد ضرورت ہے!

شفاف آواز کی جھنکار نے بوڑھے افغان کو چونکا دیا۔ اس نے نور محل کی بات پر پچاس فیصد یقین کرتے ہوئے اس کی طرف کنکھیوں سے بغور دیکھا :

"یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے سنا ہے کہ تم ---- شہزادی جب چاہتی ہے پردے کے پیچھے بیٹھ کر نامحرموں سے باتیں کر لیتی ہے۔"

"ہاں! یہ اور بھی بہت سے کانوں نے سنا ہو گا! حرم میں جاسوسوں اور لشکر میں غداروں کی کمی نہیں۔ ادھر دیکھو!"

اس نے آستین سے ہاتھ نکالا اور اسے مہابت خان کی آنکھوں کے پاس لے گئی کہ وہ شاہی مہر پہچان لے۔

"سردار! اب شک و شبہہ میں وقت ضائع مت کرو۔ کل صبح تم دربار میں پس پردہ مجھ سے بات کر لینا۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ میں فی الواقع نور محل ہوں۔"

اس نے انگلیوں سے اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"بخدا! کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟"

"نہیں نہیں، غیاث بیگ کے سپوت! ضرورت ہی ایسی شدید ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ غیاث بیگ کی بیٹی : نور محل کسی زمانے میں کابل میں رہتی تھی۔ وہ بچپن میں اکثر باغ کی دیواروں تلے کھیلتی اور تمہیں گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرتے دیکھتی تھی۔ میں بھی تمہاری طرح پہاڑوں کی رہنے والی ہوں۔ لیکن تم میری طرح ریگستانی گزرگاہ میں پیدا نہیں ہوئے۔ مجھے اسپ سواری کا بھی شوق ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اس نازک موقع پر ہمارے درمیان ایرانی حیلہ کاریوں کی بات نہیں ہونی چاہئے۔

وہ فوراً بھانپ گئی کہ جب تک مہابت خاں کو اس کے نور محل ہونے کا یقین نہ آئے گا وہ اس بات پر دھیان نہ دے گا' چنانچہ اس نے خسرو کے قتل' خرم کی سرتابی اور باغی فوج کی پیش قدمی ایک سانس میں بیان کر دی' اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جہاں گیر میں اب فرماں روائی کی سکت باقی نہیں رہی اور اس کے حاشیہ بردار غداری و نااہلی کے سبب اتحاد کھو بیٹھے ہیں۔ "جتنی ضرورت جہاں پناہ کو اس وقت تمہاری ہے' کسی بادشاہ کو بڑے سے بڑے بازوے شمشیر زن کی نہ ہوئی ہو گی۔"

مہابت خان نے اس کی بات غور سے سننے کے لئے اپنی رفتار سست کر دی وہ کبھی کبھی اس کے زیر نقاب چہرے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ بظاہر اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ نور محل ہے۔ لیکن نور محل نے محسوس کیا کہ وہ ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوا اور تھی بھی یہ انوکھی بات کہ شہنشاہ کی چہیتی اس طرح اسے دریا کے کنارے ملے۔

"جب شکار کھیلنا ہو' تو شکاری کتے کو اس کے گوشے سے نکال کر خوب کھلایا پلایا جاتا ہے" مہابت خان نے کہا "میں زندگی بھر جلا وطن رہا ہوں اور میری تنخواہ ایک عام منصب دار کی تنخواہ سے آگے نہیں بڑھی۔ خدا کی قسم! میں نے ان ہاتھوں سے دشمن کا مال غنیمت لوٹ لوٹ کر دربار میں بھجوایا ہے۔"

اس نے ہتھیلی کھول کر دکھائی' اور اس زور سے مٹھی بھینچی کہ اس کی انگلیاں چٹخ اٹھیں۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی دولت نہیں لیکن ان درباریوں کو دیکھو انہوں نے سونے کے محل کھڑے کر لئے ہیں۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟ میں سچ کہتا ہوں۔ جہانگیر پر میں اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن خدا کی قسم! میں شاہی دسترخوان کے کتوں کی بات نہیں سنوں گا! انہیں مرنے دو۔"

نور محل نے سر اوپر اٹھایا :

جیسے تم جہاں پناہ کے وفادار ہو' ویسی ہی میں بھی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا' تو میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں کیوں آتی؟"

مہابت خان کچھ دور تک خاموشی سے چلتا رہا۔ جیسے نور محل کی بات ماننے میں اسے تامل ہو۔ لیکن وہ اسے جھٹلانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"محض اس لئے کہ میں لوگوں سے روبرو بات نہیں کر سکتی" اس نے تلخ لہجے میں گفتگو جاری رکھی "وہ میرے خلاف جو جی میں آتا ہے بکتے رہتے ہیں کیونکہ انہیں تردید کا

خوف نہیں ہوتا۔ کیا مجھے شاہی دربار کی ریشہ دوانیوں کا علم نہیں؟ تم میرے خدام سے پوچھ کر دیکھ لو: مجھے کتنی مرتبہ کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ سردار! اگر وہاں جا کر' اس نے اونچے الاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: تم ایک لفظ بھی کہہ دو' تو نور محل بدنام ہو سکتی ہے۔" میں تم پر بھروسا کر کے یہاں آئی ہوں اور تم دغا بازی کا ذکر لے بیٹھے ہو۔ کیا دغابازی کو سمجھنے کے مواقع مجھے تم سے زیادہ نہیں ملے۔ ذرا ایک مہینہ حرم سرا کے قریب رہ کر دیکھو: تمہیں معلوم ہو جائے گا' دغابازی کیا ہوتی ہے؟

"ملکہ عالم!" اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں دفعتہ" یقین کی ایک جھلک پیدا ہو گئی! "چلو میں مانے لیتا ہوں کہ ہم دونوں نے حق نمک ادا کیا ہے' لیکن شہنشاہ کے مقربین میں اور کون ہیں' جو کمان سنبھالنے کے قابل ہوں۔"

"خواجہ ابوالحسن۔"

"بوڑھا ہے تو لومڑی کی طرح چالاک! لیکن کبھی ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ اور کون ہے؟"

"عبداللہ خان۔۔۔۔"

"جو چند ٹکوں کے عوض اپنی ماں کی عزت بھی بیچ دے۔"

"میرا تو ایسا خیال نہ تھا اور میرا بھائی آصف خان؟"

"وہ تو ضیافتیں اڑانے کے لئے فوج کو بھی چھوڑ کر چلے جانے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ غداروں سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اگر میری خدمات حاصل کرنی ہیں تو ان دونوں کو میرے ماتحت کر دو اور اپنے بھائی کو کہیں اور بھیج دو!"

نور محل کو یاد آیا کہ بوڑھے سردار کا آصف خاں سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس کے بعد آصف خاں نے دور اندیشی سے کام لے کر اسے سرحد پر بھجوا دیا تھا۔

"چلو! یہی سہی! آصف خاں کو آج رات آگرہ کے خزانے کی نگرانی کے لئے روانہ کر دیا جائے گا۔"

افغان سردار دانت پیستے ہوئے گھوڑے کی ایال سے اپنا چابک رگڑنے لگا۔ نور محل نے فیصلہ بہت جلد دے دیا تھا۔ نسوانی ذہن کی یہ جودت عمل اس کے لئے نئی بات تھی۔ اس نے سوچا کہ نور محل کا یہ وعدہ ایسا ہی ہے' جیسے شکاری کتے کے آگے ہڈی ڈالی جائے!"

"آصف خان تو بارہ ہزاری منصب پر فائز ہے۔ وہ داروغہ فراش خانہ بھی ہے۔ اور

اسے طبل و علم رکھنے کی بھی اجازت ہے کیا وہ آج ہی رات روانہ ہو جائے گا؟ ممکن ہے وہ زبان سے مان جائے لیکن کیا وہ اپنے آدمیوں کو چھوڑ کر چلا جائے گا؟"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اسے پورا احساس تھا کہ مہابت خان ایک سپاہی ہے۔ جس نے کئی سال خیموں میں گزارے ہیں اور شاہی محل کی اندرونی سازشوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لئے غیر متوقع مشکلات پر بھی اس کی نگاہ ہے۔ اس کے باوجود نور محل سمجھتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو جانتی ہے۔ آصف خاں اس کی بات مان لے گا اور جنگ سے بچنے کے لئے بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔

"مہابت خان!" نور محل نے نرم لہجے میں کہا۔ "کل جب تم دربار میں حاضر ہو گے آصف خان کو بنگالے کا صوبہ دار مقرر کر دیا جائے گا لیکن اس کے اسپ سوار لشکر ہی میں رہیں گے۔"

اب وعدہ بالکل واضح تھا اس لئے افغان سردار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"صرف خرم کے پاس باقاعدہ فوج ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا! "سادات بارہہ سب کے سب اس کے زیر علم ہیں اور بکرماجیت بھی اس کے ساتھ ہے' جس نے "کانگڑہ" میں طوفان مچا دیا تھا اور دکن فتح کیا تھا۔ خدا کی قسم! مجھے یقین ہے کہ یہی راجا بغاوت کی جڑ ہے۔ اس نے کنور بھیم کو جیت لیا' جس کے میواڑی سپاہی دنیا کے بہترین اسپ سوار سمجھے جاتے ہیں۔"

"تاہم میرے خیال میں کوئی اندھا ہی اس پر یقین کر سکتا ہے کہ خرم کے پاس باقاعدہ فوج ہے۔" نور محل نے اسے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا! "میری طرح تم بھی جانتے ہو کہ اس کی فوج بھیڑیوں کے گلے کی صورت آگے بڑھتی ہے اور حملہ کرنے یا پیچھے ہٹنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ دراصل وہ دو دلی ہے۔ بکرماجیت البتہ من چلا ہے' اس کے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ رہے وہ جنگلی بلے : اودے رام اور کنور بھیم! وہ بھی آخری دم تک لڑیں گے۔ لیکن لشکر کا قلب ---- اور جیسا کہ تم جانتے ہو' یہ وہ لفظ ہے' جو تیمور کے زمانے سے آج تک مغلیہ فوج کے وسطی حصے کے لئے بولا جاتا رہا ہے ---- ڈھلمل یقین ہے۔ گھڑسوار دستوں نے مدتوں جہاں گیر کا نمک کھایا ہے اور وہ اتنے بے حیا نہیں ہیں کہ جہانگیر کے مقابلہ میں تلوار اٹھائیں۔ اپنے منہ پر بغاوت کی کالک مل کر وہ اب ہماری طرف آ رہے ہیں۔ اگر ان کے افسروں کے نام تمہاری طرف سے ایک پیغام ....."

"ہاں! یہ ٹھیک ہے!" اس نے نور محل کے خیالات کا رخ پاتے ہوئے کہا! "اگر کوئی شہنشاہ کے نام پر ان سے کچھ کہے' تو وہ اس کی بات ضرور سنیں گے۔ اچھا! تو شاہی جھنڈے تلے کون کون سی فوجیں جمع ہونے کو تیار ہیں؟"

مہابت خان نے ایک ایسا پیچیدہ سوال کر دیا تھا جس کا صحیح جواب' میر بخشی ہی دے سکتا تھا لیکن نور محل چونکہ جبری بھرتی اور فوج کی از سرنو تنظیم کے سلسلے میں ہفتوں کام کر چکی تھی۔ اس لئے اس نے نہ صرف یہ کہ افسروں اور سپاہیوں کے نمبر تک مہابت خاں کے سامنے رکھ دیئے بلکہ یہاں تک بتا دیا کہ سوار دستوں کے گھوڑوں کی حالت کیا ہے اور انہیں لام بندی کے مرکز لاہور تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی۔

مہابت خاں ایک عورت کی زبانی یہ تمام جزئیات سن کر حیرت میں رہ گیا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ان تمام معلومات سے آگاہ ہونے کے بعد کہا! ہاں! ہاں! فدائی خاں کے لئے دو رجمنٹیں کافی ہیں ..... اور شہزادہ پرویز چھ ہزار فوج لے کر آ رہا ہے ..... فوجی اجتماع کے لئے بھی بہت اچھی جگہ انتخاب کی گئی ہے ..... لیکن یہ تمہیں کس نے بہکا دیا کہ توپ خانے کا انتظار نہ کیا جائے۔"

"توپ خانہ ہمیشہ دیر سے آتا ہے" اس نے بتایا "ہاتھیوں کی طرح' جن کا لشکر کے ساتھ ہونا بہتر ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے! تم نے ایک موقع پر کہا تھا کہ میدان جنگ میں پہلے حملے کا فیصلہ صرف گھوڑ سوار کرتے ہیں اور تمہاری یہ بات میں اب تک نہیں بھولی۔"

مہابت خان ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "خدا کی قسم! آپ کے عورت ہونے سے ایک اچھا کمان دار چھن گیا۔" مگر اسے پھر شبہ ہوا!

"مگر علیا حضرت میری فوج کے معاملہ میں دخل تو نہ دیں گی؟"

"کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میرے دل میں کیا ہے!" اس کی نیم مجنونانہ ہنسی ایک سسکی میں تبدیل ہو گئی اور اس نے مہابت خاں سے کہا "غیار بیگ کے نور نظر! رکاب میں قدم رکھتے ہی تمہارے اختیارات میں اضافہ کر دیا جائے گا۔" اور سب کچھ تمہارے اختیار میں ہوگا۔"

نور محل نے اسے سر ہلاتے دیکھا اور سمجھ لیا کہ اس نے مہابت خان کی وفاداری جیت لی ہے' جس کا رسمی اقرار وہ صرف جہاں گیر کے سامنے کرے گا۔

"مجھے میرے خیمے تک لے چلو۔" اس نے کہا۔

مہابت خان دربار کی باتوں پر غور کرنا چھوڑ کر اپنے چھوٹے سے دستے کی کمان سنبھالنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی تمام افغان امرا نے اپنے چغے اتار دیئے اور ان کی جگہ ریشمیں خلعت اور فوجی وردیاں پہن کر نور محل کے گھوڑے کے دائیں بائیں اور پیچھے مئودبانہ طور پر چلنے لگے۔ آگے آگے سردار مہابت خان جریر کی سفید عبا اور بھورے رنگ کی دستار پہنے چل رہا تھا۔ وہ ہوا کے تیز جھونکے کی لشکر گاہ کے پھاٹک سے گزر کر صدر مقام کی طرف بڑھے جدھر سے وہ گزرتے' ہجوم رستہ چھوڑ دیتا۔ نور محل ان کے نعرے بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ مہابت خاں کی آمد سے باخبر ہو جائیں۔

"سردار مہابت خاں زندہ باد وہ آگئے! اے آمدنت باعث آبادی ما۔"

لوگ برابر نعرے لگا رہے تھے۔ ادھر دروازے پر شاہی نوبت پورے زور سے بجنے لگی۔ جب سردار نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں تو محافظ سواروں نے جلدی سے قطار بندی کی اور دروازے کا رستہ اس طرح صاف کر دیا جیسے کوئی شہزادہ آ رہا ہو۔ محافظ دستے کا سردار خنجر سنبھالتا آگے بڑھا اور اس کے آدمی تلواریں سونت کر دھکا پیل کرتے جرنیل کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ نور محل اس بد نظمی کی عادی ہو چکی تھی اس لئے وہ چنداں حیران نہ ہوئی لیکن مہابت خان نے اپنے دستے کو ٹھہر جانے کا حکم دیا۔

"شکار بیگ!" اس نے محافظوں کے نوجوان افسر کو طلب کیا' جب تم میرے گھوڑے کی دم کے ساتھ ساتھ بھاگا کرتے تھے تو میرا خیال تھا کہ تم گھوڑ سواری کے قواعد کو سمجھ گئے ہو لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے بھنگ پی رکھی ہے۔ کیا گھوڑے پر اسی طرح بیٹھا کرتے ہیں؟"

شکار بیگ کا چہرہ بڑے الاؤ کی روشنی میں شرم کے مارے سرخ ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ جواب دیتا افغان سردار کی نگاہ اس کے سپاہیوں کی بے ترتیب قطاروں پر پڑی۔ وہ آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کے نوجوان افسر کو کس طرح تنبیہہ کی جا رہی ہے۔

"کیا تلوار اٹھانے کا سلیقہ رکھنے والے تمام سپاہی فوج میں چلے گئے ہیں' کہ شاہی محافظوں کا دستہ' چرواہوں کی ٹولی معلوم ہو رہا ہے!" مہابت خاں نے گرج کر کہا؟ "ان لوگوں کو شاہی گھوڑوں پر سوار ہونے کی اجازت کس نے دی ہے؟"

اس کا غیظ و غضب دیکھ کر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اسپ سواروں نے چھاتیاں تان لیں۔ خنجروں کو درست کر کے کندھوں پر رکھا۔ اور پھرتی سے اپنے گھوڑوں کو قطار میں کر لیا اور جب مہابت خاں ان کی قطاروں میں سے گزرا تو ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر تھیں۔

"گھوڑوں سے اتر جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ "اور اپنے خیموں میں جا کر چوسر کھیلو! میں نے تیس فرسنگ کی یہ طویل مسافت ایک دن میں اس لئے نہیں کی کہ یہاں آ کر یہ بے ہنگم تماشا دیکھوں۔"

نور محل کے لئے یہ ایک عجیب منظر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر شکار بیگ سے یہی لفظ کوئی اور کہتا تو وہ اس کی تکا بوٹی کر دیتا لیکن اس وقت ناراضی سے زیادہ اس پر شرمندگی طاری تھی۔ نور محل نے ایک ڈھاڑی والے پٹھان کو کہتے سنا' جو اس کے قریب سے گھوڑا لے کر گزر رہا تھا! اپنی جان کی قسم! یہ ہے آدمی!"

قناتوں کے اندر شاہی محل کے بے شمار خدام مہابت خان کو سلام کرنے کے لئے جمع تھے لیکن اس نے ان کی پروا کرنے کی بجائے نور محل کا انتظار کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آیا وہ گھوڑے سے اتر کر اس کی رکاب تھامے گا یا انجان بن کر اس کی عزت کا تحفظ کرے گا۔ مہابت خاں اپنے گھوڑے پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس انتظار میں کہ نور محل کیا کرتی ہے؟ اس سے نور محل نے جان لیا کہ وہ اس ہجوم کے رو بہ رو اس کا امتحان لینا چاہتا ہے۔

"بادشاہ بیگم نور محل کے حکم سے یہ خیمہ سردار مہابت خاں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔" نور محل بیگم نے کہا اور اس ارغوانی خیمے کی جانب اس کی رہنمائی کرنے لگی جو اس کے اور جہانگیر کے خیموں کے درمیان تھا۔

"علیا حضرت کی خدمت میں فدوی کا مجرا عرض کرو!" اس نے کہا۔ اور گھوڑے سے اتر کر پیٹھ موڑ لی۔ ارسلان نے آگے بڑھ کر نور محل کے گھوڑے کی باگ تھامی اور وہ اتر کر سایوں میں غائب ہو گئی جو خیموں کے درمیان لرز رہے تھے۔

نور محل نے اگرچہ دریا سے آتے ہوئے سردار کو جہانگیر سے وابستہ کرنے کے لئے پورا زور لگایا تھا لیکن ابھی وہ مطمئن نہ ہوئی تھی۔ اسے مہابت خاں کے خیموں کے آس پاس اپنے آدمی کھڑے کرنے تھے تاکہ حریف کا کوئی جاسوس اس کی دربار میں حاضری سے

پہلے' اس تک نہ پہنچ سکے۔ ایک طرف ہرکارے ڈاک لئے دیوان خاص میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسے جہانگیر کے پاس بھی فوراً جانا تھا' جو اس کی طویل غیرحاضری سے یقیناً پریشان ہو گا۔ اس نے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر ریشمی ساڑھی اور زر تار خلعت زیب تن کیا اور کنیزوں سے پوچھا کہ شام کو شہنشاہ نے کن دلچسپیوں میں وقت گزارا۔

"جہاں پناہ نے ایک خاص قسم کا جام شراب تیار کرایا تھا" اسے بتایا گیا "وہ شکایت کر رہے تھے کہ ملکہ عالم انہیں "شاہ نامہ فردوسی" سنانے میں تاخیر فرماتی ہیں۔ اس وقت وہ لڑائیوں کا حال سننے کے لئے بے چین ہیں۔"

نور محل نے جلدی جلدی عطر گلاب ملا اور "شاہنامہ فردوسی" کا بڑا نسخہ اٹھا لیا۔ کنیزوں نے اس کے سر پر نقاب باندھی اور خواجہ سرا شاہی خیمہ کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے گئے۔

اگلے دن صبح جہانگیر نے مہابت خان سے دربار عام میں ملاقات کی۔ اس سے پہلے وہ آصف خان کو حاکم بنگالہ مقرر کرنے کا اعلان کر چکا تھا۔ شہنشاہ نے افغان سردار کا پرتپاک خیرمقدم کیا اور اس کی تنخواہ بڑھانے کے علاوہ اسے گیارہ ہزاری منصب سے بھی سرفراز فرمایا۔ اب وہ ایک معمولی افسر نہ رہا تھا۔ بلکہ آصف خاں کے ہم پلہ ہو گیا تھا۔ جو سلطنت کا ایک اہم رکن تھا۔ نور محل نے پورا منصوبہ بڑی احتیاط سے تیار کیا تھا اور وہ جہانگیر کو بھی قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

سردار مہابت خان مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عبداللہ خاں اور خواجہ ابوالحسن نے تیزی سے بڑھ کر اسے سلام کیا۔

"اب تو غیار بیگ کا فرزند مطمئن ہے؟" جب وہ پردے کے قریب گیا' تو نور محل نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین آیا کہ ہم نے دریا کے کنارے جو کہا۔ وہ ٹھیک تھا؟"

سردار نے اعتراف کیا "فدوی مطمئن ہے اور اسی وقت تک مطمئن رہے گا' جب تک مرحمت خسروانہ اس کے شامل حال ہے۔"

نور محل سپہ سالار افواج کے کاموں میں دخل دینے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی۔ جب مہابت خان نے نئی ذمہ داری سنبھال لی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اب وہ آنے والے واقعات کی بے تابی سے انتظار کرنے لگی۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اسے فوج سے اس مفہوم کی اطلاعیں موصول ہونے لگیں کہ مہابت خان نے جن افسروں کو ترقی دی ہے وہ بے حد نااہل اور نکمے ہیں۔ لیکن یہ وہ جھوٹی اطلاعات تھیں' جو بڑی ہوشیاری سے تراشی گئی تھیں اور جنہیں نور محل نے فوراً بھانپ لیا تھا۔ اسے جہانگیر کو یہ باور کرانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ ان اطلاعات کا مقصد محض وفادار افسروں کو بدنام کرنا ہے۔ لیکن جہانگیر نے اسے ایک اور مشکل میں ڈال دیا۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ مہابت خان کی کوششوں سے واقعی ایک وفادار فوج مرتب ہو رہی ہے' اس میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اب اس نے روزانہ تلواروں خلعتوں اور زرنقد کی صورت میں نئے افسروں کو شاہی انعام و اکرام سے نوازنا شروع کر دیا۔ اسے یہ بھی اصرار تھا کہ شاہی لشکر زیادہ سے زیادہ مہابت خاں کے نقش قدم پر چلے۔ یہاں تک کہ اس نے ہراول فوج کے سردار! عبداللہ خاں کو عنایت خسروانہ کے طور پر اپنا جنگی ترکش عطا کر دیا! لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نور محل کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ جہاں گیر کو ایک بار پھر عوام کی نگاہوں کے سامنے لائے اور اسے "مغل اعظم" کے فرزند کی حیثیت سے پیش کرے۔

فروری ۱۶۲۳ء میں معرکب ہمایونی شاہراہ اعظم پر آہستہ آہستہ لاہور سے آگرہ کی طرف چلا۔ ادھر مہابت خاں اور خرم اپنے عظیم لشکروں کے ساتھ' ایک دوسرے سے ٹکر لینے کے لئے آگرہ کے میدانوں کی طرف قدم زن تھے۔

مارچ کے آخر میں لڑائی ٹھن گئی لیکن میدان جنگ کی پہلی ہی خبر نے نور محل کو حواس باختہ کر دیا۔

"عبداللہ خان دس ہزار اسپ سواروں کی ہراول فوج کے ساتھ' حملے کے بہانے' دشمن سے جا ملا ہے۔"

اس کے بعد گھنٹوں گزر گئے لیکن مزید کوئی اطلاع نہ ملی۔ جہانگیر برابر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ کبھی غداروں کو برا بھلا کہتا اور کبھی دعائیں مانگتا کہ کوئی معجزہ ظاہر ہو اور شاہی فوج کو بچائے۔ جس کی تعداد اب دشمن کی فوج سے نصف رہ گئی تھی۔

"اس عبداللہ بدبخت کا نام اب لعنت اللہ رکھو۔" اس نے حکم دیا "میرے سامنے اس کا کوئی نام نہ لیا جائے۔"

لیکن نور محل جانتی تھی کہ عبداللہ خاں سے بھی زیادہ قابل افسر اس کے خلاف سازش

کر چکے ہیں اور اس نے جہانگیر کو یاد دلایا کہ ابھی مہابت خان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ ایک افغان افسر گھوڑا دوڑاتا دروازے پر آ کر رکا۔ اور گھوڑے سے اتر کر سیدھا جہانگیر کے پاس پہنچا' زمین بوسی کے بعد اس نے سب کو سنانے کے لئے' بلند آواز میں کہا۔

"غلام' مہابت خان کی جانب سے فتح کی خوشخبری لایا ہے۔"

نور محل کو کئی دن کے بعد معلوم ہوا کہ مہابت خاں کی فتح کس حد تک فیصلہ کن تھی۔ بکرماجیت قتل کر دیا گیا تھا' خرم کی فوجیں تتر بتر ہو کر بھاگ گئی تھیں اور مہابت خاں کے سوار اب بھی ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ عبداللہ خاں کے ہزاروں آدمی شاہی لشکر سے پھر آ ملے تھے ان کے علاوہ سادات بارہہ بھی شہنشاہ کی طرف سے جنگ میں شامل ہو گئے تھے' جو اس سے پہلے غیر جانب دار تھے۔ اگر میواڑ کے راجپوت مدد نہ کرتے' تو خرم بھی اپنے لشکر سے کٹنے کے بعد گرفتار کر لیا جاتا۔ اب وہ بھاگ کر دکن پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہانگیر کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے توپ خانے اور ہاتھیوں سے شاہی لشکر کو کمک پہنچائی اور تمام وفادار افسروں کو زر و جواہر سے سرفراز کیا' مہابت خان کو اس نے وہ سفید علم عطا کیا۔ جو چنگیز خاں کے زمانے سے مغلیہ فوج کا خاص نشان تھا۔ جب راجہ بکرماجیت کا سر اس کے حضور پیش کیا گیا۔ تو اس نے اسے غور سے دیکھا اور اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کسی شخص نے مروارید کے لالچ میں اس کے کان کاٹ لئے ہیں۔ اس نے "تزک جہانگیری" میں لکھوایا۔

> "اپنے کس کس غم کو لکھوں! ادھر گرم ہوا کا ضعف اور کوفت' جو میرے مزاج سے قطعاً ناسازگاری رکھتی ہے' ادھر سواری اور دوسرے ترددات! سب سے بڑھ کر یہ کہ ان حالات میں ایک ایسے ناخلف کی طرف جانا پڑ رہا ہے! ..... اور قندھار کی مہم میں تعویق و توقف کی گرہ پڑ گئی امید ہے کہ حق تعالیٰ ان نگرانیوں کو دل سے دور کر دے گا ..... مجھ سا باپ کہ درحقیقت میں اس کا مجازی آفرید گار ہوں' میں نے اپنی زندگی میں اسے سلطنت کے اعلیٰ منصب پر پہنچایا اور اس سے کوئی چیز دریغ نہیں رکھی' اس کے باوجود وہ مجھ

سے ایسا کرے یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں بہبودی کا منہ نہ دیکھے گا۔

نور محل بڑی دلچسپی سے جہانگیر کو یہ عبارت لکھواتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے درخواست کی جو جہانگیر کو بے حد پسند آئی۔ "شیخو بابا!" آپ نے تمام خدام کو اپنے مراحم خسروانہ سے نوازا ہے۔ کیا آپ کی کنیز کو وہ طبل و علم واپس نہیں مل سکتے جو کسی زمانے میں حضور نے میرے والد کو عطا کئے تھے۔

"ہم تمہاری درخواست کو شرف قبول بخشتے ہیں! مہرو!" اس نے کہا! "عورتوں کو جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن تم یقیناً مردانہ جرات کی مالک ہو! اب کہ ہم ایک خاص نوعیت کی جنگ میں مصروف ہیں، تمہیں سپاہ و علم رکھنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔

خانہ جنگی تین برس تک ختم نہ ہو سکی۔ اس عرصہ میں شہزادہ خرم بغاوت و فرار کی منزلوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ مہابت خان اور شہزادہ پرویز میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے رہے، آصف خاں بنگال میں حکومت کرتا رہا اور ہندوستان کی عنان اقتدار کامل طور پر نور محل کے ہاتھ میں آ گئی۔

☆☆☆

(۶)

کہتے ہیں! نور محل جتنی حسین و دلکش اس زمانے میں تھی پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی وہ بار بار مجمع عام میں آتی اور اس کا نرم و نازک وجود دربار کا ایک اہم جزو بن گیا تھا۔ اس کا چہرہ زیر نقاب ہوتا' لیکن لوگ اس کی پرکشش آنکھوں میں کھوئے رہتے۔

جب کبھی جہانگیر صاحب فراش ہوتا' وہ "جھروکے" میں آکر عوام کو درشن دیتی اور محافظوں کے ذریعے ان کی عرضیاں وصول کرتی۔ جیسے ہی لوگوں کو معلوم ہوا کہ ملکہ عالم امرائے دربار کے مقابلہ میں کہیں رحم دل ہیں' عرضیوں میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا۔ جو عورتیں جہانگیر کے سامنے جانا نہ چاہتی تھیں' وہ گھنٹوں انتظار کرتیں اور جب نور محل کی پالکی گزرتی تو اس کے نام کی دہائیاں دے کر' یا اس کے حضور اپنی درد انگیز درخواستیں پیش کر کے اس کی توجہ حاصل کرتیں۔

اب خواجہ سراؤں کے سردار عنبر نے بھی اس کی "نیم پردگی" پر مضطرب ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ناقابل فہم مشیت کے تحت وہ ایک ایسی ملکہ بن گئی تھی' جو پردے میں رہ کر حکومت کرتی تھی اور جس کی مثال اسلامی ممالک میں اور کہیں نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ خود "قانون ساز" تھی' اس پر "قانون شکنی" کا الزام کون عائد کر سکتا تھا؟ نور محل کے ملکہ بننے کے بعد خواجہ سرا عنبر کی اہمیت خود بخود بڑھ گئی۔ جب وہ خچر پر سوار ہو کر یورپ سے آتی ہوئی ارغوانی مخمل کی صدری اور کمخاب کا لبادہ پہنے باہر نکلتا تو دیکھنے والوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتیں۔

"اب تو راستہ صاف ہو گیا" اس نے بادشاہ بیگم کی معمر دایہ دلا رام سے کہا۔ وہی مثل ہے! "سیاں بھئے کوتوال۔ اب ہمیں ڈر کس کا؟"

"ٹھیک ہے!" دلا رام کو اسی کی طرح توہم پرست تھی' بولی: "مگر تم بھی چادر سے زیادہ پاؤں نہ پھیلاؤ! اللہ والوں کی سی زندگی بسر کرو اور دنیا کے ٹھاٹ باٹ میں اپنا دل نہ

الجھاؤ!"

دایہ کو بھی "داروغہ نسواں" کا خطاب مل چکا تھا۔ جس سے وہ بے حد خوش تھی۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی خطاب نہ تھا اور دلا رام کا کام صرف یہ تھا کہ ان یتیم لڑکیوں کی دیکھ بھال کرے، جو بہ تعداد کثیر قلعہ آگرہ میں آ گئی تھیں۔

"کوئی احمق ہی پیالے کو لبالب دیکھ کر شکایت کرتا ہو گا" عنبر نے جواب دیا۔ وہ عملی آدمی تھا اور اپنے آپ کو سیدھی سادی دیہاتن دلا رام سے جو ہمیشہ شگون تلاش کرتی رہتی تھی، کہیں زیادہ عقل مند تصور کرتا تھا۔ وہ نور محل کے سایہ عاطفت میں پل رہا تھا اس لئے جب تک اس کی "ملکہ عالم" پر کوئی آنچ نہ آئے اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔

دراصل خواجہ سرا کا خیال تھا کہ ملکہ بننے کے بعد نور محل کو ذہنی آسودگی میسر آ چکی ہے، وہ افسروں کے کام کی نگرانی بڑی سختی سے کرتی اور لڑائی جھگڑوں کو حتی الوسع روکتی۔ عنبر جب کوئی عرش داشت اس کے سامنے پیش کرتا، اس کا عنوان دیکھتے ہی وہ سارا مطلب سمجھ جاتی۔ اس کی استعداد و لیاقت کا یہ عالم تھا کہ ان دشواریوں کو چٹکی بجاتے میں حل کر دیتی، جو بڑے بڑے سال خوردہ لوگوں کو الجھا دیتیں اور جن کی وجہ سے کبھی کبھی تلواریں تک میانوں سے نکل آتیں۔

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں "جوہر شناسی" کا خاص ملکہ تھا۔ وہ ایک دفعہ جب کوئی خدمت کسی کے سپرد کر دیتی، تو آخر وقت تک اس پر اعتماد کرتی، لیکن اس کے کام پر بہرحال نگاہ رکھتی۔ چنانچہ کسی شخص کو دھوکے اور فریب سے کام لے کر دولت مند بننے کی جرات نہ ہوتی۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اسراف اسے کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ منشی کے کاغذات زرکار ملفوف میں گزارنے جاتے اور وہ ملفوف بعد کو پھینک دیا جاتا۔ نور محل نے یہ حکم دیا کہ اسے ضائع کرنے کی بجائے، ہاتھی اور گھوڑے کی پوشش کے کام میں لایا جائے۔ جب کبھی وہ کسی کو جاگیر عطا کرتی تو "قدرالسلطنت" اسے جوں کا توں منظور کر لیتا کیوں کہ تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ نور محل کی مخالفت بے سود ہے۔

وہ فوجداری مقدمات کا غور سے مطالعہ کرتی اور جہاں تک ممکن ہوتا سزائیں معاف کر دیتی۔ حتیٰ کہ جہاں گیر نے اس کے قلم کو "خامہ کرم" کا خطاب دے رکھا تھا۔ لیکن عنبر جانتا تھا کہ اس نے جہانگیر کے خلاف سازش کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کیا۔

خواجہ سرا کو یقین ہو چکا تھا کہ نور محل اور جہانگیر کے عشق میں اب کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ جہانگیر جس قدر کمزور اور عیش پسند ہوتا گیا نور محل کی محبت اس کے دل میں بڑھتی گئی۔ اس کے بغیر وہ بے چین ہو جاتا اور کہتا کہ میں "نیم جان" ہو گیا ہوں۔ نور محل سے اپنی محبت کے اظہار میں وہ خوشی محسوس کرتا تھا۔ یہاں تک کہ درباری شاعر نور محل کے بغیر جہانگیر کا تصور نہ کر سکتے تھے۔

چنانچہ فراش نے ایک بار کہا۔

"اس سے پہلے کبھی ایسی عورت دیکھی ہے؟ جو داشتہ بھی ہو اور بیوی بھی۔ خادمہ بھی ہو اور محبوبہ بھی، شاعر بھی ہو اور مشیر سلطنت بھی۔"

اس پر نظیری نے اضافہ کیا: "بلکہ تیس ہزاری بھی!" اس نے لکھا تھا۔

"میں نور محل کی ایک چشم التفات پر یہ منصب قربان کر سکتا ہوں! اب اسے مدحیہ اشعار کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ وہ جہانگیر کے پہلو میں ہے اس لئے جہانگیر اس کی ستائش کے سوا کچھ پسند نہیں کرے گا۔"

شاعروں اور درباریوں پر واضح ہو چکا تھا کہ حاجت برآری کے لئے اب محض جہانگیر کی نگاہ کرم سے بات نہیں بن سکتی۔ چنانچہ ان کی درخواستیں نور محل کے حضور پیش ہونے لگیں۔ اگر حسن اتفاق سے کسی کو شرف باریابی حاصل ہوتا تو وہ اپنے تئیں ایک ایسی باپردہ خاتون کے سامنے پاتا، جو اسے اپنی توقع کے خلاف پا کر ایسی نگاہوں سے دیکھتی، جن میں ترحم سے زیادہ تفنن ہوتا۔

جہاں تک فراش کا تعلق ہے اس کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ اب جہانگیر شاہی محل میں مے نوشی کی محفلیں منعقد نہ کرتا جو فراش کے لئے شاہی انعام و اکرام سے سرفراز ہونے کا باعث تھیں۔ آصف خاں بے شک اس کا سرپرست تھا لیکن وہ بھی پہلے کی طرح اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھا سکتا۔

"خرم ہتھیار ڈالے گا تو جشن کی صورت نکلے گی!" نظیری نے کہا۔

فراش نے سر ہلایا "ممکن ہے جہانگیر شہزادے کو معاف کر دے لیکن نور محل خسرو کا خون کس طرح معاف کرے گی؟"

"خرم کو معاف کر دینا چاہئے ورنہ ولی عہد کون ہو گا؟"

"اللہ ہی جانے۔ نور محل خواہ مٹی کے مادھو کو ولی عہد بنائے لیکن جب تک جہانگیر

زندہ ہے وہ خرم کو تسلیم نہیں کرے گی۔"

شاعر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ خرم' جس نے خانہ جنگی کے شعلے دکن سے لے کر بنگال اور شمالی ہند تک بھڑکا دیئے تھے۔ باغی راجپوت سردار میدان جنگ میں مارے گئے اور غدار عبداللہ فقیری کا لباس پہن کر غائب ہو گیا۔ خرم نے مارے مارے پھرنے کے بعد' باپ کے سایہ رحم و کرم میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آصف خاں کے ذریعے ایک خط بھیجا' جس میں اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور یہ بھی لکھا کہ میں بیمار ہوں۔

یہ خط بظاہر جہانگیر کے نام تھا' لیکن دراصل نور محل کے لئے تھا۔ چنانچہ آصف خاں نے نور محل سے شہزادے کے ساتھ نرم برتاؤ کی سفارش کی۔

"مہرو! خرم مدتوں سلطنت کا ایک اہم ستون رہا ہے۔ پھر تاج و تخت کا وارث بھی اور کون ہے؟ بہتر ہے لڑائی کے خون میں نفرت کا زہر نہ ملایا جائے!"

"نور محل نے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر منہ موڑ لیا : "خسرو اس کی تحویل میں تھا جب اسے زہر دیا گیا اور خون اس وقت بہا جب بیٹے نے باپ پر فوج کشی کی۔"

تاہم خرم کی جان بخشی کر دی گئی اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ باقی ماندہ دونوں قلعے شاہی فوج کے حوالے کر دے۔ اپنے دونوں بیٹوں ---- دارا اور اورنگ زیب ---- کو بطور ضمانت پیش کرے۔ خود کنارہ کش ہو کر دکن کی جاگیر پر رہے اور باپ سے دوبارہ ملنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔

آخری شرط دیکھ کر آصف خاں بے حد پریشان ہوا۔ خرم اس کا داماد تھا اور وہ خاصی مدت سے جہانگیر کی خدمت کر رہا تھا : "کیا شہزادے کو جلا وطن کیا جا رہا ہے؟" اس نے فراش پر بھروسا کرتے ہوئے کہا "اس سے تو گونگا اور بہرہ ہونا ہی اچھا ہے۔ اگر اسے گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا جاتا تو خرم کا راستہ آسان نہ ہو جاتا؟"

"قسمت کا چکر چلتا رہتا ہے۔" فراش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اسے یقین تھا کہ خرم کی شکست نور محل کے حسن تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگر جہانگیر کا بس چلتا تو وہ ناراضی کے باوجود اپنے لخت جگر کو اپنے پاس آنے سے نہ روکتا۔ لیکن نور محل کی احتیاط کو گوارا نہ تھا کہ خرم خطا معاف ہو جانے کے بعد ایک "غازی" کی حیثیت سے دربار میں پیش ہو۔

"ہاں' لیکن اس کی رفتار سست ہوتی ہے!" آصف خاں نے جواب دیا! "جس ہاتھ نے خرم کی مدد کی' وہ قسمت کا پانسا پلٹنے کے بعد انعام بھی پائے گا۔"

آصف خاں نے یہ بات سرسری طور پر کہی تھی۔ لیکن فراش اس میں خاص مفہوم تلاش کرنے لگا۔ "شہزادے کو اب سکون کہاں مل سکتا ہے؟" اس نے کہا "رحم و کرم کے تمام دروازے اس پر بند ہو چکے ہیں اور اس کا علم ٹوٹ چکا ہے۔ اب تو اسے ارجمند بانو بیگم کے دونوں بچوں کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہو گی۔

وہ جانتا تھا کہ یہ دونوں بچے آصف خاں کے نواسے ہیں اس لئے وہ داروغہ توشہ خانہ کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"خرم کو مرصع اشعار اور نادر تحفے ہمیشہ مرغوب رہے ہیں!"

فراش مسکرایا۔ حقیقت یہ تھی کہ خرم حقائق پسند انسان تھا' جسے شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی' لیکن شاید آصف خاں کی منشا یہ تھی کہ فراش اس کے پاس جا کر رہے مگر تحفہ وہ کہاں سے لائے گا؟ اس نے کہا! "افسوس! میرے پاس شہزادے کے لائق کوئی تحفہ نہیں!"

"شاید میرے پاس ہو۔" آصف خاں نے جواب دیا۔ یہ تحفہ فراش کو اس وقت ملا' جب وہ دکن روانہ ہونے لگا۔ پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد جب نگرانی کا خوف نہ رہا تو فراش نے تمام ملازموں کو خیمے سے باہر نکال دیا اور تحفہ نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ اپنے ہمراہ کوئی ایسا تحفہ نہ لے جانا چاہتا تھا جسے دیکھ کر شہزادہ آگ بگولا ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر آصف خاں نے کوئی ایسا تحفہ بھیجا ہے جو خرم کو مغل شہنشاہ کے قریب لانے میں معاون ثابت ہو' تو قاصد کی نظر سے گزرنا چاہئے۔ آصف خاں نہ صرف ایک وفادار درباری۔ بلکہ نور محل کا بھائی بھی تھا اس لئے خواہ اسے سزا نہ دی جا سکے لیکن قاصد کو تو تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر مراسلہ میں مصالحت کا کوئی قابل ذکر پہلو ہے' تو وہ اس کا معقول معاوضہ وصول کر سکتا ہے یا کم از کم آصف خاں پر ہی دباؤ ڈال سکتا ہے!

خوش قسمتی سے اسے مہر نہ توڑنی پڑی کیونکہ تہ کیا ہوا کاغذ صرف ریشم کے دھاگے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر دیکھا تو وہ دنگ رہ گیا۔ کاغذ پر کوئی تحریر نہ تھی بلکہ اس میں چار مختلف قسم کی چیزیں لپٹی تھیں۔

"اس نے علامتوں کے ذریعے پیغام بھیجا ہے۔" شاعر نے دل ہی دل میں سوچا۔

اس زمانے میں لوگ عام طور پر چونکہ پڑھے لکھے نہ ہوتے تھے اس لئے وہ علامتوں سے کام چلا لیتے تھے لیکن شہزادہ خرم کو جو یہ چار چیزیں بھیجی گئی تھیں۔ان کا مطلب سمجھنا

مشکل تھا۔ لوہے کی ایک زنگ خوردہ انگشتری' جس کے ساتھ باز کے پنجوں کی زنجیر کا ایک ٹکڑا تھا۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں' اونٹ کے بالوں کی رسی اور ڈھاک کا ایک شگوفہ' جو انگارے کی طرح سرخ تھا۔

شاعر نے سوچا کہ آخری چیز کے معنی تو وفاداری کے ہیں لیکن باقی کی تین چیزوں سے کیا مراد ہے؟ اونٹ کے بالوں کی رسی سے شاید سفر مراد ہو۔ کیوں کہ یہ اسباب باندھنے کے کام آتی ہے۔ اسی طرح ٹوٹی ہوئی چوڑی کا مطلب غالباً بیوہ تھا۔ اس زمانے میں جس عورت کا شوہر مر جاتا وہ اپنی چوڑیاں توڑ دیتی۔ لیکن کون سی بیوہ؟ ہندو بیوہ یا کوئی اور؟ باز کے پنجوں کی زنجیر کے ٹکڑے کا مفہوم اس کے ذہن میں نہ آ سکا ---- ممکن ہے قفس سے رہائی کی جانب اشارا ہو۔

"بہرحال خرم ان کے معنی جانتا ہو گا" فراش نے اپنے آپ کو سمجھایا "وہ خود ہی سمجھ جائے گا کہ کون وفادار ہے؟ کس نے سفر کیا ہے؟ اور بیوہ کون ہے؟"

کچھ دیر کے بعد اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر ان چیزوں کو کسی خاص ترتیب سے رکھ دیا جائے تو شاید ان کا مفہوم سمجھ میں آ جائے۔ اس نے علامتوں کو زندہ چیزوں سے منسوب کر کے سوچنا شروع کیا۔ "بیوہ" کون ہو سکتی ہے؟ نور محل؟---- نہیں' اس کی تو اب شادی ہو چکی ہے ---- تو خسرو کی بیوہ؟ وفادار تو ظاہر ہے بھیجنے والا ہی ہو سکتا ہے۔ اب اگر چیزوں کو اسی ترتیب سے پڑھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ----

"نور محل---- ایک بیوہ---- آصف خاں وفادار---- قید سے رہائی---- سفر----!"

لیکن بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ فراش نے سوچا البتہ آصف خاں نے ضرور کوئی خفیہ پیغام بھیجا ہے جس کا مطلب شہزادہ خرم ہی سمجھ سکے گا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

بایں ہمہ یہ چیزیں چونکہ بے ضرر تھیں اس لئے فراش نے انہیں شہزادے تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا لیکن وہ خرم کے ساتھ جلا وطنی کے ایام بسر کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے بیٹھتے ہی کہا مجھے آصف خاں نے جلد واپس ہونے کا حکم دیا تھا۔ شہزادہ خرم نے تحائف کو بڑی بے تابی سے کھولا اور انہیں ایک خاص ترتیب سے فرش پر پھیلا دیا۔ اس کی نکیلی ڈاڑھی میں وقت سے پہلے ہی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ وہ تخت کی بجائے عام

آدمیوں کی طرح قالین ہی پر بیٹھا تھا۔ اس کی بے مہر بھوری آنکھوں کو دیکھ کر فراش نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ ان آنکھوں کے رحم و کرم پر نہیں ہے۔ خرم نے تحائف کو جس ترتیب سے رکھا وہ یوں تھی۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ---- ڈھاک کا شگوفہ ---- اونٹ کے بالوں کی رسی ---- اور باز کے پنجوں کی زنجیر کا ٹکڑا۔

شہزادہ خرم نے تحائف سمیٹ کر ایک طرف پھینک دیئے' وہ پیغام پڑھ چکا تھا۔ اور یہ چیزیں اب اس کے لئے بیکار تھیں۔

"اپنے آقا آصف خاں سے کہو! اس نے شاعر سے مخاطب ہو کر کہا "شاہین اس وقت تک پرواز نہ کرے گا جب تک شکار کو قتل نہ کر دیا جائے۔"

فراش رستے بھر اس پیغام کے مفہوم پر غور کرتا رہا۔ یہ عجیب شاہین ہے جو اس وقت تک پرواز نہ کرے گا جب تک اس کے شکار کو کوئی اور نہ مار دے!

اس نے خرم کا پیغام داروغہ توشہ خانہ کو پہنچایا۔ لیکن اس نے بھی اس پیغام پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔

"ایک برس گزرا۔" آصف خاں نے خود ہی کہا کہ "میں نے شہزادے کو ایک کوہستانی شاہین بھیجا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے اسے اڑنے کی مشق نہیں کرائی گئی!"

"جی ہاں۔" شاعر نے جیسے مطلب سمجھتے ہوئے کہا "تاہم حضور کی چشم فیض سے تمام خدام بہرہ یاب ہوتے ہیں!"

آصف خاں کے حکم سے فراش کو ایک تھیلی انعام کے طور پر دے دی گئی۔ تھیلی خاصی وزنی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن سکوں کی کھنک سے شاعر کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ تمام مہریں نقرئی ہیں۔ اس نے خفیہ برداری کے لئے اتنا لمبا سفر کیا تھا۔ کیا اس کا انعام چند روپہلی سکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

خرم کی سپر اندازی کے تھوڑے عرصے بعد جہانگیر کو زہر دینے کی پہلی کوشش کی گئی۔ مطبخ میں جو لوگ کھانا پکنے پر مامور تھے انہیں تو کوئی خرابی نظر نہ آئی لیکن ایک خواص نے بادام کا حلوہ چرا کر کھایا تو وہ فوراً بیمار ہو گئی۔ اس روز جہانگیر نے کھانا چکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ جب طبیبوں نے بچے کھچے کھانے کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ بادام کے حلوے کے علاوہ چوزوں کے قیمے میں بھی زہر ملایا گیا تھا۔

نور محل کو پہلے ہی اس کا شبہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خسرو کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے بعد جہانگیر کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی اس نے مطبخ شاہی کے تمام نوکروں کو نکال دیا اور ان کی جگہ اپنے آدمی رکھے لیکن زہر خورانی کا واقعہ جہانگیر کے دل و دماغ پر حاوی رہا۔ وہ اپنے مخصوص منطقی انداز میں سوچتا رہا کہ اس کی جان لینے کی کوشش کون کر سکتا ہے؟ اس نے شاعروں کو برخاست کیا اور خود ایک سادھو کی کٹیا کی جانب روانہ ہوا۔ جہانگیر اس سادھو سے بہت متاثر تھا کیونکہ وہ چپ سادھے گیان دھیان میں کھویا رہتا تھا۔ سادھو کی کٹیا پہاڑ کے ایک غار میں تھی اس لئے جہانگیر کو اس تک پہنچنے کے لئے پتھروں پر پیدل چلنا پڑا۔ غار کا منہ بھی بہت چھوٹا تھا اور جہانگیر بمشکل اس میں داخل ہو سکا۔ اس نے جھک کر سادھو کو سلام کیا جس کی انگلیاں سوکھ کر خم کھا گئی تھیں۔ جد روپ گو سائیں اس غار میں برسوں سے مقیم تھا' جس میں آدمی سیدھا کھڑا بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بادشاہ نے اس کا ہاتھ چھوا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ سورج کی شعاعوں میں جہانگیر کے عمامے کا بڑا ہیرا جگمگانے لگا۔ اس نے بڑے سلیقے سے گفتگو کی ---- کیا وہ گھنٹوں ودوان پنڈتوں کے مباحثے نہیں سن چکا تھا؟

سادھو کی خاموشی سے اسے خاصا اطمینان حاصل ہوا۔

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان عقل کا تابع ہے اور جانور خداداد جبلت کے؟"

سادھو یہ سن کر چونکا اور اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا : "اے بادشاہ! کیا تنہا عقل انسان کی رہنمائی کے لئے کافی ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں؟ عقل ہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔"

جد روپ گو سائیں نے جذباتی ملاؤں اور پادریوں کی طرح بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کی۔ گیان دھیان نے اس کا دماغ روشن کر دیا تھا۔

"اگر انسان عقل پر قانع ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اسے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔"

اپنی تحسین پسندی اور دوسرے مذاہب سے رواداری کے باوجود' جہانگیر اسلامی عقائد کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ اس نے طفلانہ اصرار کے ساتھ استدلال کیا : "ہماری زندگی مقدرات کی تابع ہے۔ ہم ایک ان دیکھے رستے پر چل رہے ہیں اور قبر کے دروازے سے گزر کر ایک دوسرے عالم میں پہنچنے والے ہیں۔ "اے برگزیدہ انسان! کیا یہ درست نہیں

ہے؟!"

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا ..... ہمارا کام تو صرف راستہ تلاش کرنا ہے!"

سادھو کی باتوں سے جہاں گیر کی تشفی ہو گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سادھو کے پاس سے اٹھ کر چلا آیا۔ وہ اس ملاقات سے بے حد خوش تھا اور دل ہی دل میں اس سادھو کی فہم و بصیرت پر حیران تھا' جس نے اس پاپی دنیا سے اپنا دامن کھینچ لیا تھا۔ اس پر خاصی دیر تک استغراق کی کیفیت طاری رہی۔ اسی اثناء میں نور محل کو معلوم ہوا کہ جہانگیر نے ایک مذہبی مناظرے کا اہتمام کیا ہے جس میں ایک کٹر ملا اور گوا کا ایک پادری حصہ لے رہے ہیں۔

جہانگیر نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد پوچھا "کیا تم لوگوں کا ایمان قرآن اور انجیل پر اتنا پختہ ہے کہ یہ صحائف تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے بچا لیں گے؟" دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اثبات میں جواب دیا۔ اس پر جہانگیر نے ایک بہت بڑا گڑھا کھدوایا اور اس میں لکڑیاں رکھ کر انہیں آگ لگوا دی۔ پھر حکم دیا کہ مسلمان عالم اپنے ہاتھوں میں قرآن اور پادری اپنے ہاتھوں میں انجیل لے کر بھڑکتے شعلوں میں کود پڑیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس کا ایمان راسخ ہے۔

بظاہر دونوں اس آزمائش سے گزرنے پر آمادہ نظر آتے تھے لیکن ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہل دوسرا کرے۔ اسی حیص بیص میں خاصا وقت گزر گیا۔ آخر جہانگیر نے قہقہہ لگایا اور دونوں کو اس ابتلا سے بچا لیا۔

اسی دن شام کو شہنشاہ نے ہاتھیوں کی لڑائی کے انتظام کا حکم دیا۔ پریڈ کے میدان میں دو کوہ پیکر ہاتھیوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر کے درمیان میں ایک کچی دیوار کھینچ دی گئی۔ اس کے بعد ڈھول پیٹ کر دونوں کو اشتعال دیا گیا ---- ہاتھی سونڈ گھما کر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ وہ بری طرح چنگھاڑ رہے تھے۔ اسی کشمکش میں کچی دیوار گر پڑی۔ ایک ہاتھی نے زور لگا کر دوسرے کو پیچھے دھکیل دیا اور اس کے مہاوت کو اپنے سونڈ سے ہلاک کر دیا۔ بے مہاوت کا ہاتھی مار کھا کر دریا کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن پہلے ہاتھی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں لڑتے لڑتے دریا میں جا پڑے۔ آخر ان کے محافظوں نے مشعلیں دکھا دکھا کر انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ جہانگیر یہ سارا

تماشا شاہی چتر کے نیچے بیٹھ کر دیکھتا رہا۔

ہاتھیوں کی تقریباً آدھی درجن لڑائیوں کا تماشا کرنے کے بعد جہانگیر کو قدرے اطمینان نصیب ہوا اور اس رات وہ نور محل کو دن بھر کے واقعات سنانے اس کے خیمے میں آیا۔

"مہرو! اب میں بڑی حد تک تازہ دم ہو چکا ہوں" اس نے وہی واقعات جو نور محل اپنے آدمیوں کی زبانی سن چکی تھی دہراتے ہوئے کہا "لیکن سادھو بالکل خاموش رہا۔ شاید اس نے اپنے دل کی ساری باتیں مجھ سے نہیں کیں۔ کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ موت ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہے؟"

نور محل نے دبی زبان سے یہ شعر پڑھا:

زاہدا! ہول قیامت مفگن در دل ما
ہول ہجراں گزراندیم' قیامت معلوم!

"کیا یہ شعر تم نے کہا ہے؟" جہانگیر نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"جی ہاں' میرا ہی شعر ہے۔ اب ہم میں جدائی کون ڈال سکتا ہے؟"

"پہلے بھی ہمارے درمیان کون حائل تھا؟" جہانگیر نے رشک آمیز لہجے میں پوچھا۔

بیماری میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے جذبہ محبت نے بھی ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نور محل ہر وقت اس کے پاس رہے۔ اسے ایک لمحے کی بھی جدائی گوارا نہ تھی۔ اسے نور محل سے شکایت تھی کہ وہ اپنا بیشتر وقت امرائے دربار سے مشورے کرنے میں بسر کر دیتی ہے۔

"میرے دشمن ہی سانپوں کی طرح ہمارے درمیان حائل ہو سکتے تھے۔" نور محل نے جواب دیا۔

"اور اب؟"

وہ اس انداز سے مسکرائی کہ اس کے حسین رخساروں میں نازک سے خم پیدا ہو گئے اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں یہ ادائے خاص جہانگیر کو دل سے پسند تھی۔

"شیخو بابا! اب ہم قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔

جہانگیر اس تصور سے خوش ہو گیا۔ اس نے مدت سے اپنا شیوہ بنا لیا تھا کہ وہ نور محل

کے الفاظ سے زیادہ اس کی جبلت کو اہمیت دیتا تھا۔ اس نے نور محل کے رخساروں کو تھپتھپایا اور اپنی انگلیاں اس کی صراحی دار گردن سے مس کرتے ہوئے بولا :۔

"تم خوش ہو؟ جان من!"

"بہت خوش شیخو بابا۔" وہ کھسک کر اس کے اور قریب ہو گئی اور اس نے اپنا سر جہانگیر کے ابھرے ہوئے رخساروں پر رکھ دیا۔ جہانگیر کے دل سے مسرت کی ایک نئی لہر اٹھی اور اس نے کہا :۔

"کہتے ہیں کہ جب میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو ان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کتنا گنہگار ہوں۔" اس نے ایک آہ بھری لیکن وہ اس جذبے سے بے خبر رہا جو نور محل کی سیاہ آنکھوں سے دفعتہً نمایاں ہو گیا تھا۔

"تم جانتی ہو میں نے قسم کھائی تھی کہ جنگلی جانوروں کو بندوق سے کبھی نہ ماروں گا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ انہیں جال سے پکڑتا رہا ہوں لیکن باغی شہزادے کے شرمناک رویے نے مجھے یہ قسم توڑنے پر مجبور کر دیا اور اب میں غصے میں شکار بھی کرتا ہوں۔ اسی مہینے میں میں نے تہتر ہرن مارے ہیں۔"

"شکار سے آپ کی صحت بحال ہو جاتی ہے" اس نے کھلے دل سے کہا "اور آپ کی صحت ہی پر ملک کی بہتری کا انحصار ہے۔

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے لیکن مہرو! میرے مرنے کے بعد تمہارا کیا انجام ہو گا؟ شاید پرویز تخت نشین ہو جائے کیونکہ وہ مہابت خاں کے ساتھ مل کر فوج کو اپنا مطیع بنا لے گا۔ اس طرح نظم و نسق تمہارے ہاتھ میں رہ سکتا ہے۔"

جہانگیر نے پہلی مرتبہ موت کا ذکر کیا تھا' نور محل کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔

"نہیں نہیں شیخو بابا! میرے ہاتھ آپ کو قبر میں نہ جانے دیں گے۔"

"لیکن مہرو!" اس نے نور محل کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے باوقار لہجہ میں کہا! پرویز ہی بادشاہ ہو گا۔ شہریار تو ابھی کمسن ہے۔ اس کے بھائی اس کی آنکھیں نکال کر اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیں گے!"

دراصل جہانگیر کے دل میں یہ افسوس جاگزین تھا کہ خرم جو ہمیشہ کامران و مظفر رہا ہے' اس کے بعد شاہی تخت کا وارث نہ بن سکے گا۔ جہانگیر عدم ثبوت کی بناء پر خسرو کے قتل کو معاف کر سکتا تھا لیکن نور محل کے نزدیک ایک بھائی کے قاتل کا جرم ناقابل معافی

تھا!

"بادشاہ کہلانے کے مستحق تو صرف آپ ہیں۔"

"نہیں' میں تو خدا کا ایک بندہ ہوں" سادھو کی گفتگو کا تاثر ابھی جہانگیر کے ذہن پر طاری تھا۔ "میری زندگی تمہارے اور رعایا کے لئے وقف ہے۔"

"جہانگیر جب حمام میں جا کر شراب پینے کے لئے وہاں سے رخصت ہوا' تو نور محل اس کے مزاج کی اس نئی کیفیت پر فکرمند ہو گئی۔ رات کو جب غلاموں نے اسے بتایا کہ بادشاہ کے کمرے میں شمع ابھی تک روشن ہے تو اس نے دوشالہ اوڑھا اور شاہی خیمے میں پردے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی وہ سوچنے لگی کہ آیا جہاں گیر کمزور ہو گیا ہے' یا پھر تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود اس کے مشروب میں کوئی نیا زہر ملا دیا گیا ہے۔ اس نے خیمے کے اندر جھانک کر دیکھا تو جہانگیر ایک چادر پر جھکا مینڈکوں کے ایک جوڑے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چڑیا گھر کا ایک محافظ بھی تھا۔ مینڈکوں کا یہ جوڑا چڑیوں کے لئے سدھایا جا رہا تھا۔ جوں ہی گھاس کے ایک تنکے سے ان کو چھوا جاتا' وہ پھدک کر شکار پر جھپٹتے اور مصنوعی چڑیوں کو اپنی ننھی منی ٹانگوں میں دبوچ لیتے۔ جہانگیر یہ تماشا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

نور محل کے پاس اب غور و فکر کا وقت نہ تھا۔ وہ آزاد تھی لیکن اس پر اپنے اردگرد کے ہزاروں لوگوں کے روز افزوں مطالبات کا دباؤ نہ تھا۔ سفر کے دوران میں نور محل اپنے "پتمبر" کے ہودج سے دیکھتی تھی کہ اس کی آمد پر دیہاتی بھاگ کر کھیتوں میں چھپ جاتے اور گیروا لباس پہنے ہوئے مندروں کے پجاری باہر نکل کر اسے تعجب کی نگاہوں سے گھورنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک ملکہ ابھی تک غیر ملکی عورت تھی ---- نجس اور قانون شکن!

ایک دفعہ نور محل نے مندر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اسے صرف مندر کے صحن تک جانے کی اجازت دی گئی' جہاں سے اس نے پتھر کے مرصع ستونوں کے درمیان' نیم تاریکی میں' کچھ شوخ کمسن ---- لیکن پژمردہ ---- دیو داسیاں دیکھیں' انہیں جگن ناتھ دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ ان دیو داسیوں نے نقاب پوش اجنبی خاتون کو بری بری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ نور محل اور ان کے درمیان صدیوں کی روایات حائل تھیں۔

لہلہاتے کھیتوں' پیدا ہونے اور مرنے والے بچوں اور ان دیو داسیوں کی زندگی سے' جو

محض دیوتاؤں کی سیوا کے لئے وقف تھیں' نورمحل کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ نورمحل اور پس پردہ مورتیوں کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھیں۔

دیو داسیوں کو دیکھ کر اسے پرتھوی کا خیال آیا جو مسکراتے ہوئے شو دیوتا کے بے حس و حرکت بازوؤں کے نیچے بیٹھی آہ و پکار کر رہی تھی۔ مندر کی ان دیو داسیوں کے نزدیک پرتھوی بھی ایک "اچھوت" اور "ملیچھ" تھی جس نے ایک "وحشی فاتح" کی آغوش میں جانا قبول کر لیا تھا۔ اس کے باوجود نورمحل نے ان دیو داسیوں کی حالت پر ترس کھایا' جن کی عمر میں اس نے اپنے باپ کے ہمراہ صحراؤں کی خاک چھانی تھی۔

یہاں سے اس کے خیالات لاڈلی کی طرف منتقل ہو گئے جس کے ہاں اب ایک لڑکی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ دربار کی سیاست سے الگ تھلگ زندگی گزار رہی تھی۔ شہریار بڑا پیارا لڑکا تھا' وہ جہانگیر کے سیر و شکار اور مجلس امراء میں شریک نہ ہوتا تھا۔

جب لاڈلی چھ مہینے تک آگرہ کے حرم سے دور رہی تو نورمحل نے اسے بلا بھیجا اور تاخیر پر نورمحل کو اور بھی بے تابی ہوئی۔ جب وہ آکر اپنی ماں سے ملی تو نورمحل نے اس میں ایک نمایاں تغیر محسوس کیا۔ اس کے سرخ و سفید رخسار مرجھا گئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

نورمحل نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد شہریار کی صحت کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ وہ اچھے ہیں لیکن ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کو گود میں کچھ اس طرح جنبش دی کہ نورمحل کھٹک گئی۔ تاہم چند ہی لمحوں میں نورمحل نے یہ معلوم کر لیا کہ شہزادہ ہندو رقاصاؤں کے دام فریب میں اسیر ہو چکا ہے۔ نورمحل مسکرائی ---- لاڈلی کو دلہن بنے ابھی کچھ ایسے دن نہ ہوئے تھے ---- "تاہم اس نے کسی دوسری عورت سے شادی تو نہیں کی اور اب تو تمہارے ہاں بچہ بھی ہو گیا ہے' جس نے تم دونوں کا رشتہ مضبوط تر کر دیا ہے۔ رقاصاؤں کے بارے میں تم اس سے کچھ نہ کہنا۔ وہ تو محض کنیزیں ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ مجھے ہاتھ نہ لگائے!"

لاڈلی رونے لگی اور نورمحل اپنی فراست کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر رہی اس کے اندرونی اضطراب کا آخر راز کیا ہے؟ نورمحل نے شہریار کو طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے اس سے وہ بات معلوم ہو جائے جو اس کی بیٹی چھپانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن شہریار نے بہانے کرنے شروع کر دیئے اور ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس اثناء میں نورمحل

اس سے زیادہ اہم مسائل میں الجھ گئی۔

موسم گرما آگرہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور جہانگیر بار بار اسے کشمیر کے سفر پر مجبور کر رہا تھا۔ لیکن وہ جہانگیر کو تھپکیاں دے دے کر لشکر کی شیرازہ بندی کرتی رہی۔ اتنے میں آصف خاں نے بنگال سے آکر اطلاع دی کہ وہاں سرحد پر بغاوت ہو گئی ہے۔

"کسی لمبی چوڑی فوج کی تو ضرورت نہیں!" آصف خاں نے کہا۔ "لیکن ایسے سپہ سالار کا ہونا ضروری ہے جو بغاوت فرو کر سکے۔ میرے خیال میں مہابت خاں کو بھیجنا مناسب رہے گا' آج کل وہ ہے بھی بے کار!"

"لیکن وہ تو پرویز کی مصاحبت میں ہے۔"

آصف خاں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "بغاوت فرو ہونے کے بعد مہابت خاں کو خواہ مخواہ بٹھائے رکھنے سے کیا فائدہ؟ اسے کوئی ایسی خدمت سپرد کرنی چاہئے' جو اس کی حیثیت کے مطابق ہو۔"

نور محل تھوڑی دیر تک اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ اسے اپنے بھائی کی اس درخواست پر حیرت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ مہابت خاں بڑی عمدگی سے بنگالہ کی شورش پر قابو پا سکتا ہے اور آصف خاں جھگڑا نمٹانے کے لئے ہمیشہ آسان ترین راستہ پسند کرتا ہے تاہم اسے شک گزرا کہ اس کا بھائی اپنے پرانے ہریف کو مات دینی چاہتا ہے۔

"خان جہان خان لودھی کو کیوں نہ بھیج دیا جائے" نور محل نے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا:۔

"ٹھیک ہے لیکن ضرورت سپاہی کی ہے درباری کی نہیں!"

اس تجویز پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد نور محل نے مہابت خاں ہی کو روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ رعایا' فوج اور پرویز سب میں مقبول تھا۔ پھر خزانہ بھی اسی کے پاس تھا۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مہابت خاں کو کسی کام پر لگا دیا جائے اور آصف خاں لشکر کے ہمراہ رہے۔ چنانچہ اس نے احکام بھجوا دیئے لیکن ابھی نور محل آگرہ سے روانہ ہونے کی تیاریاں بھی مکمل نہ کر پائی تھی کہ اسے پرویز کا ایک پیغام ملا۔ شہزادے نے اس بات پر بڑی سختی سے احتجاج کیا تھا کہ افغان سردار کو اس سے علیحدہ کیا جا رہا ہے!"

وہ جانتی تھی کہ شہزادے کے پردے میں خود مہابت خاں بول رہا ہے اس لئے وہ

سردار کو اپنے اوپر حکم چلانے کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ اس نے فدائی خان کو' جس پر وہ ہر حال میں بھروسا کر سکتی تھی' طلب کر کے حکم دیا کہ وہ اس کا فرمان براہ راست فوج کے پاس لے جائے۔

"بادشاہ کا فرمان ہے کہ مہابت خاں بنگالہ جا کر شاہی فوج کی کمان سنبھالے ورنہ دربار میں حاضر ہو کر اپنا عذر پیش کرے۔"

فدائی خاں کورنش بجا لایا لیکن رخصت کی اجازت طلب نہ کی۔

"کیا بات ہے؟" نور محل نے پوچھا۔

"سردار مجھ سے پوچھیں گے کہ انہیں شاہی دربار میں کس نے طلب کیا ہے اور کیوں؟"

عورت کے متعلق مرد کے لگے بندھے شبہات اور ان شبہات کے ازالے کی لامتناہی ضرورت ایک لمحہ کے لئے اضطراب بن کر نور محل پر طاری ہو گئی' وہ ایک عورت تھی' اس لئے لوگ اس سے یقین دہانی کا مطالبہ کرتے تھے۔ ورنہ دس سال پہلے مہابت خاں کو جہانگیر کے کسی فرمان پر اعتراض کرنے کی جرات کیوں نہ ہوئی!"

"ہم چاہتے ہیں کہ سردار شاہی دربار میں حاضر ہو کر ان ہاتھیوں کا حساب پیش کرے جو اس نے دکن کے راجاؤں سے وصول کئے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج کے خزانے کا حساب بھی اس کے ذمہ ہے!"

"بادشاہ بیگم کا حکم حرف بحرف سردار تک پہنچا دیا جائے گا۔" فدائی خاں سلام کرنے کے بعد الٹے پاؤں رخصت ہوا اور نور محل ان فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو گئی جو اس کی توجہ کے منتظر تھے۔ اس وقت تک جہانگیر اپنے گرمائی سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور آگرہ جہنم زار بنتا جا رہا تھا اور گرمی سے جہانگیر کی آنکھیں بھی دکھنے آ گئی تھیں اس لئے وہ تاخیر پر جز بز ہو رہا تھا۔

آخر شاہی قافلہ روانہ ہوا۔ چند ہی دن بعد نور محل کو سردار کا جواب ملا کہ ہاتھی روانہ کر دیئے گئے ہیں اور حساب کتاب وہ خود شاہی دربار میں حاضر ہو کر پیش کرے گا۔ ایلچیوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کے ہمراہ کم و بیش پانچ ہزار راجپوت اور ان کے بیوی بچے ہیں۔

شاہی قافلہ افغان سردار سے بہت پہلے روانہ ہو چکا تھا اس لئے وہ آہستہ آہستہ وادی تک پہنچ گیا' جس میں دریائے جہلم بہتا ہے۔ اسی دوران میں سڑک پر ہاتھی نمودار ہوئے

اور خبر ملی کہ مہابت خاں شاہی قافلے سے دو پڑاؤ پیچھے ہے۔

اب نور محل کو گزشتہ چند مہینوں کی پریشانی سے نجات مل چکی تھی اور جہانگیر بھی پہاڑوں کی ٹھنڈی اور صحت بخش ہوا سے تازہ دم ہو چکا تھا۔ شاہی خیمہ صنوبر و شمشاد کے ایک جھنڈ میں نصب کر دیا گیا۔ جہاں دریا گنگناتا ہوا' میدان میں اتر رہا تھا اور ساحل کے قریب ہوا کے نرم و لطیف جھونکے لمبی لمبی گھاس سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

شہنشاہ جہانگیر کو ان دنوں ایک شیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو پنجرے میں بند ہونے کے باوجود ایک بکری سے مانوس ہو گیا تھا۔ جہانگیر پنجرے کے پاس بیٹھا گھنٹوں اس انوکھے جوڑے کا تماشا دیکھتا رہتا۔ وہ شیر کی چہیتی کو پنجرے کے پاس سے ہٹوا کر اس کی جگہ کسی اور بکری کو لانے کا حکم دیتا۔ جسے دیکھ کر شیر بپھر جاتا اور پنجہ مار کر ڈھیر کر دیتا اور ایک دفعہ تو شیر ایک بھیڑ کو مار کے کھا ہی گیا۔ اس کے برعکس جب اس کی چہیتی بکری لائی جاتی' تو وہ اس سے چہلیں کرنے لگتا اور جہانگیر اس نظارے سے بہت محظوظ ہوتا ---- "نور محل" ان دلچسپیوں کو جہانگیر کی بحالی صحت کا سبب سمجھ کر مسرور و مطمئن تھی۔

وہ مہابت خاں کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جونہی وہ اس کے سامنے آیا۔ اس کا سارا غم و غصہ کافور ہو جائے گا۔ جب تین دن گزر گئے' تو اس نے عنبر سے پوچھا: "وہ اب تک شاہی لشکر میں کیوں نہیں پہنچا" شاہی لشکر نے بہت آہستہ آہستہ کشتیوں کے پل سے دریا کو پار کیا۔ اب گھڑ سوار دستے اور سازوسامان کی گاڑیاں دریا کے دوسرے کنارے پہنچ چکی تھیں۔

جب خواجہ سرا اس کا کوئی جواب نہ دے سکا' تو نور محل نے فدائی خاں کو بلوایا۔ کورنش بجا لانے کے بعد فدائی خان نے عرض کی کہ وہ ابھی ابھی شاہی لشکر میں واپس پہنچا ہے۔ اس نے کہا:-

"فرمان شاہی کے مطابق سردار اپنے خیمے میں احکام کا منتظر ہے!"

"فرمان شاہی؟" نور محل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا "فرمان تو یہ تھا کہ وہ دربار میں حاضر ہو۔"

"دو دن ہوئے میں خود یہ فرمان لے کر اس کے پاس گیا تھا' اس پر شاہی مہر ثبت تھی!"

تو گویا یہ فرمان خود شہنشاہ نے بھجوایا تھا اور نور محل کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ عام

طور پر جہانگیر مدہوشی کے بغیر ایسا کبھی نہ کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ فرمان اس کے سامنے رکھا کس نے؟ فدائی خاں نے افسوس کے ساتھ اعتراف کیا کہ اسے مطلق اس کا علم نہیں۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" نور محل نے اچانک پوچھا۔ نوجوان امیر کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ ملکہ کے خفیہ پیغامات پہنچانے پر مامور تھا اور اس کے سوا اس کی کوئی خواہش نہ تھی کہ اسے ملکہ کا اعتماد حاصل رہے۔

"واللہ! میں سوچ رہا ہوں کہ سردار کے آنے پر کیا ہو گا؟ وہ نوجوان یقیناً سزا کا مستحق تھا لیکن سردار کو اس طرح ذلیل کرنے سے کیا فائدہ؟"

"ذلیل! کیا مطلب؟" نور محل کو کچھ شک گزرا۔

"ملکہ عالم میرا مطلب برخوردار کو سزا دینے سے ہے۔"

اس نے سرہلایا۔ "ہم نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

ایک لمحہ کے لئے فدائی خاں کو مالکہ پر شک گزرا اور اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ مہینہ میں مہابت خاں کی بیٹی کا بیاہ برخوردار سے ہوا۔ مجھے ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس کے لئے بادشاہ کی منظوری نہیں لی گئی۔ اب' دو دن پہلے' شاہی فرمان نافذ ہوا ہے کہ برخوردار کو گرفتار کر لیا جائے اور اس کی پگڑی اور جوتے اتارنے کے بعد اسے الٹا لٹکا کر اتنا مارا جائے کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ اس کے علاوہ مجھے زبانی حکم دیا گیا کہ میں مہابت خاں کی بیٹی کا جہیز ضبط کر لوں۔"

نور محل کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور اس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ اگر وہ خود بھی سردار کو ذلیل کرنا چاہتی تو اس سے زیادہ نہ کر سکتی۔ اگر اس نے بیٹی کے نکاح کے لئے رسمی طور پر شہنشاہ سے منظوری نہیں لی' تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا' جس کی پاداش میں اس کے داماد سے گھٹیا درجے کے مجرموں کا سا سلوک کیا جاتا' اس کی بیٹی کا جہیز چھین لیا جاتا اور پھر وہ بھی نور محل کے ذاتی قاصد! فدائی خاں کے ذریعے!

"لیکن کیوں؟ ---- حکم کس نے دیا تھا؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"ملکہ عالم کے برادر اکبر نے!"

"مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا گیا؟"

اسے غصے میں دیکھ کر فدائی خاں نے جھک کر سلام کیا "عالی مرتبت آصف خاں نے جہاں پناہ کے نام پر فرمان جاری کیا۔ فدوی ---- ملکہ عالم کا ایک ناچیز خادم ----

اعتراض کی جرات کیسے کر سکتا تھا؟"

تو گویا فدائی خاں کو بھی یقین ہے کہ نور محل سردار کی بیٹی کو بے عزت کرنا چاہتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس نے سردار کو لشکر سے دور رکھا تھا۔ اگر کھلے دربار میں اس کی ڈاڑھی میں خاک ڈالی جاتی تو شاید اتنا برا نہ ہوتا۔

نور محل کو شبہ ہوا کہ جہانگیر بھی اس سے بے خبر ہے' اس کے بھائی نے جان بوجھ کر یہ شرارت کی ہے تاکہ سردار کو یقین آ جائے یہ سب کچھ نور محل کا کیا دھرا ہے۔

"تم سردار کے پاس جاؤ ---- نہیں' پہلے میرے بھائی کو یہاں بھیجو۔"

لیکن آصف خاں اپنے آدمیوں کے ہمراہ دریا پار کر چکا تھا۔ نور محل نے اپنے خیمے سے دیکھا کہ دریا کے اس پار الاؤ جل رہے ہیں جیسے شفق میں سرخ سرخ آنکھیں جھپک رہی ہوں۔ کشتی کے پل سے مزدوروں اور اونٹوں کی ایک قطار گزر رہی تھی اور نور محل کے افغان محافظ رات کی پہرہ داری کے لئے آ رہے تھے۔

تھوڑے ہی فاصلے پر شاہی حمام کے ارغوانی خیمے میں قندیلیں جھلملا رہی تھیں۔ اس نے ستار کی آواز سنی اور اندازہ لگایا کہ جہانگیر کی محفل رقص کا آغاز ہونے والا ہے ----

اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا اتنے میں دریا کے پاٹ پر اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر ستارے جھلملانے لگے اور ایک پہرہ دار نے اس کی موجودگی سے بے خبر ستار کے سروں پر اپنی بھاری آواز میں گانا شروع کر دیا:

میں گدھ نہیں' شاہین ہوں۔
جو اپنے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔
میں بیل نہیں' شیر ہوں۔
جو اپنے دشمن کی تکا بوٹی کر دیتا ہے۔

عشا کی اذان کے بعد' جس کی آواز دریا کے اس پار سے آ رہی تھی' ایک سوار فدائی خاں کا پیغام لے کر آیا۔ آصف خاں کے ہاں آج رات دعوت ہے۔ وہ مہمانوں سے باتیں کر رہے ہیں اور صبح سے پہلے اپنی بہن سے ملنے نہیں آ سکیں گے ..... کنیزوں کی التجا پر نور محل نے اپنے تئیں ریشمیں لحاف پر ڈال دیا۔ ستار کا گریزپا نغمہ اور دریا کی طوفانی موجوں کا شور برابر اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہی حمام میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی' اور اس نے سمجھ لیا کہ جہانگیر شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے بستر پر

جا چکا ہے۔

عین اس وقت مہابت خاں اپنے بادشاہ کے پاس آیا۔۔۔۔!

مہابت خاں اور اس کے پانچ ہزار راجپوت سپاہی رات کے وقت خاصے قریب آ چکے تھے۔ جب دریا پر دھند اور زمین پر تاریکی چھا گئی' تو وہ لمبی لمبی گھاس سے نکل کر خیمہ شاہی کی طرف بڑھے۔ افغان سردار حکم صادر کر چکا تھا اور اس کے سپاہی اپنے فرائض سے آگاہ تھے۔

دو ہزار جوانوں نے ساحل دریا سے کشتیوں کے پل تک کھڑے ہو کر شاہی خیمے کا محاصرہ کر لیا۔ پہرے داروں نے حیران و ششدر ہو کر فوراً ہتھیار ڈال دیئے' راجپوت گھوڑ سواروں سے اترے اور ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کے بعد مہابت خاں کو پیغام بھجوایا کہ وہ پل پر قابض ہو چکے ہیں وہ مغل بادشاہ کے آدمیوں کو دریا پار کرنے کی اجازت تو دے دیتے لیکن واپس نہ آنے دیتے تھے۔ وہ کہر میں چھپے احاطہ شاہی سے خبر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

وہاں مہابت خاں اپنے افسروں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ جن میں سے چالیس کے قریب اصل دستے کے آگے آگے تھے۔ چند خدام' جو گھوڑوں کی ٹاپ سے بیدار ہو گئے تھے' یہ سمجھے کہ وہ رات کے پہرے دار ہیں۔ سردار اپنے گھوڑے پر سوار' سرا پردہ سلطانی کے دروازے میں داخل ہوا اور انگڑائیاں لیتے ہوئے سپاہیوں اور نیند میں غرق پہریداروں کے پاس سے گزرا۔ گرد و غبار نے چند لمحوں کے لئے اسے نگاہوں سے چھپا لیا' یہاں تک کہ وہ سرا پردہ شاہی پہنچ کر اپنے گھوڑے سے اتر گیا۔ ایک شخص چلایا۔

"مہابت خاں آ پہنچا!"

"وہ اپنے افسروں کے ہمراہ دالان میں بچھے ہوئے قالین کو روندتا ہوا آگے بڑھا آہٹ پا کر معتمد خاں بخشی' جو اس زمانے میں "تزک جہاں گیری" کی کتابت پر مامور تھا' بہت سے خواجہ سراؤں کے ساتھ نمودار ہوا اور مہابت خاں کو دیکھتے ہی بولا۔

"آخر اس طرح بے اجازت گھسے چلے آنا کا کیا مطلب ہے؟ آپ واپس جائیے! میں حضور شاہی میں آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں!"

مہابت خاں نے اپنے آدمیوں کو اشارا کیا کہ وہ دروازے کا پردہ چاک کر دیں۔ تلواریں نیام سے نکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پردہ چاک ہو کر' بانس کی چوکھٹ سمیت' زمین پر

آ رہا۔ دہشت زدہ خواجہ سراؤں نے شہنشاہ کے پاؤں سہلا کر اسے جگانے کی کوشش کی لیکن وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تاہم پردہ پھٹنے اور چوکھٹ گرنے کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے مہابت خاں کے مطمئن چہرے کی جانب دیکھا۔

اس کی نگاہیں پردے کے ٹکڑوں اور راجپوت سپاہیوں کی ڈاڑھیوں پر پڑیں اور وہ کہنی کے سہارے اٹھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ اس پختہ ارادے کے باوجود، جس نے مہابت خاں کو اس رات احاطہ شاہی میں پہنچایا تھا اور جس کے بل پر وہ شاہی پہرہ داروں کو دھتکار کر بے خوف اندر چلا آیا تھا، جب بھاری جسم کے کمزور و ناتواں جہانگیر سے اس کی نگاہیں چار ہوئیں، تو عمر بھر کی وفاداری نے اس کے ضمیر میں ایک چٹکی لی۔

"میں پیش گاہ سلطانی میں اپنے اعمال کا حساب دینے حاضر ہوا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"جہانگیر ذرا گھبرایا۔ اس نے اپنے پہلو میں پڑی ہوئی تلوار اٹھائی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور میان سے تلوار نکالنے کی کوشش کی۔

"جہاں پناہ!" اس کے ایک معتمد نے پیچھے سے ترکی زبان میں کہا۔ "تحمل سے کام لیجئے! یہ ایک شہنشاہ کے امتحان و آزمائش کی گھڑی ہے! میں نے سینکڑوں دشمن خیمہ شاہی کے چاروں طرف کھڑے دیکھے ہیں اور ان کی آمد کا سلسلہ ابھی جاری ہے!"

"نمک حرام" جہانگیر نے مہابت خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔

مہابت خاں نے خواب گاہ شاہی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اور اپنی تلوار کی طرف ہاتھ تک نہ بڑھایا۔ ملگجی روشنی میں اس کا وحشت ناک چہرہ خاکستری نظر آ رہا تھا۔ اس نے جذبات کی ایک ہنگامی رد پر عمل کیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کافی دیر تک اپنی رسوائی کے داغ دھونے کی مختلف تدبیریں سوچ چکا تھا۔ اپنی بیٹی کی ذلت کا قصہ سننے کے بعد جب ایک جاسوس نے اسے بتایا کہ جہانگیر خیمے میں موجود ہے اور اس کے پاس دو چار سو افسروں، ملازموں اور حرم کے پہریداروں کے سوا کوئی نہیں تو اس نے اسی وقت بیمار بادشاہ کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاکہ وہ تمام سازشیں، جو ایک مدت سے جاری ہیں۔

تلوار کے ذریعے ایک ہی بار ختم کر دی جائیں۔

"بخدا! میں بالکل صحیح وقت پر آیا ہوں!" اس نے نرم لہجے میں کہا: "نمک حرام کون ہے؟ میں میرا وہ دشمن جس نے میرے خلاف حضور کے کان بھرے' مجھے یہاں بلوایا اور برخوردار کے کوڑے لگوائے۔ جب کہ میں باریابی کی اجازت طلب کرتا تھا۔ بہرحال میں حاضر ہو گیا ہوں!" وہ سہمے ہوئے حمامیوں سے مخاطب ہوا اور کہا: "کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ سلیمی آفتابہ لاؤ اور جہاں پناہ کا ہاتھ منہ دھلا کر پوشاک تبدیل کراؤ!"

اس نے اپنے آدمیوں کو عقبی کمرے میں بیٹھنے کا حکم دیا اور خود دروازے پر چلا گیا۔ بہ یک نظر اس نے دیکھ لیا کہ راجپوت سپاہی کلغی دار پگڑیاں باندھے خیمے کے احاطے میں جمع ہو گئے ہیں ---- ان کے تاریک چہرے فتح مندی کی چمک سے روشن ہیں۔ کسی نے اسے بتایا کہ پل پر قبضہ ہو چکا ہے۔ بغیر کسی شدید مزاحمت کے شاہی سواروں کو شکست دی جا چکی ہے۔ دوسرے خدام بیکسی کے عالم میں احکام کے منتظر تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ کو قید کر دیا گیا ہے۔ ایک عرب افسر کو غیر مسلح کیا جا چکا تھا اور باقی افسر دریا کے پار بھاگے جا رہے تھے۔

"دریا کے کنارے گشت کرو۔" مہابت خاں نے حکم دیا۔ "اور عقبی دستے کو یہاں بلا لو!"

"اور پل کی حفاظت؟"

"اسے یوں ہی رہنے دو!" دراصل افغان سردار زیادہ گرفتاریاں کرنی نہ چاہتا تھا۔

جب جہانگیر خیمے سے باہر نکلا تو قریب کے راجپوت سپاہی احتراماً گھوڑوں سے اتر گئے اور مہابت خاں تسلیم بجا لایا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور اس گھوڑے کی رکاب تھام لی جو شہنشاہ کے لئے وہاں لایا گیا تھا۔ لیکن جہانگیر جس نے اب تک اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا' پیچھے ہٹا:

"یہ مابدولت کا رہوار نہیں! ہم کسی دوسرے گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے۔"

بظاہر یہ بات معمولی تھی۔ جہانگیر اس کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک قیدی ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ مہابت خاں نے حکم دیا کہ شاہی اصطبل سے گھوڑا لایا جائے اور اپنے آقا سے ساتھ چلنے کو کہا۔ خواب گاہ شاہی کے تمام خادم حراست میں لے لئے گئے تھے اور دور کے آدمیوں کو اس سارے واقعے کا اب تک کچھ علم نہ ہوا تھا۔

اگر جہاں گیر اپنے سپہ سالار کے ساتھ گھوڑے پر سوار' آگے آگے جائے' تو لڑائی کی نوبت پیش نہ آئے گی ۔۔۔۔ اور مہابت خاں لڑائی سے ہر حالت میں دامن بچانا چاہتا تھا۔

اتنے میں جہانگیر کا ایک وفادار مہادت ہاتھی لے کر آیا جسے دیکھتے ہی شور مچ گیا اور وہ اسی وقت تہ تیغ کر دیا گیا۔ اس دوران میں جہانگیر کو کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ اس نے کہا۔ "اگر ہمیں دور جانا ہے تو مابدولت کو شکار کی پوشاک زیب تن کر لینی چاہئے!"

"اس کی کیا ضرورت ہے جہاں پناہ!"

"یہ میری خواہش ہے۔" اس نے جواب دیا "پوشاک قریب ہی بادشاہ بیگم کے خیمے میں ہے۔"

مہابت خاں نے اسے بے معنی نظروں سے دیکھا اور اپنے پیچھے آتے ہوئے افسروں کی طرف متوجہ ہوا۔ محاصرہ کے سواروں کو لے کر بادشاہ بیگم کے خیمے کا محاصرہ کر لو۔ چلو! جلدی کرو!"

جب اسپ سوار نور محل کی خیمہ گاہ میں پہنچے' تو فضا ایک بار پھر گرد آلود ہو گئی۔ مہابت خاں' بادشاہ بیگم کے خیمے کے پاس اترا' اسے نور محل کی حراست کے سلسلے میں دوسروں پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ وہ بادشاہ بیگم سے قریب آنے کی درخواست کریں تاکہ وہ انہیں پہچان سکے۔ ان کی آواز سن کر اس کے لئے دھوکے کا امکان باقی نہ رہے گا۔ دوران انتظار میں وہ نیم وا پردوں کے پیچھے' سایوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ شہنشاہ کی نسبت نور محل کو حراست میں لینا زیادہ ضروری تھا۔

اتنے میں بوڑھا عنبر غصے میں پیچ و تاب کھاتا پردے سے باہر نمودار ہوا۔

"کہاں ہیں تمہاری بادشاہ بیگم؟" مہابت خاں غرایا۔ عنبر نے گم صم جہاں گیر کی طرف طعن آمیز نظروں سے دیکھا۔ ایک مسلح دشمن' شہنشاہ ہند کے سامنے اس کی ملکہ کو باہر طلب کر رہا تھا اور وہ خاموش کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"بد باطن' پہاڑی کتے۔" وہ چیخ اٹھا۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر عنبر کے منہ پر تلوار کا پھل مارا اور وہ چیخ کر نیچے گر پڑا۔ مہابت خاں کو اندر جانے کی جرات نہ ہو سکی۔ پردے کے قانون کو جو مغلوں سے بھی بہت پہلے کا چلا آ رہا تھا' آخر وہ کیسے توڑ سکتا تھا؟ تاہم اس نے راجپوت عورتوں کو اندر بھیجا جنہوں نے خیمے کا کونا کونا چھان مارا لیکن نور محل کا کہیں پتا نہ تھا۔

"جاؤ! کشتیوں کے پل کو آگ لگا دو۔" مہابت خاں نے ایک سوار کو حکم دیا "کوئی شخص دریا عبور نہ کرنے پائے! اگر اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی' تو تمہاری گردن مار دی جائے گی۔"

نور محل کو پورے احاطہ شاہی میں تلاش کیا گیا' لیکن وہ ایسی غائب ہوئی تھی کہ اس کا نشان تک نہ ملا۔

نور محل ابتدائی شوروغل پر ہی بیدار ہو گئی تھی جب اس کی خواصوں نے آہ و بکا شروع کر دی تھی۔ وہ کہر اور گردوغبار کے دھندلکے میں باہر دروازے پر پہنچی' یہاں اس نے قنات کے پیچھے سے راجپوت سپاہیوں کو حمام شاہی کا محاصرہ کرتے دیکھ لیا۔ اتنے میں جواہر نامی خواجہ سرا حاضر ہوا' جس کے ساتھ چند خدام اور سواری کے گھوڑے تھے۔

"تمہارے آقائے ولی نعمت؟" نور محل نے استفسار کیا۔

"مہابت خاں کی قید میں! خدا اسے غارت ----"

"خاموش!"

خدام نے درخواست کی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے محافظوں کے ہمراہ' اس افراتفری میں نکل جائے لیکن اس نے اسی لمحے سوچا کہ جس نے جہانگیر کے خلاف تلوار اٹھائی ہے' وہ کھل کر مقابلے پر اتر آیا ہے' نور محل کو معلوم تھا کہ مہابت خاں کے پاس کافی مقدار میں مسلح فوج ہے' جس سے وہ سرا پردہ شاہی پر قبضہ کر سکتا ہے' اسی تذبذب کے عالم میں اس نے اپنے سہمے ہوئے خدام کو کہتے سنا کہ محافظ گرفتار کئے جا چکے ہیں اور فوجی افسر لشکرگاہ میں پہنچنے کے لئے دریا کے اس پار بھاگ گئے ہیں' نور محل خدام کے ہمراہ دریا پار کرنے کے لئے آمادہ نہ تھی کہ اس طرح سردار کے آدمی اس کا تعاقب کرتے لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ جہانگیر' مہابت خاں کی معیت میں' اپنے خیمے سے صحیح سلامت باہر نکلا ہے' تو نور محل اپنے آئندہ اقدام کے متعلق ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے دیہاتی عورتوں کا ادنیٰ لبادہ اور معمولی جوتے منگوائے۔ جب خواصوں نے اسے یہ لبادہ پہنا دیا تو اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ ایک ایک کر کے دریا پار کرنے کی کوشش کریں۔ عنبر کو وہیں رہنے کی ہدایت کی اور جواہر کو اپنے ساتھ لے لیا۔

"بادشاہ بیگم گھوڑے پر سوار ہوں گی؟" جواہر نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیا کسان عورتیں گھوڑے پر سوار ہوتی ہیں؟" اس نے جواہر کی گھبراہٹ پر ہنستے

ہوئے کہا اور دروازے سے نکل کر دوسروں کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارا کیا اسے پیدل دشمن کے نرغے میں جانے کی جرات کرتے دیکھ کر حرم سرا پر ایک ماتمی کیفیت چھا گئی۔ جواہر نے بھی اپنا زر تار چوغہ اتار دیا اور چپ چاپ اپنی ملکہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔

وہ بدحواسی کے عالم میں راجپوت گھڑ سواروں سے بچتا بچاتا گزر رہا تھا۔ نور محل ایک لمحے کے لئے اس لڑائی کو دیکھنے کی غرض سے ٹھہری جو ایک ہاتھی کے پاس برپا تھی اور اس کے بعد غلاموں کے ایک ہجوم میں شامل ہو کر پل کی جانب روانہ ہو گئی۔ جواہر نے اسے ناہموار رستوں پر سہارا دینا چاہا لیکن اس نے سختی سے روک دیا۔

"پیچھے رہو! محل کے خواجہ سرا کا مجھ ایسی معمولی عورت سے کیا واسطہ! بس چپ چاپ چلے آؤ۔" اس نے کہا۔

جواہر نے دیکھا کہ گاڑی بانوں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا ہے اور پل پر راجپوت سپاہی کھڑے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ اب بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں دشمن کے گماشتے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ جو شاہی خیمے سے آنے والوں کی یقیناً تلاشی لیں گے۔

نور محل آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے وہ مسلح فوجیوں سے خوف زدہ ہو۔ جب ایک جاٹ کسان کا چھکڑا اس کے پیچھے آیا تو وہ لنگڑانے لگی اسے رستہ چھوڑنے پر آمادہ نہ پا کر کسان رکنے پر مجبور ہو گیا اور بدحواس جواہر کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان دونوں میں تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ جاٹ ایک طرف ہو گیا اور نور محل چھکڑے میں اس کے برابر بیٹھ گئی۔

چھکڑا چرخ چوں کرتا آگے بڑھ رہا تھا اور بھاگنے والے اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ جب چھکڑا ایک راجپوت افسر کے قریب پہنچا' تو اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن گوبر کی بو سے فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

ادھر جواہر کی آنکھوں کے سامنے ایک ننگی تلوار لہرائی اور ایک زبردست گرج نے اس کا کانوں کے پردے پھاڑ دیئے۔

"یہ محل کا خواجہ سرا ہے اس کی جیبوں میں ضرور جواہرات ہوں گے۔ رام داس! اسے پکڑ لو۔"

جواہر اپنے آپ کو قید میں دیکھ کر دم بخود رہ گیا اور گوبر سے لدا ہوا چھکڑا گڑگڑاہٹ

کے ساتھ اس کے قریب سے گزر گیا۔ جب وہ کشتیوں کا پل پار کر کے دوسرے کنارے پہنچا تو ایک ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا آیا اور اس نے چیخ کر کہا "سردار مہابت خاں نے حکم دیا ہے کہ رسے کاٹ دیئے جائیں۔" راجپوت سپاہیوں نے بیچ میں سے وہ رسے کاٹ دیئے جن سے کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔

لکڑی کے پل کے دو ٹکڑے ہو گئے اور کشتیاں طوفانی دریا کے بہاؤ کی سمت جھولنے لگیں۔ جواہر کے قریب کشتیوں میں سوکھی گھاس ڈال کر آگ لگا دی گئی۔ جس کے دھوئیں نے ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جواہر نے دیکھا کہ اس کے اور اس کی ملکہ کے درمیان اب دریا حائل ہو گیا ہے۔

آصف خاں کے ایک خیمے میں امرائے لشکر بڑی بے دلی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو مضطرب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل میں تشویش اور شک کی وہ چبھن پائی جاتی تھی' جو بدبختی کے موقع پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ سب کے سب ---- ایک کے سوا ---- مہابت خاں کی جرات پر انگشت بدنداں تھے اور ان سب کا دل ---- ایک کے سوا ---- اندر ہی اندر انہیں ملامت کر رہا تھا۔ جہانگیر بے شک بیمار تھا لیکن آخر وہ شہنشاہ تھا اسے قید میں دیکھ کر لوگ اس کے سالاران لشکر کو کس نام سے یاد کریں گے۔ چنانچہ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ لیکن وہ سب جانتے تھے کہ جہاں گیر کو اس کے افسروں کی غداری نے گرفتار کروایا ہے۔ اس وقت صرف نوجوان افسر جہانگیر کی حمایت میں تلوار اٹھانے پر اصرار کر رہے تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف کئی دلائل تھے' جن میں سب سے بڑی اور ناقابل تردید دلیل مہابت خاں کا وجود تھا۔

"اندھے ہی صحیح معنی میں عقل مند ہوتے ہیں۔" آصف خاں نے اپنے بازوؤں کے جوش پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "وہ قدم اٹھانے سے پہلے زمین ٹٹول لیتے ہیں۔"

"مصیبت غیب سے آتی ہے۔" خواجہ ابوالحسن نے تقدس بگھارتے ہوئے کہا۔ وہ داروغہ توشہ خانہ کی رائے معلوم کرنی چاہتا تھا۔

لیکن آصف خاں منتظر تھا کہ منصوبہ کوئی اور پیش کرے۔ اس کی بھوری آنکھوں سے غم جھلک رہا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ جب تک مسلح فوجیں فراہم کر کے انہیں ایک

کمان کے تحت نہ لایا جائے اس لعنتی اور نمک حرام ---- مہابت خاں ---- کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ادھر خواجہ محسوس کر رہا تھا کہ ابھی دلی دور ہے۔ سردار اور اس کے آزمودہ کار راجپوت گھڑسواروں کے مقابلے میں فوج جمع کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ لیکن اگر دیر ہو گئی تو بادشاہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ جس درباری نے سنا کہ بادشاہ زیر حراست ہے وہ اپنے قلعہ میں بیٹھ کر سوچنے لگے گا کہ اب وہ کس سالار کی متابعت کرے؟

لیکن جونہی نور محل نے اندر قدم رکھا وہ یکایک خاموش ہو گئے اور سب نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔ اس نے ابھی تک کسان عورتوں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور جب وہ درباریوں میں سے گزری تو اس کے نرم و نازک شانے فرش پر بیٹھے ہوئے سب سے لمبے آدمی کی پگڑی کے طرے تک بمشکل پہنچے۔

"میں بادشاہ کی طرف سے آئی ہوں۔" اس کی صاف و شیریں آواز گونجی۔

"آپ لوگ کس وقت دریا پار کر کے اسے رہا کرائیں گے؟"

"مجلس مشاورت میں ایک عورت کا یوں بے دھڑک چلے آنا بالکل نئی بات تھی۔ اور بادشاہ بیگم کا امرائے دربار سے روبرو خطاب کرنا یقین کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ عمائد سلطنت اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ اس کے چہرے کی باریک نقاب سے اس کے ترشے ہوئے لب اور اس کے محراب نما ابرو جھلک رہے تھے۔ فدائی خاں سب سے پہلے اٹھا۔ وہ کمر تک بھیگا ہوا تھا اور اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ پل کے نذر آتش ہو جانے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے پر دریا پار کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اس کے بیس ساتھیوں میں سے آدھے یا تو دریا میں ڈوب مرے تھے یا راجپوت سپاہیوں نے انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

"مہرو!" آصف خاں پکار اٹھا۔

وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"بردار من! تم نے مہابت خاں کی عزت کو بڑی دلیری سے خاک میں ملایا ہے لیکن اب بادشاہ کو قیدی دیکھ کر بھی کیا تم بہادری کا ثبوت دے رہے ہو؟ اس کے پاس ہاتھیوں اور چوبداروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ افسوس! تمہاری بے وقوفی نے ہمارے نام کو بٹا لگا دیا۔ میں نے اب تک وہ پرچم، جو شہنشاہ نے تمہیں عطا کیا تھا، اس کی حمایت میں بلند ہوتے

نہیں دیکھا تاکہ ذلت و رسوائی کا یہ شرمناک دھبا کم سے کم خون ہی سے دھل جاتا۔

"خدا کی قسم" ایک اسپ سوار منصور نے منہ ہی منہ میں کہا "اس کی باتیں خوب ہیں!"

"جہاں پناہ نے خود ہی میر منصور کے ہاتھ تحریری فرمان بھجوایا ہے کہ ہم ان کے خیمے پر حملہ نہ کریں تاوقتیکہ....."

آصف خاں نے بے صبری سے جواب دیا :۔

"ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ فرمان!"

نور محل نے بھدے انداز میں لکھی ہوئی تحریر کو دیکھ کر کاغذ پرے پھینک دیا! "یہ مہابت خاں نے لکھوایا ہے۔ بے شک وہ لڑنا نہیں چاہتا لیکن تم اسی کے حکم پر چلو گے؟ میں نے خود "داد الٰہی" کے مہاوت کو قتل ہوتے دیکھا ہے وہ اس دیو پیکر ہاتھی کو جہاں پناہ کی خدمت میں لے جانا چاہتا تھا۔

"تاہم" منصور نے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے کہا "جہاں پناہ نے مجھے یہ شاہی انگوٹھی بھی عطا فرمائی تھی تاکہ میں تصدیق کے طور پر عمائد سلطنت کو دکھاؤں۔"

"انگوٹھی؟" نور محل نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "مجھے تو یہاں ایک بھی آدمی ایسا نظر نہیں آتا جسے شہنشاہ نے دولت و منصب سے سرفراز نہ کیا ہو۔ تم نے جہاں پناہ کا نمک کھایا ہے اور اب حیلے حوالوں سے کام لے رہے ہو۔ تم اسپ سوار اور ہاتھی لے کر میدان جنگ میں کود کیوں نہیں پڑے۔

نور محل کی یہ باتیں سن کر بہت سے افسر توجیہا" بولے : لشکر میں دو یا تین ہزار سے زیادہ اسپ سوار نہیں ---- باقی سب تیرانداز یا پیادہ توپچی ہیں۔ جنہیں کشتیوں میں بٹھا کر دریا پار کرنا پڑے گا اور دریا کی طغیانی کی وجہ سے یہ کام بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ صرف دو توپیں مل سکی تھیں ان میں سے ایک فدائی خاں نے دا غنے کی کوشش کی۔

فدائی خاں! میری طرف سے شکریہ قبول کرو!" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"---- لیکن یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ مہابت خاں کو یہ فائدہ ہے کہ اس کے پاس پانچ ہزار چاق و چوبند راجپوت ہیں جو اونچے کنارے پر متعین ہیں۔ اس کے علاوہ بہترین جنگی ہاتھی بھی اس کے قبضے میں ہیں۔ اس حالت میں اس پر حملہ کرنا شکست مول لینے کے مترادف ہے۔"

"لیکن اگر تم حملہ نہ کرو تو کیا ہو گا؟"

حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔ آصف خاں بے قرار ہو کر پہلو بدلنے لگا لیکن ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نور محل نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگایا۔

"بس یہ ہو گا کہ تم چلو بھر پانی میں ڈوب مرو گے۔ تمہارے بال بچوں کا بھی یہی حشر ہو گا اور خاکروب تمہاری قبروں پر یہ کہہ کر تھوکیں گے کہ جب بادشاہ کو بیڑیاں پہنائی گئیں تو یہ لوگ مزے سے پاؤں پھیلائے سوتے رہے۔

اس کے جواب میں کچھ منمناہٹ سی ہوئی جس میں کچھ احتجاج تھا اور کچھ اعتراف لیکن نور محل نے بلند آواز سے کہا:

"لیکن مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا۔ کل طلوع آفتاب کے بعد میں بڑے جنگی ہاتھی "عالم گواہ" پر سوار ہو کر دریا پار کروں گی۔ جس کسی نے ہمارا نمک کھایا ہے وہ ساتھ دے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا' دنیا یہ کہہ کر اس کے منہ پر تھوکے گی کہ وہ بادشاہ بیگم کو تنہا میدان جنگ میں جاتے دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جلال خداوندی کی قسم!" فدائی خاں نے کہا۔ "دنیا کم از کم میرے متعلق ایسا نہ کہے گی۔"

"مجھے اس کا یقین ہے لیکن امیر منصور تم!"

آزمودہ کار ترک جرنیل نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "اگر پرچم بلند کر دیا گیا تو میں ساتھ ہوں۔" اس پر تمام نوجوان افسروں نے نعرہ ہائے تحسین اور بعض نے تلوار کے دستوں پر ہاتھ مارے لیکن نور محل اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئی اور اس سے نرم لہجے میں پوچھا! "تم؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

آصف خاں کے کشادہ چہرے سے جیسے تمام بشاشت یکا یک اڑ گئی۔ "تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہے گا" اس نے کہا۔

دوسرے دن نور محل منہ اندھیرے اٹھی۔ کنیزوں نے اسے اچھی طرح نہلایا دھلایا اس کے جسم پر روغن صندل کی مالش کی اور اسے سفید درباری پوشاک پہنائی۔ پھر گلے میں موتیوں کا ہار ڈالا۔ بازوؤں پر جڑاؤ جوشن باندھے اور سر پر چاندی کا مرصع تاج رکھا۔ اس کے بعد جب وہ ایک کنیز کے ساتھ' چہرے پر باریک نقاب ڈالے' اپنے بھائی کے حرم سے برآمد ہوئی اور "عالم گواہ" کے پاس پہنچی' تو شہنشاہ کے سینکڑوں لشکریوں نے دیکھا کہ واقعی

وہ نور محل ہے جو جنگی ہاتھی پر سیڑھی لگا کر سوار ہو رہی ہے۔

اس نے امرائے سلطنت سے کوئی بات نہ کی۔ وہ فوج کے سالار تھے اور انتظام کرنا ان کا فرض تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی فوج کا کمان دار ہے۔ نور محل نے سوچا کہ مہابت خاں شاید ہی اس انداز میں آگے بڑھتا۔ اس کے دونوں طرف قطار اندر قطار چلے آ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر فدائی خاں نوجوان احدیوں کو ساتھ لے کر دریا عبور کرنے لگا۔ نور محل کا خیال تھا کہ جب ہاتھی دریا سے گزریں گے تو اس کے بہاؤ کا زور بڑی حد تک ٹوٹ جائے گا اور اس طرح پیادہ فوج بھی' اس کے دوش بدوش کشتیوں میں بہ آسانی دریا عبور کر لے گی ---- وہ سوچنے لگی اس وقت مہابت خاں کیا کر رہا ہو گا؟

"عالم گواہ" دریا میں آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر سیاہ موٹے چمڑے کی جھول پڑی ہوئی تھی جس پر لکڑی کے کام کا خوب صورت ہودج رکھا تھا۔ مہاوت کے پاس دو تیرانداز زرہ بکتر پہنے بیٹھے تھے۔ دریا کی گزرگاہ بعض اوقات چونکہ دھوکا بھی دے جاتی ہے اس لئے ہاتھی کے ساتھ ساتھ گھوڑے بھی تیر رہے تھے لیکن "عالم گواہ" اطمینان سے بڑھتا گیا۔ دوسرے ہاتھی دو قطاروں میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

دریا میں ریت کا ایک تودہ سا آیا جسے پھلانگنے کے بعد گھوڑے اور ہاتھی دوبارہ گہرے پانی کے بہاؤ کو چیرنے لگے۔ آخر کنارہ آ گیا۔ پاس کے ٹیلوں پر اسپ سوار قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ نور محل کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سب لوگ خاموش ہیں۔ اسے اس پار ہاتھیوں کی ایک قطار بھی نظر آئی جس کے وسط میں "داد الٰہی" بھی کھڑا تھا ---- وہی عظیم ہاتھی جس پر سوار ہو کر وہ کئی مرتبہ شیر کا شکار کھیلنے گئی تھی۔ اب وہ لوگوں کے نعرے بھی سن سکتی تھی۔ اس کے آگے آگے گھوڑے پانی کی تند رو کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے اور سورج کی اولیں شعاعوں میں اسپ سواروں کے خود چمک رہے تھے۔ بس تھوڑی سی کوشش اور ---- اس کے بعد وہ دریا پار کر جائیں۔ شاید اسی خوشی میں لوگ برابر شور مچا رہے تھے۔

اچانک ہودج کی ایک چھپٹی ٹوٹ کر اس کے شانوں سے ٹکرائی۔ ایک ہاتھی چنگھاڑا اور اس کے جواب میں عالم گواہ نے بھی سونڈ اوپر اٹھائی۔ نور محل کو ایسا محسوس ہوا جیسے

ہاتھی نے اپنے کندھے اونچے کر لئے ہیں۔ وہ دریا سے نکل کر کنارے پر قدم رکھ چکا تھا۔ لیکن بغیر کسی ظاہری وجہ کے وہ جھوم رہا تھا' ہودج کے قریب سے سرخ سرخ شعلے گزرنے لگے اور یہ بات خاصی دیر کے بعد نور محل کی سمجھ میں آئی کہ یہ ان تیروں کی بوچھاڑ تھی جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔

لڑائی شروع ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک اسپ سوار عالم گواہ سے رگڑ کھاتا ہوا گزرا۔ اس کے ہاتھ سے ڈھال گر گئی اور وہ بے جان ہو کر کاٹھی سے زمین پر آ رہا۔ نور محل نے دیکھا کہ خالی پیٹھ گھوڑے نے رخ بدلا ہے اور بھاگ کر ہاتھوں سے دور نکل گیا ہے۔ اس نے دریا کے بہاؤ کی طرف نگاہ دوڑائی تو اسے فدائی خاں کے آدمی نظر آئے ـــــ اور اس کا دل پہلی مرتبہ جوش سے دھک دھک کرنے لگا ـــــ جو ڈھلوان سے ہوتے ہوئے دریا کے اونچے اونچے کناروں پر چڑھ رہے تھے ـــــ عالم گواہ ٹھہر گیا تھا۔ ہودج کے سامنے لوگ نعرے بلند کر رہے تھے۔ اسے چلہ چڑھانے اور کمان کھینچنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی لیکن اس کے علاوہ جتنا شوروغل تھا۔ وہ اس کے لئے بے معنی تھا۔ اتنے میں ایک آواز نے اسے ہودج سے باہر جھانکنے پر مجبور کر دیا ـــــ "دین۔ دین۔ دین۔"

مہابت خاں نے جنگ کا نعرہ بلند کیا تھا اور راجپوت سپاہی ریت کے ٹیلوں کی طرف گرتے اور سنبھلتے آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اسپ سواروں کا ریلا ہاتھیوں کی طرف بڑھا۔ سردار مہابت خاں نے ہلہ بول دیا تھا اور شاہی لشکر دریا کے کنارے قدم جمانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ راجپوت سپاہی جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ وہ آندھی کی طرح عالم گواہ کے پاس سے گزرے جو چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔

نور محل نے اپنے قریب ہی کسی کو کراہتے سنا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ایک تیر انداز ہودج کے پاس ٹانگیں سکیڑے اور آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ جب وہ لڑھک کر نیچے جا گرا تو نور محل کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

ہودج ایک بار پھر جھنجھنا اٹھا اور نور محل کو اپنے پس پشت ایک کنیز کے رونے کی آواز آئی۔

"ہائے! میں کیا کروں؟ کیا بادشاہ بیگم ملاحظہ فرمائیں گی؟" کنیز اپنا ہاتھ دکھا رہی تھی جس پر ایک پر دار تیر پیوست ہو چکا تھا۔

"ہائے بہن!" نور محل نے بے اختیار اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس لڑکی کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں اور وہ خود بھی اس کے متعلق کچھ زیادہ نہ جانتی تھی۔ بہرحال لڑکی کی دیکھ بھال ضروری تھی ....."

راجپوت سپاہی کنارے سے ہو کر نیچے کی جانب مڑ گئے تھے لیکن آصف خاں اور خواجہ ابوالحسن آخر کس انتظار میں ہیں؟ ان کے پرچم بدستور ٹیلے پر لہرا رہے تھے اور اس کے بھائی کے دو چار اسپ سوار ہی ہاتھیوں تک پہنچ سکے تھے۔ نور محل نے ہودج کا پردہ اٹھایا اور ایک خواجہ سرا کو آواز دی جو عالم گواہ کے پاس ہی دبکا کھڑا تھا۔

"نظام! نظام! گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤ اور میرے بھائی سے کہو کہ اب ہچر مچر کا وقت نہیں۔ وہ فوراً یہاں پہنچ جائے۔"

جب خواجہ سرا چلا گیا تو نور محل نے آنکھیں موند لیں۔ خون اور کیچڑ کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سورج کی شعاعیں دریا کی لہروں پر چمک رہی تھیں۔ نہ جانے دن اس قدر کیسے چڑھ آیا۔ نور محل کنیز کی طرف متوجہ ہوئی' جو زخم کی تکلیف سے ابھی تک رو رہی تھی۔ نور محل نے اس کے بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ رونے لگی۔

"نہیں' نہیں پہلے تیر کو توڑنا چاہئے!"

ہاتھی کے آس پاس لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہودج ہچکولے کھانے لگا اور عالم گواہ کی سونڈ اس کے گرد لہرانے لگی' جس سے خون ٹپک رہا تھا چمکیلی تلواریں اس پر برس رہی تھیں' اتنے میں ایک اسپ سوار رکاب کے سہارے کھڑا ہوا اور للکارا!

"بہادر! اب ہتھیار ڈال دو!"

وہ اسے بہادر کہہ کر خطاب کر رہے تھے۔ کیا انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ہودج میں نور محل بیٹھی ہے؟ اب تک انہیں یقیناً پتا چل گیا ہو گا۔ اس کے باوجود لڑائی جاری رہی۔ چہروں پر غیظ و غضب طاری رہا۔ زخمی گھوڑے چیختے رہے' آہنی ہتھیار کراتے رہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر ریت کے ٹیلوں کی جانب دیکھا لیکن بھاگتے ہوئے گھوڑوں' آدمیوں اور ہاتھیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا ---- اچانک عالم گواہ نے چکر کھایا اور سیدھا پانی کی طرف بھاگا۔ اسپ سوار اسے وحشیانہ انداز میں پیٹ رہے تھے اور مہاوت نے آنکس مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ عالم گواہ کو کئی جگہ زخم آئے اور اب وہ جان بچانے کے لئے پانی میں کود

رہا تھا۔ وہ گہرے پانی میں گھستا چلا گیا اور جب اس نے تیرنا شروع کیا تو ہودج بھی ہلکورے کھانے لگا۔ ایک راجپوت سپاہی رکاب کے تسمے سے چمٹا' ہودج پر خنجر سے وار کر رہا تھا۔ کوہ پیکر ہاتھی کے قدم لڑکھڑائے اور پانی نور محل کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگا۔

جب اس نے دوبارہ نگاہ اٹھائی تو وہ دریا کے عین وسط میں پہنچ چکے تھے اور بہاؤ کے رخ کنارے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پانی میں بے شمار لاشیں اور لکڑی کے تختے بہتے چلے جا رہے تھے۔ نور محل نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اسے محسوس ہوا' گویا وہ گھنٹوں سے اسی حالت میں ہے۔ یہاں تک کہ ہاتھی تھکا ماندہ کنارے پر جا پہنچا۔

جب نور محل خیمہ گاہ میں پہنچی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ لڑائی کا نتیجہ معلوم کرنے پر اسے بتایا گیا کہ شاہی لشکر کو ہر مقام پر شکست کا سامنا ہوا ہے۔ البتہ فدائی خاں کا محاذ مضبوط رہا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑتا ہوا خیمہ شاہی تک جا پہنچا تھا۔ لیکن کمک نہ پہنچ سکی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا ---- آصف خاں نے پست ہمتی سے کام لیا اور خواجہ ابوالحسن دریا پار کر کے اطمینان سے واپس آ گیا۔

نور محل تھک کر چور ہو چکی تھی اس نے خدام کو رخصت کر دیا اور خود سسکیاں بھرتی مسہری پر دراز ہو گئی۔ دو راتیں اس نے جاگ جاگ کر گزار دی تھیں اس لئے وہ تھوڑی دیر رونے کے بعد گہری نیند سو گئی۔

صبح کو جب وہ پوشاک بدل کر تیار ہوئی' تو اسے معلوم ہوا کہ اس سے ملاقات کے لئے کوئی نہیں آیا۔ اس نے تنہا ناشتہ کیا اور اپنے بھائی کو بلوا بھیجا۔

آصف خاں خاصی دیر کے بعد پہنچا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بہن کو سلام کیا اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے' جب اس نے اپنی بہن کو بتایا کہ بعض امراء خیمے اکھاڑ کر اپنے قلعوں کو واپس جا رہے ہیں۔ ادھر معتمد خاں' جہاں پناہ کا یہ فرمان لے کر آیا ہے کہ لڑائی جاری نہ رکھی جائے۔ لیکن یہ اطلاعات بھی برابر پہنچ رہی ہیں کہ باقاعدہ فوج کے کچھ اور تازہ دم دستے مہابت خاں سے جا ملے ہیں' جو اب باقی ماندہ لشکر پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔

"اور تم؟" نور محل نے پوچھا۔

"خدا جانتا ہے بہن!" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا! "میرا ہاتھ شمشیر کے لئے نہیں قلم کے لئے بنا ہے۔ ہمیں فوراً کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہئے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ دوسروں کی طرح ہم بھی بھاگ جائیں؟ آخر اس سے کیا فائدہ؟"

آصف خاں نے گھبرا کر تکیوں کا سہارا لیا۔

"مہرو' زود یا بدیر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ معتمد خاں تمہیں بھی خبردار کرنے آیا ہے۔ اور شہنشاہ نے ---- اس نے انگشتری والی انگلی دانتوں میں لیتے ہوئے کہا "سنا ہے کہ مہابت خاں نے تمہاری موت کے فرمان پر بھی بادشاہ سے دستخط کرائے ہیں۔"

"میری موت کا فرمان؟"

"ہاں' مہرو! سردار تم سے بہت ناراض ہے۔ لوگوں نے اسے شہنشاہ سے کہتے سنا ہے کہ ان جونکوں کو مسل ڈالیے۔ جنہوں نے آپ کی مردانگی کا خون چوسا ہے۔ صحیح معنی میں آپ شہنشاہ اسی وقت ہوں گے۔ اس کے علاوہ----"

"اور شیخو بابا نے اس پر دستخط کر دیئے؟"

آصف خاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "معتمد خاں قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس وقت جہاں پناہ نشے میں مدہوش تھے اور مہابت خاں بھی ان کے ساتھ جام پر جام لنڈھا رہا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے افغان کے استدلال کا تجزیہ کر کے غور کیا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جہانگیر کو قید میں رکھنے کا جواز ثابت کرنے کے لئے نور محل اور اس کے بھائی کو غدار قرار دینا چاہتا تھا۔ اگر اسے مہلت ملتی تو وہ جہانگیر کو کئی اور باتوں پر آمادہ کر سکتا تھا۔ لیکن موت کا فرمان؟ اس قدر جلد؟ لڑائی کے بعد مہابت خاں غیر معمولی عجلت سے کام لے رہا تھا تاہم وہ ایک سپاہی تھا۔ اگر وہ ایسے معاملات میں عجلت نہ کرے تو کیا کرے؟ لیکن شاید اسے نور محل سے بے حد نفرت تھی اور اسی لئے وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔

"فرمان پر دستخط ہو چکے ہیں۔" اس کے بھائی نے اس کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم ایسے جاں نثاروں کو بھی غدار بنا دیا گیا ہے۔ مہابت خاں کوئی رحم دل دشمن نہیں۔"

اس سے قبل اس نے خرم سے طاقت آزمائی کی تھی اور اب اس کا واسطہ مہابت خاں سے پڑا تھا۔ کیا جہلم کے اس معرکے کی خبر سن کر خرم جلا وطنی کی زنجیریں توڑ دے گا؟

"مہرو! تیار ہو جاؤ" اس کا بھائی کہہ رہا تھا "ہمیں قلعہ اٹک کی طرف فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔ اب باتوں میں وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں۔"

اس کی توجہ اچانک اپنے بھائی کی جانب منعطف ہو گئی۔ آصف خاں کی آواز میں ایک اطمینان کی جھلک تھی۔ یقیناً اس تباہی کا کوئی پہلو ایسا ہے جس پر وہ خوش تھا۔ نور محل کو اس کی دانش مندی اور خود اعتمادی پر کبھی شبہ نہ ہوا تھا۔

"تمہارے ہی حکم سے لشکر کو دریا کے پار پہنچایا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خیمے کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ رہا۔" نور محل نے چیخ کر کہا "تم نے فدائی خاں کے ذریعے سے مجھے رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔"

اس نے دیوانہ وار ایک قہقہہ لگایا۔

"میری آنکھیں تو اب کھلی ہیں۔ تمہارا منصوبہ ہی یہ تھا کہ بادشاہ کے پاس کوئی محافظ نہ رہنے دیا جائے تاکہ سردار کو من مانی کرنے کا موقع مل سکے اور وہ مجھے بھی غدار بنانے میں کامیاب ہو جائے لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچا؟"

آصف خاں کی بھوری آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ درحقیقت وہ ڈر گیا۔ اس نے اپنا منہ بہن کے کانوں کے قریب لے جا کر سرگوشی کے لہجے میں کہا "مہرو! تم ابھی تک ناسمجھ ہو۔ طبیب کہتے ہیں اور مجھے بھی معلوم ہے کہ جہانگیر اب صرف چند ہفتوں کا مہمان ہے امرا ابھی سے سازشوں کے خاکے تیار کر رہے ہیں ۔۔۔۔ اور تم؟ ۔۔۔۔ تم ایک مردے کو سینے سے چمٹائے بیٹھی ہو۔ مہرو! جانشینی کی بات سوچو! کیا تاج و تخت کی کوئی قیمت نہیں؟ خدا کی قسم یہی گھڑی ہے جب ہمیں اپنی تقدیر سنوار لینی چاہئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔۔۔۔"

ایک فوری تاثر نے اس کی زبان پکڑ لی۔ لیکن نور محل نے فوراً لقمہ دیا!

"میں اٹک کی طرف راہ فرار اختیار کر رہا ہوں!" وہ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اس کی تھکی ماندی آنکھوں سے اب کسی جذبے کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

"اگر تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں تو میں بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں۔"

اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور زلفوں کو سنوارتی پرے چلی گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بلاوجہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"تم میرے بھائی ہو آصف خاں! اور تم بادشاہ کی موت سے فائدہ اٹھانے کی باتیں کر

رہے ہو جو میرا شوہر ہے؟ بس اتنا ہی کافی ہے!"

آصف خاں اس کے تیور دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید تم بہت زیادہ تھک گئی ہو مہرو! نہ جانے تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"میرے دل میں بہت کچھ ہے آصف خاں! خدا کرے تمہارے خواب پورے ہوں اور تمہارا راستہ پرسکون رہے۔ آخر تم میرے بھائی ہو۔ کیا میں اپنے بھائی پر یہ الزام لگا سکتی ہوں کہ وہ بادشاہ کے خلاف سازش میں مصروف ہے؟"

"جلال خداوندی کی قسم!"

"بس بس' رہنے دو۔ واقعی میں تھک گئی ہوں۔ اب میں اکیلی اس پار جا رہی ہوں تاکہ اپنے آپ کو مہابت خاں کے حوالے کر دوں!"

نور محل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مہابت خاں کے حوالے کر دے گی' چنانچہ اس کے لئے اس نے طریقہ اور وقت بھی خود ہی تجویز کیا۔۔۔۔!

رات گئے جب مہابت خاں اپنے سالاروں کے ایک اجلاس سے واپس آ رہا تھا تو اس نے اپنے خیمے کے قریب ایک پالکی رکھی دیکھی۔

افغان پہریدار اس کے اردگرد شمعیں لئے آپس میں بحث کر رہے تھے۔ نیم برہنہ کہار پالکی کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور شاہی حرم کا ایک خواجہ سرا آنکھیں جھکائے' دست بستہ حکم کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سردار نے پوچھا۔

خواجہ سرا نے جھک کر سلام کیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پالکی کا پردہ اٹھا اور ایک خاتون باوقار انداز میں برآمد ہوئی۔ مہابت خاں مبہوت ہو کر پکار اٹھا۔

"واللہ؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نور محل نہ تو چوری چھپے آئی ہے' نہ اس سے شرائط طے کرنا چاہتی ہے۔ مشعلوں کی روشنی میں' نور محل کا سفید پیکر سردار کی آنکھوں کے سامنے تھا اور وہی لوگ جو ایک لمحہ پہلے مہابت خاں کے حکم کے انتظار میں تھے' اسے اس طرح دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ پرستان کی کوئی پری ہے۔

"کیا یہ آپ ہی کا خیمہ ہے؟" اس نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا' مہابت خاں کو جواب کے لئے الفاظ نہ مل سکے' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر آپ کورنش بجا لانے کے لئے تیار نہیں تو کم از کم مجھے اندر جانے کا حکم دیجئے! میں آپ کی قید میں ہوں۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں فرمان شاہی یہ ہے کہ ----"

"کہ مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے؟ میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن کیا آپ مجھے اسی طرح ان لوگوں کے سامنے کھڑا رکھیں گے؟

مہابت خاں اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا ---- خواجہ سرا دروازے پر کھڑا رہا ---- اس نے سادہ آرائش کو متجسس نگاہوں سے دیکھا اور شمعدان کے قریب ایک تخت پوش پر بیٹھ گئی۔ فضا گلاب کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ مہابت خاں منتظر تھا کہ اب الفاظ کی جنگ ہوتی ہے یا آنسو بہتے ہیں۔

لیکن نور محل بڑے اطمینان سے بیٹھی رہی۔ وہ سردار کے طویل سکوت سے لطف اندوز ہو رہی تھی' شاید وہ سوچ رہا تھا کہ نور محل اس کے خیالات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"کیا ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں؟" نور محل نے مسکرا کر کہا "لیکن جو دشمن خود ہی سپر انداز ہو جائے کیا آپ کے نزدیک کسی تواضع کا بھی مستحق نہیں؟ مجھے پیاس لگ رہی ہے اور میں تھکی ہوئی بھی ہوں!"

مہابت خاں شربت اور کھانا لانے کا حکم دینے کے لئے دروازے کی طرف مڑا۔ لیکن اسے یاد آیا کہ نان و نمک پیش کرنے کے بعد وہ اپنی عزت کی خاطر نور محل کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے گا۔ اس نے سر ہلایا اور نور محل کے سامنے ٹہلنے لگا۔ یقیناً وہ عورتوں کی سی چترائی سے کام لیتے ہوئے اس سے جہاں گیر کے پاس جانے کی اجازت طلب کرے گی ---- لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرے گا۔

"اگر آپ تواضع کرنی نہیں چاہتے تو کیا میں اپنی موت کا فرمان دیکھ سکتی ہوں؟"

افغان سردار نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور سرہانے رکھے ہوئے ایک صندوق سے شاہی فرمان نکالا اور متوازن آواز میں پڑھنا شروع کیا!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمیں ایرانی نژاد نور محل کی بے وفائی کا یقین ہو گیا ہے۔ اس نے تخت شاہی کے خلاف سازش کی اور ہمیں اس پر مجبور کیا کہ ہم

اس کے نام کے سکے ڈھلوائیں اس نے اپنے رشتہ داروں کو اعلیٰ منصب پر پہنچایا اور ہمیں زہر دے کر رشتہ حیات سے منقطع کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا ہم حکم دیتے ہیں کہ اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے۔"

اور اس فرمان پر تمہارے سرتاج ـــــ شہنشاہ جہاں گیر کی مہر ثبت ہے۔ یہ فرمان جہاں پناہ کو بھی اسی طرح پڑھ کر سنا دیا گیا تھا' جس طرح تمہیں سنایا گیا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے نور محل کا سانس رک گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا سارا خون چہرے میں سمٹ آیا ہے۔ لیکن چہرے پر چونکہ نقاب پڑی تھی۔ اس لئے سردار اسے نہ دیکھ سکا۔

"زہر کا قصہ آپ تک کیسے پہنچا؟" نور محل نے نرمی سے پوچھا وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ جہانگیر نے اس پر دستخط کرنے سے پہلے کتنی افیون کھائی ہو گی۔

"دربار کے ایک فراش نے یہ قصہ پرویز کے خیمے میں بیٹھ کر اس وقت سنایا جب وہ شراب کے نشے میں چور تھا۔"

وہ ٹہلتا ٹہلتا رک گیا اور نور محل کے احتجاج کا انتظار کرنے لگا۔

"قصہ خواہ کوئی سنائے آپ اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔ "بہرحال غیار بیگ کے فرزند! مجھے اتنا بتا دیجئے کہ کیا آپ واقعی مجھے سزائے موت دینے کا تہیہ کر چکے ہیں؟"

اب مہابت خاں کی باری تھی کہ وہ دلائل تلاش کرے۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ کمر سے بندھے ہوئے خنجر کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت کبھی سخت ہو جاتی' کبھی ڈھیلی پڑ جاتی۔ اس کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نور محل نے خیمے کی طناب کا سہارا لیتے ہوئے اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور آہستہ سے کہا:

ارے بیوقوف! ـــــ بہادر اور خودپسند بیوقوف! ایسی صورت میں تم خود میری زبان کھلوا رہے ہو! تم دوسروں کی باتوں میں آ گئے ہو۔ تمہاری تکیل کسی اور کے ہاتھ میں ہے شخص تمہارے خلاف سازش کر رہا ہے اسی نے فراش کو بھیجا تھا۔ اسی نے برخوردار کو کوڑے لگوائے تھے اسی نے تمہاری تذلیل کی تھی اور اب تم اسی کی خواہش پر زخمی سور

کی طرح بپھر رہے ہو!"

سردار کی گھنی بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اگر یہ سچ ہے تو مجھے اس کا نام بتاؤ!"

"نہیں، تم خود ہی معلوم کر لو" نور محل نے آہستہ سے سر ہلایا۔ وہ اس شخص کے سامنے اپنے بھائی کا نام کس طرح لیتی؟ جو اپنی توہین کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ "تم ہندوستان کے بادشاہ بننا چاہتے ہو اور اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کر سکتے۔"

"میں؟ خدا جانتا ہے! میں نے تخت کی کبھی خواہش نہیں کی۔"

"میں نے تو یہی سمجھا ہے کہ جو کوئی رکاب میں پاؤں رکھ دیتا ہے، اس کے لئے سواری بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔" اس کا قہقہہ طلائی گھنٹی کی جھنکار سے مشابہ تھا۔

"میں صرف شہنشاہ کا خادم ہوں! اور یہ واقعہ ہے!" اس نے اپنا بے ڈول ہاتھ پھیلایا۔ "خدا کی قسم! یوم حشر کی قسم جب تمام اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔"

"سنو!" نور محل نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹہلنا بند کر دیا۔ اس کے کانوں میں خیمے کے پردوں کے پیچھے سے ستار کی دھیمی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی نے بلند آواز میں گانا شروع کیا۔

"اب سنو۔" نور محل نے کہا اور اس کی سیاہ آنکھوں نے نقاب میں سے مہابت خاں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی، شاہی حمام میں گانے والی گا رہی تھی۔

مہابت خاں چپ چاپ انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھی کرتا رہا۔ جہانگیر کی درخواست پر رقاصاؤں کو شاہی خیمے میں رہنے دیا گیا تھا۔

"میں سن رہا ہوں" مہابت خاں نے درشت لہجے میں کہا۔ نور محل نے نقاب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے نوچ کر زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد اپنا منہ مہابت خاں کی طرف کر لیا۔ مہابت خاں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں تکان نے حلقے ڈال دیئے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے نرم و نازک لبوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی جھلک تھی اور اس کی صباحت میں اچھوتے پن کی سی دل فریبی ابھی باقی تھی۔

"اب تو میں نے پردہ بھی اٹھا دیا ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں مہابت خاں کی آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طرح اب میری عزت بھی خاک میں مل گئی ہے۔ میں نے سالہا سال اپنے شوہر کی خدمت کی ہے ---- وفاداری سے ---- پوری وفاداری

سے! لیکن شاید اب موت کی تلوار مجھ پر کرم کرے گی۔"

اس کے شانے لرز اٹھے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

"مجھے جلادوں کے حوالے نہ کرنا۔ کسی تنہا مقام پر چپ چاپ خود اپنی تلوار سے میرا قصہ پاک کر دینا۔"

مہابت خاں نے اپنا ہاتھ خنجر کے دستے سے اٹھا لیا۔ جیسے اس نے ڈس لیا ہو۔

"کیا میرا چہرہ دیکھ کر تمہیں تکلیف ہوتی ہے؟" اس نے آہ بھری اور مسکرا کر کہا۔ "مجھے بھی تکلیف ہو رہی ہے۔ لو' میں نقاب دوبارہ ڈال لیتی ہوں ---- تمہاری تلوار کا وار بھی اسی طرح تیز اور کاری ہونا چاہئے۔"

اس نے بائیں شانے سے لبادے کی آستین ہٹا دی اور ہاتھ اوپر اٹھایا' اس کا عریاں بازو اس کے سیاہ سر پر دمک رہا تھا۔ اس کے خدوخال اینٹھ گئے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں۔

"کیا میں سگ بے حیا ہوں؟" اس نے موت کا فرمان انگلیوں سے مسل دیا۔ "خاتون محترم! آپ اپنے شوہر کے پاس چلی جائیے۔

نور محل کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھا۔ لیکن وہ منہ سے ایک لفظ کہے بغیر اپنی نقاب سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

(۷)

جہاں گیر بڑی دلچسپی سے اپنے زوال کا تماشا دیکھتا رہا تھا۔ جہلم کی لڑائی کے دوران میں اس نے اپنی نشست ایک ایسے مقام پر رکھی تھی جہاں سے وہ دریا کا نظارہ کر سکتا تھا اس جگہ گھمسان کی لڑائی دیکھ کر اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوئی اتنی شاید ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ کر بھی نہ ہوئی تھی۔ جب فدائی خاں نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ جس کا اثر شہنشاہ کے خیمے تک پہنچ گیا اور اس پر چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ تو وہ اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اسے یاد نہ رہ سکا کیونکہ ہیجان و خروش نے اس کے اعصاب پر نہایت ناخوش گوار اثر ڈالا تھا۔ اور دمے کی وجہ سے اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ جس سے سکون حاصل کرنے کے لئے اسے بار بار شراب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

اس نے مہابت خان سے کوئی بات کی تھی کسی فرمان پر دستخط کئے تھے کیا فرمان معتمد خاں اور نورمحل کے منشی رائے گوردھن نے پیش کیا تھا ---- پھر تھوڑی دیر تک وہ کنیزوں کا گانا سنتا رہا یہاں تک کہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اچٹتی نیند میں وہ مختلف خواب دیکھتا رہا' جن میں عجیب عجیب قسم کی صورتیں اس کے قریب آکر اسے گھورتیں۔ جب اس کا دم گھٹنے اور سینہ تنگ ہونے لگتا' تو وہ زور زور سے نورمحل کو پکارنا شروع کر دیتا اور پاسبان اسے یقین دلاتے کہ ملکہ عالم خیمے کے قریب ہی کہیں گئی ہیں۔

اندر ہی اندر کوئی اسے خبردار کر رہا تھا کہ اب اسے احکام صادر کرنے کا اختیار نہیں رہا۔ اب وہ قیدی ہے اور مہابت خاں کی مرضی کا پابند۔ بعض اوقات وہ معتمد خاں اور رائے گوردھن سے سوالات کرتا لیکن وہ اسے مبہم سے جواب دیتے تاہم وہ جو کچھ لکھواتا اسے وہ بڑے ادب سے لکھ دیتے تھے۔ اس کے بدن کے درد نے اس کے خیالات کو بھی پراگندہ کر دیا تھا اور وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ جب وہ عصر کے وقت نیند سے بیدار

ہوا تو اس نے نور محل کو اپنے پہلو میں بیٹھے پایا۔

"مہرو!" اس نے بڑے اضطراب سے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں پہلے تو اسے اپنے سامنے دھندلکے سے دکھائی دیئے لیکن بہت جلد نور محل کا چہرہ صاف ہو گیا اور اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ پچھلے چند دن کے ہنگاموں نے اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا۔ نور محل نے چپ چاپ ایک رومال سے اس کی آنکھوں کا پسینہ پونچھا۔

"مہرو! تم پر کیا بیتی؟ جیسا کہ مشہور ہے کیا تم دریا کے اس پار گئی تھیں؟"

"شیخو بابا! تھوڑی دیر کے لئے" اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ اطمینان سے تکیے کے سہارے لیٹ گیا' لیکن اب میں یہیں ہوں ---- آپ کے قدموں میں!"

جہانگیر کو قدرے سکون ملا۔ تو اس کی طبیعت میں ایک معمولی سی جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی۔ اس نے بہ اصرار پوچھا کہ مہابت خاں کے کیا ارادے ہیں؟ اور نور محل نے حملے کے بعد اس کے خلاف کیا اقدام کیا تھا؟ معتمد خاں نے جب قسمت کا پانسہ پلٹتے دیکھ کر وفاداری کا رخ بدلا تھا۔ تو اس نے دریا پر مہابت خاں کے حملے اور شہنشاہ کی گرفتاری کے واقعات کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا کہ اس کا کوئی واضح نقشہ جہاں گیر کے ذہن میں قائم نہ ہو سکا تھا۔ نور محل خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ جہاں گیر جن لوگوں سے یہ تمام باتیں کرتا تھا' ان میں اس کے دشمن بھی شامل تھے اور اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد تو وہ اپنے منشی پر بھی اعتماد نہ کر سکتی تھی۔

"اطمینان رکھیئے۔ میرے سرتاج!" اس پر سکون لہجے میں کہا۔ "مہابت خاں آپ کا وفادار ہے۔ وہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچنے دے گا۔ اب ہم اس کے ساتھ کابل جا رہے ہیں۔ سردست میں نے شاہی مہر اور دیوانی کے اختیارات اس کے حوالے کر دیئے ہیں۔"

جہانگیر نے شاہی اختیارات سے محروم نور محل کا تصور کرنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا۔

"لیکن مہرو! تم کیا کرو گی؟"

"بس آپ کی خدمت۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

جہانگیر اس پر مطمئن ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا کہ مجھے مدت سے کابل جانے کی خواہش تھی جو اولیاء کا مسکن ہے اور جہاں ہرن کا شکار بھی ملتا ہے۔

باہر مہابت خاں کے حکم سے لشکر نے ایک مرتبہ پھر یکجا ہو کر کوچ کرنا شروع کر دیا۔

لیکن نور محل اپنے شوہر کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ اس کا ـــــ اور اس کے ساتھ مہابت خاں کا بھی ـــــ مفاد اسی میں تھا کہ جہاں گیر زندہ رہے اور کوئی شخص اس کے فرائض میں مداخلت نہ کرے۔ اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ شہنشاہ کو فرمان موت کا کوئی علم نہ تھا اور اصل حالات سے تو وہ بالکل بے خبر تھا۔ سالہا سال سے اس نے اپنے آپ کو نور محل کے حوالے کر رکھا تھا اور وہ اطاعت کا عادی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس نے مہابت خاں کی اطاعت بھی بے چون و چرا قبول کر لی۔ لیکن یہ فرق وہ محسوس نہ کر سکا کہ نور محل نے تو خود اس کے فائدے کے لئے اسے اپنا مطیع بنایا تھا اور افغان سردار اسے کٹھ پتلی بنا کر کچھ عرصے کے بعد کسی اور کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ نور محل جانتی تھی کہ مہابت خاں کے نزدیک آئندہ تخت کا وارث بلا نوش پرویز ہی ہو سکتا ہے۔ خرم تو اتنا حوصلہ مند تھا کہ شاید وہ مہابت خاں کی آڑ میں نہ رہتا اور سب سے چھوٹا شہزادہ شہریار نور محل کا داماد تھا۔

تیمارداری کے دوران میں نور محل کو کچھ ایسے لمحات مل جاتے' جن میں وہ جہاں گیر کو یقین دلاتی کہ وہ محض ایک قیدی ہے اور قید سے آزاد ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کے کہنے پر عمل کرے۔ اسے بہ ظاہر مہابت خاں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے چاہئیں۔ حتی کہ ضرورت پڑنے پر وہ مہابت خاں سے نور محل کی شکایت بھی کر سکتا ہے کہ وہ کچھ بیزار بیزار سی رہتی ہے اور اس کی اس بیزاری پر اسے ـــــ جہاں گیر کو ـــــ غصہ آتا ہے۔

جہانگیر کو ایک "قابل اعتماد قیدی" کا کردار ادا کرنے پر آمادہ رکھنا بڑا نازک کام تھا۔ اس نے فرار کے کئی ناتمام منصوبے تیار کئے حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مہابت خاں پر ان منصوبوں کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ اس لئے کہ جہاں گیر کا پیٹ ہلکا ہے اور اخفائے راز اس کے بس کی بات نہیں۔

شاہی حرم کے لوگ مخبری کرنے میں جواب نہ رکھتے تھے اور سردار بھی بڑی ہوشیاری سے کام لے رہا تھا۔ اس نے رائے گوردھن کی امداد سے نور محل کی آس پاس کی جائداد پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور کچھ فوج لاہور کے شاہی خزانے پر قبضہ کرنے کے لئے بھیج دی۔ اس کے بعد اس نے اٹک کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جہاں آصف خاں نے پناہ لے رکھی تھی۔ چنانچہ جب لشکر ویران پہاڑوں سے ہوتا ہوا قلعہ اٹک کے دروازے پر پہنچا' تو اطلاع ملی کہ آصف خاں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور خرم کے بیٹے بھی اس کے ساتھ

ہیں۔ اب آصف خاں مع شہزادوں کے اپنے پرانے دشمن کا قیدی تھا۔۔۔۔!

اٹک فتح کرنے کے بعد مہابت خاں نے شمالی علاقے کے لئے ایک نیا حاکم مقرر کیا ۔۔۔۔ اور راجپوت راجاؤں کو صلح کا پیغام بھیج کر لشکر کو کابل کی جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ درہ خیبر پار کر جائے تو ہندوستان سے کوئی اس پر حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکے گا۔

موسم گرما کے وسط میں جب وہ کوہستانی شہر کی سرمئی فصیل کے پاس پہنچے تو مہابت خاں نے جہاں گیر کو دروازے سے گزارنے کے لئے ایک شاہی جلوس مرتب کیا۔ اس نے بادشاہ کو ہاتھی پر بٹھایا اور شاہی خدام کو حکم دیا کہ وہ ہودج پر سے روپے اور اشرفیاں نچھاور کرتے جائیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ فاتح جرنیل' دل آسودہ جہانگیر کا محض ایک دم ساز مصاحب ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جہاں گیر مطمئن اور شاد کام تھا۔ جب اس نے اپنے سامنے برفانی چوٹیوں کو سر اٹھاتے اور سرسبز مرغزاروں کو انگڑائیاں لیتے دیکھا تو اس کی طبیعت میں فرحت و مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اسے تربوز بھجوائے جائیں اس موقع پر اس نے اپنے جد امجد ۔۔۔۔ بابر ۔۔۔۔ کا ایک دل پسند شعر پڑھا جو اس نے کابل فتح کرنے کے بعد کہا تھا:

بخور در ارک کابل مے بگرداں کاسہ پے در پے
کہ ہم کوہ است و ہم دریا و ہم شہراست و ہم صحرا

وہ راجپوتوں کے جلو میں ہرن کے شکار کو گیا۔ کابل کے قرب و جوار میں بیشمار سرسبز و شاداب چراگاہیں تھیں۔ جن میں گھوڑے چلتے چلتے چر سکتے تھے اور کوہستانی بکروں کے علاوہ ہرنوں کی ڈاریں قلانچیں بھرتی پھرتی تھیں۔

بظاہر نور محل نے اپنی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہ کی تاہم اندر ہی اندر وہ بیحد مصروف تھی۔ اس نے خواجہ سراؤں کے ذریعے ان تمام فوجی سرداروں سے رابطہ قائم کیا جو جہانگیر کے وفادار تھے۔ گھڑسواروں میں بھی اکثر سپاہی راجپوتوں کی تکا بوٹی کرنے کو تیار تھے لیکن نور محل نے انہیں مناسب موقع کا انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ اس دوران میں اس نے شاہراہ کابل پر اپنے آدمیوں کو پیغامات بھجوائے' فدائی خان سے نامہ و پیام اور ان

صوبے داروں سے رابطہ پیدا کیا جو اس ہنگامے میں غیر جانب دار رہے تھے اور حالات کے منتظر تھے اس نے خواجہ سرا ہشیار خاں کو خاص طور پر حکم بھجوایا کہ وہ لاہور میں سب سے زیادہ اسپ سوار جمع کرے اور کابل کی طرف روانہ ہو جائے۔ اسے آصف خاں کے متعلق کوئی خبر نہ ملی اور اس نے مہابت خاں سے بھی کوئی بات نہ کی' جو فوج سے زیادہ نور محل سے ڈرتا تھا۔ تاہم اسے کوئی گزند پہنچانی نہ چاہتا تھا۔

جب نور محل کے آدمیوں نے اس کا ارادہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے ہدایت کی کہ وہ موقع کا انتظار کریں۔ اس سے وہ یہ سمجھے کہ نور محل حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال رہی ہے' حالانکہ ابھی تک کوئی مکمل خاکہ اس کے ذہن میں نہ تھا۔

مہابت خاں کے اعتماد کو جس چیز نے متزلزل کیا وہ راجپوت سرداروں کی ایک غیر متوقع بغاوت تھی جس سے نور محل کو بھی آنے والے واقعات کا صحیح اندازہ ہو گیا راجپوتوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ چراگاہوں کے سوال پر کابل کے افغانوں سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ فریقین میں ایک دست بدست لڑائی ہوئی جس میں آٹھ سو کے قریب راجپوت ہلاک ہو گئے۔ مہابت خان نے امن بحال تو کر لیا۔ لیکن اسے احساس ہوا کہ ایک غاصب کے لئے فوج کے متضاد عناصر کو متحد رکھنا آسان نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کابل میں رہتے ہوئے وہ سلطنت مغلیہ کے بڑے بڑے شہروں سے کٹ گیا ہے۔

خزاں کے شروع ہوتے ہی وہ قیدی شہنشاہ اور لشکر کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے پوری کوشش کی کہ راجپوتوں اور باقاعدہ گھڑ سواروں کے دستے ایک دوسرے سے دور رہیں۔ کوچ کے دوران میں اسے یہ بھی احساس ہوا کہ نور محل اکثر فوجی سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو چکی ہے اس کے لئے جہانگیر پر پہرہ بٹھانا اور یرغمالوں کی نگرانی کرنا آسان نہ رہا اور وہ شمالی ہند میں اپنے حلیفوں کو بھی قابو میں نہ رکھ سکا۔

"بخدا" اس نے ایک دفعہ خواجہ ابوالحسن سے کہا "میں گزشتہ تین مہینے سے ایک رات بھی آرام کی نیند نہیں سو سکا۔"

اسے اپنے انجام کی پروا نہ تھی۔ لیکن تذبذب اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ مجرموں کو عبرتناک سزائیں دینے اور ذرا ذرا سی بات پر پھانسی کے احکام جاری کرنے لگا۔

اسے صرف جہانگیر کے مصالحانہ رویے پر اعتماد تھا البتہ نور محل پر اسے شبہ تھا کہ لاہور پہنچتے ہی وہ شہنشاہ کو رہا کرانے کی کوشش کرے گی ---- اتنے میں ایک ایلچی خبر لایا کہ دو ہزار گھڑ سواروں کا ایک دستہ بادشاہ بیگم کے خواجہ سرا ہشیار خان کی قیادت میں لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس دستے نے رہتاس کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا جو جہلم کے قریب کم و بیش دو منزل کی مسافت پر واقع تھا۔

مہابت خان یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوا۔ آخر کوئی ظاہری دشمن نظر تو آیا۔ علاوہ بریں اس کے سامنے دو ہزار گھڑ سواروں کی حیثیت ہی کیا تھی؟ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے راجپوت سپاہیوں کا ایک طاقت ور دستہ روانہ کیا جائے جو کمک کو منتشر کر دے اور اس کے بعد رہتاس کے مقام پر لشکر کا انتظار کرے۔ ابھی وہ اس فیصلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ اسے جہانگیر کا یہ پیغام ملا۔ "لشکر کے اختلافات مٹانے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ آئندہ فوجی معائنے کے وقت مہابت خاں غیر حاضر رہے۔"

ادھر خواجہ ابوالحسن نے مہابت خاں کے خیمے میں حاضر ہو کر مشورہ دیا کہ اگلے دن معائنے کے وقت نور محل کے حامی سرداروں کو عام لشکر سے علیحدہ رکھا جائے۔ مہابت خاں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور اسی رات آزمودہ کار راجپوت گھڑسواروں کے دو دستوں کے ہمراہ رہتاس روانہ ہو گیا۔

اس نے سارا فاصلہ ایک دن اور ایک رات میں طے کر لیا لیکن رہتاس پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ہشیار خان کی فوجیں ابھی تک نہیں پہنچیں' چنانچہ اس نے شہر پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے دن تھکے ہوئے گھوڑے اور ان کے سوار دریا کے کنارے سستا رہے تھے کہ ایک پٹھان نے آکر سردار مہابت خاں سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"شہنشاہ آپ کی قید سے رہا ہو کر بادشاہ بیگم کے گھڑ سواروں سے جا ملے ہیں" اس نے اطلاع دی۔

یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ مہابت خاں کو یقین تھا کہ اس سازش میں نور محل کا ہاتھ ہے صبح سپاہیوں نے حسب معمول جہانگیر کے خیمے کے سامنے فوجی مشق کی۔ مہابت خاں کے سابقہ احکام کے مطابق راجپوت گھڑ سوار سڑک کے ایک طرف اور نور محل کے حامی سڑک کے دوسری طرف صف آراء تھے ان دونوں قطاروں کے درمیان شاہی ہاتھی شہنشاہ اور اس کے مصاحبوں کو سلامی کے لئے لے کر گزرا۔ جب وہ عین وسط میں پہنچا' تو احدیوں کا ایک

دستہ اپنے سردار کے اشارے پر آگے بڑھا اور اس نے شاہی ہاتھی کے اردگرد کھڑے ہو کر "بادشاہ سلامت!" کے نعرے لگائے۔ نعروں کا بلند ہونا تھا کہ نور محل کے حامی دستے احدیوں سے جا ملے اور شہنشاہ کو اپنی وفادار فوج کی کمان سنبھالے دیکھ کر باقاعدہ گھڑسوار دستوں کی اکثریت بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ شاہی فوج کے مقابلے میں راجپوت سپاہی اب بے حیثیت ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو ساز و سامان لپیٹ کر بھاگ نکلے۔

مہابت خاں نے محسوس کیا کہ اسے بڑی ہشیاری کے ساتھ زک پہنچائی گئی ہے تاہم اسے معلوم تھا کہ اس کا اقتدار پائدار نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے فوراً اپنے رہے سہے وفادار گھڑسواروں کو جمع کیا اور جنوب کی جانب کوچ کا اعلان کر دیا ---- اس نے ایک نئی فوج جمع کرنے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوا کہ اس کے خزانے کا قافلہ گرفتار کر لیا گیا ہے اور بادشاہ بیگم کی امداد کے لئے برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ ایران کی طرف مڑتے ہوئے اسے خبر ملی کہ نور محل نے اس کے تعاقب میں فوج روانہ کی ہے اب اس نے یرغمالوں کو آزاد کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ شہزادہ خرم کی طرف روانہ ہوا۔

مہابت خاں کی صد روزہ حکومت ختم ہو گئی اور اب شکست خوردہ سپہ سالار جلاوطن شہزادے ---- خرم ---- سے جا ملا' جس نے اس کا پرجوش خیرمقدم کیا۔ حالات کے طاقت ور ہاتھ نے ان دونوں کو نور محل کا جانی دشمن بنا دیا----

۱۶۲۶ء کے موسم خزاں کا ذکر ہے----!

برسات ختم ہو چکی تھی۔ جہانگیر فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا ایک مرتبہ پھر آگرہ میں داخل ہوا اور اسی روز اس نے "جھروکہ" میں رعایا کو "درشن" بھی دیئے جس کے سامنے گزشتہ فتوحات کی یادگار کے طور پر ہاتھیوں پر سوار دو راجپوت بہادروں کے سنگین مجسمے ایستادہ تھے۔

نور محل اب حکومت کے بکھرے ہوئے اوراق کی ازسرنو شیرازہ بندی میں مصروف تھی۔ آصف خاں اگرچہ گزشتہ تین مہینے کے واقعات سے سہما سہما سا نظر آتا تھا۔ تاہم نور محل نے اسے دیوان مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر وہ نہ صرف اپنی قابلیت کا مظاہرہ کر سکتا تھا بلکہ اسے سازش کا موقع بھی نہ مل سکتا تھا۔ فوج کی کمان اس نے خان جہان لودھی کے ہاتھ میں دے دی جو ایک معتمد خادم سلطنت تھا اور جس نے بغاوت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ خان جہان لودھی تمام فوجیں یکجا کر کے دکن کی جانب چل پڑا۔ جہاں خرم اور مہابت

خاں ایک نئی سازش کا بیج بو رہے تھے۔

نظم و نسق بحال کرنے کے بعد نور محل نے جانشینی کے سوال کی جانب توجہ کی۔ وہ جانتی تھی کہ اب جہانگیر چند مہینے کا مہمان ہے۔ امراء وزراء بھی ولی عہد کے تقرر پر زور دے رہے تھے۔ ان کی وفاداری کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ولی عہد کسی شہزادے ہی کو بنایا جائے لیکن ابھی وہ سوال پر غور ہی کر رہی تھی کہ شہزادہ پرویز' جو مدت سے اخلاقی طور پر تباہ ہو چکا تھا' اچانک اپنے خیمے میں وفات پا گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسے شراب کھا گئی لیکن قلعہ آگرہ میں حاضر ہونے والوں نے بتایا کہ خسرو کی طرح پرویز کو بھی زہر دیا گیا ہے۔

"لیکن کس نے؟" نور محل نے پوچھا۔

وہ زہر دینے والے کا نام نہ بتا سکتے تھے۔ ممکن ہے زہر تھوڑا تھوڑا کر کے دیا گیا ہو' ---- یا شاید افیون زیادہ مقدار میں گھول کر پلا دی گئی ہو ---- بہرحال پرویز کے حالات کو دیکھتے ہوئے قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ شراب ہی مغلوں کی تباہی کا باعث ہوئی۔ پہلے اکبر کے دو بیٹے اس کی بھینٹ چڑھے اس کے بعد یہ پرویز کو لے بیٹھی۔ صرف خرم اس کے برے اثرات سے محفوظ رہا۔

نور محل خرم کے متعلق سوچنے لگی۔ پرویز کے انتقال کے وقت جلاوطن شہزادہ سرحد پر تھا لیکن اسے جہانگیر کی قید کا بخوبی علم تھا۔ ممکن ہے وہ سمجھتا ہو کہ جہانگیر کے بعد جانشینی کا قرعہ فال اس کے جانی دشمن پرویز کے نام نکلے گا ---- اور اب پرویز خاموشی سے موت کے منہ میں چلا گیا ہے۔

"بھائی نے بھائی کو پھر مار ڈالا" نور محل نے دل ہی دل میں کہا :۔

اس نے شاذ ہی پرویز کو دیکھا تھا۔ تاہم اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک شریف نوجوان ہے جسے سیر و شکار اور جنگ کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ بایں ہمہ اس کی موت نے خرم اور نور محل کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔ اسے سرد مہر شہزادہ قابیل سے کم نظر نہ آتا تھا جس نے بڑی بے رحمی سے اپنے بھائی ہابیل کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور مہابت خاں کو خرم تک پہنچانے کی ذمہ دار وہ خود تھی۔

نور محل کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا۔ جہانگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے اور لاڈلی کے شوہر شہریار کو جانشینی کے لئے آگے بڑھایا جائے۔ نور محل نے حالات کے تقاضوں کا

جائزہ لیا' نتائج و عواقب پر نگاہ ڈالی اور بڑی بے دلی سے لاڈلی کو بلا بھیجا۔ اس نے مدت ہوئی قسم کھا رکھی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو' وہ لاڈلی کو حرم میں کبھی نہ بلائے گی کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اپنی بیٹی کو محل کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔

"لیکن میری جان! اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟" اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ یہ سن کر لاڈلی بے اختیار رونے لگی۔

نور محل چونکہ اس کش مکش کے نتائج سے پوری طرح آگاہ تھی جو جانشینی کے سوال پر مختلف دعویداروں کے درمیان رونما ہونے والی تھی اس لئے لاڈلی کی پریشانی اسے بے معنی اور حقیر نظر آئی۔ اس نے مامتا کے سینے پر صبر کی سل رکھ لی۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ شہریار کا بھی وہی حشر ہو جو خسرو اور پرویز کا ہو چکا ہے؟" نور محل نے سختی سے پوچھا: "یقیناً اسے چاہئے کہ میری اور تمہاری مدد سے اپنی حیثیت مستحکم کرے!"

"ہاں' اگر وہ ایسا کر سکے!" لاڈلی نے جواب دیا۔

یہ عجیب بات تھی کہ نور محل دوسروں میں تذبذب اور بے یقینی کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اس نے اکثر جہانگیر کے تذبذب کا بھی بڑی دلیری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شہریار کاہل ہونے کے علاوہ ارادے کا بھی کچا تھا اور لاڈلی اس سے قدرے بہتر تھی لیکن اسی نسبت سے شہریار کے دشمن بھی کم تھے۔ اگر وہ بادشاہ بن جائے تو نور محل نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے کے علاوہ اسے سازشوں کے گڑھوں میں گرنے سے بھی بچا سکتی ہے۔

"نہیں نہیں لاڈلی! اسے کرنا چاہئے۔" نور محل نے کہا "کیا تم بھول گئیں کہ جب شہریار آشوب چشم میں مبتلا ہوا تو جہانگیر نے کیا کہا تھا؟ اسے خطرہ تھا کہ اس کے بھائی اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں گے۔ اسی لئے جہانگیر نے علاج کو منع کر دیا تھا۔ کیا تم زندگی بھر ایک اندھے کے پہلو میں بیٹھے رہنا پسند کرو گی؟"

لاڈلی یہ سن کر اور بھی زار و قطار رونے لگی۔ نور محل نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے سیاہ بال لڑکی کی سنہری زلفوں سے الجھنے لگے۔ وہ دونوں چند لمحے سکون و اطمینان کے ساتھ چپکے چپکے باتیں کرتی رہیں۔

"اچھا تو تم اپنے شوہر کو میرے پاس بھیج دو ---- لاڈلی!"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے!"

لیکن ایک ہفتے کے اندر نور محل نے اسے شاہی حرم میں بلا بھیجا۔ اس نے پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا کہ اس کے اعزاز و منصب میں اضافہ کر دیا جائے۔ اسے قندھار کی جنگ کے لئے فوج کی اعزازی کمان دے دی گئی جس سے وہ لوگوں کی نگاہوں میں آ گیا۔ اس کی بیماری کے ذکر پر نور محل نے مغلوں کی اس کمزوری کا اعتراف کیا کہ وہ شراب کے رسیا ہیں اور رقاصاؤں کے ساتھ شہریار کی شب آرائیوں پر لاڈلی آتش بہ دل ہے۔ جب شہریار اس کے پاس آیا' تو وہ بیس سال کا ایک پست قامت لیکن حسین نوجوان تھا' جس نے ایک بڑی سی دستار باندھ رکھی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑے غور سے دیکھتی رہی۔

شہریار کی جلد کا رنگ ناگوار حد تک سرخ تھا اور اس نے مونچھیں اور بھویں منڈوا رکھی تھیں۔ نور محل نے اس سے چند باتیں کیں اور اسے مشورہ دیا کہ وہ خان جہان لودھی سے جا ملے اور جنوبی ہند میں فوجوں کی کمان سنبھال لے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ شہریار میں جرات و اقدام کا جذبہ ایک حد تک ختم ہو چکا تھا۔

شہریار کو رخصت کرنے کے بعد نور محل نے کم سخن عرب شاہی طبیب روح اللہ کو طلب کیا اور اس سے پوچھا:۔

"شہزادہ شہریار کو کیا بیماری ہے؟ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے اور اس کی آنکھیں بجھ سی گئی ہیں۔"

عرب طبیب نے سر ہلایا جیسے وہ بیماری کو خوب سمجھتا ہے ---- "علیا حضرت! میں نے شہزادے کو دیکھا ہے' اس بیماری کو ہماری اصطلاح میں "داوا الثعلب" کہتے ہیں۔ اس میں انسان کے بال جھڑ جاتے ہیں۔ اور یہ عسیرالعلاج بیماری ہے۔

"لیکن یہ ہے کیا؟"

طبیب نے ہچکچاتے ہوئے تھوڑی دیر تک ڈاڑھی کو کھجایا پھر وضاحت کی۔

"علیا حضرت! اجازت عطا فرمائیں۔ تو فدوی عرض کرنے کی جرات کرے کہ یہ بیماری کوڑھ کی ایک قسم ہے' جس میں بال جھڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور مردانہ قوتوں میں ضعف آ جاتا ہے۔ یہ جسم کو گھلا دیتی ہے اور اس کا علاج سننے میں بھی نہیں آیا۔ تاہم خدا کا فضل و کرم شامل حال رہا تو ----"

"لیکن یہ ہوتی کیسے ہے؟"

"چھوت سے!"

نور محل کے دل میں ایک گھونسا سا لگا۔ یہ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ لاڈلی کا شوہر اس حال کو پہنچ جائے گا۔ اسے ان ہندو عورتوں کا خیال آیا' جن سے شہریار کی راہ و رسم تھی اور اپنی بیٹی کا سارا دکھ درد اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ شہریار اب ایک کوڑھی تھا اور کوڑھی کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ لاڈلی کی گود میں بچہ تھا اور یقیناً اسے ایک ایسے بیمار کی تیمارداری نہیں کرنی چاہئے۔

شہریار ولی عہد نہیں بن سکتا تھا' جب تک کہ وہ تندرست و توانا نہ ہو جائے' لوگ ایک کمزور اور رحمدل شخص کی حکومت کو تو تسلیم کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی شکل و صورت سے بادشاہ معلوم ہوتا ہو۔ لیکن ایک ایسے انسان کی اطاعت کیسے قبول کی جا سکتی ہے' جس کے جسم پر جابجا داغ ہوں' بال گر چکے ہوں اور جس کے قریب تک جانے میں کراہت ہوتی ہو۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ خرم اسے زہر دینے کی ضرورت کیوں محسوس کرنے لگا۔

"آپ توجہ سے علاج کیجئے" نور محل نے عرب طبیب کو حکم دیا "اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ یاد رکھیے کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اس سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ جب تک اسے صحت نہیں ہوتی وہ دربار میں نہ آئے۔ اور گھر والوں سے دور لاہور جا کر رہے۔"

طبیب نے جھک کر سلام کیا ---- "بادشاہ بیگم کا حکم سر آنکھوں پر لیکن جہاں پناہ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

نور محل نے اس کی مفکر آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"وہ ہمارا فرض ہے' تم اپنا فرض انجام دو!"

جب طبیب چلا گیا تو نور محل نے کنیزوں اور خواصوں کو رخصت کیا اور خود اس مرمریں خواب گاہ میں آ کر بیٹھ گئی جہاں سے دریا کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ دالان میں آراستہ گملوں میں گل لالہ بہار دکھا رہے تھے اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے مشام جاں کو معطر کر رہے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی' جہاں شادی کی پہلی رات گزر جانے کے بعد جہاں گیر اسے نیند سے بیدار کرنے آیا تھا اور جہاں آج سے سولہ سال پیشتر سورج کی نورانی کرنیں مرمریں جالیوں سے گزر کر ان کے چہروں پر بکھری تھیں۔

جب اس نے ماضی پر نگاہ دوڑائی تو اسے ان بہت سے مردوں کا خیال آیا' جن کی اس نے یا جنہوں نے اس کی مخالفت کی۔ تاہم خرم کے خلاف وہ اس وقت ہوئی' جب شہزادے نے اپنے بھائی کو زہر دے کر مروا دیا۔ آصف خاں کو وہ برابر اپنے احسان و کرم سے نوازتی رہی۔ حالانکہ اس نے جہانگیر سے غداری کی تھی اور مہابت خاں کے لئے اس نے آخر وقت تک کوشش کی کہ وہ جہاں گیر کا وفادار رہے۔ اس کے برعکس ان تمام کوششوں کا بدلہ اسے یہ ملا کہ اس وقت بھی امرائے دربار اس کے اختیارات سلب کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔

وہ جانتی تھی کہ انتظامی معاملات میں کوئی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا وہ بڑی حد تک مطمئن تھے اور انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ حکومت کون کر رہا ہے؟ شہنشاہ جہانگیر یا ملکہ نورجہاں! جب تک ان کے کھیت نہ روندے جائیں اور جب تک ان کے دیہات ضبط نہ ہوں' انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ اس پر غور کرتے۔ مسجد کے ملاؤں نے شروع شروع میں یہ شور بے شک مچایا تھا کہ ان پر ایک عورت کیوں مسلط کر دی گئی ہے لیکن اب کا جوش خود بخود ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اب سکوں پر اس کی شبیہہ کو بھی اعتراضات کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا' البتہ حریص امراء اس کے خلاف صف آراء تھے۔ کیا اسے چین نصیب نہ ہو گا؟ کیا وہ دکھ بھی دور نہ ہو گا جو اسے لاڈلی کے شوہر کو دیکھ کر ہوا تھا؟ کیا اس کی بیٹی ایک کوڑھی کے ساتھ زندگی بسر کرے گی؟

جہانگیر نے کہا تھا بادشاہی کو قرابت سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اس نے کسی کو بیٹی سمجھ کر اپنے سینے سے بھی تو نہیں لگایا حالانکہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ اس ہندو رقاصہ نے شو جی کی سوگند کھا کر کیا کہا تھا؟ ---- بھگوان کرے تیری بچی کے کوئی اولاد نہ ہو ---- کیونکہ یہ بیماری طاعون سے بھی خطرناک ہے ---- بھگوان کرے تو خالی ہاتھ رہے۔"

سچ ہے عورت کے دل کا دکھ عورت ہی جان سکتی ہے۔ ابتداء" اسے شاہانہ شان و شوکت میں یک گونہ اطمینان محسوس ہوا تھا' شاہی اختیارات پا کر وہ پھولی نہ سمائی تھی۔ حریفوں سے چٹکلے بازی میں اسے لطف محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ جیسے ٹوٹے ہوئے برتن سے سارا پانی بہہ جائے ---- اب اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی اور وہ یہ کہ لاڈلی ہر دکھ' ہر تکلیف سے محفوظ رہے ---- چند ہی برس پہلے

کی بات تو ہے کہ لاڈلی گڑیاں کھیلا کرتی تھی۔

اس نے مرمریں خواب گاہ کی دیوار سے سر ٹکا دیا اور اس رنج و غم کی کش مکش کا مقابلہ کرنے لگی جو کوشش کے باوجود اس پر محیط ہو رہا تھا۔ وہ رو نہ سکی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا' جیسے اس کا سارا جسم پتھر بن کر اس مرمریں خواب گاہ کی سلوں سے مشابہ ہو گیا ہے' جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اپنی بیٹی کے غم کے سوا اب اس میں کچھ نہ رہا تھا ---- ہر چیز مر چکی تھی ---- حتیٰ کہ وہ لڑکی بھی جسے لوگ مہرو کہتے تھے!

جب کنیزوں نے اسے اطلاع دی کہ آصف خاں خاص محل میں اس کا انتظار کر رہا ہے تو اس نے "گل آب" سے منہ ہاتھ دھویا۔ مشاطہ نے اس کے بال سنوارے اور اس کی خواہش کے مطابق اس کے سر پر ایک چھوٹا سا تاج بھی رکھ دیا۔

اس کے بھائی نے سلام کرنے کے بعد اس سے جنوبی ہند کی جاگیروں اور اس ولایتی کپڑے کے متعلق گفتگو کی' جو وہ اپنی تحویل میں لے چکی تھی۔ یہ اس کی باتیں توجہ سے سنے بغیر وہ ہوں ہاں کرتی رہی۔ دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ آصف خاں کی آمد کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ آصف خاں نے نور محل کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ وہ شاعر فراش کے ذریعے شہزادہ خرم کو شہریار کی بیماری کی خبر بھجوا چکا ہے اور اس کے پاس یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ کیا واقعی بیمار شہزادے کو لاہور جا کر رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

اس نے صرف اتنا کہا ---- "جہاں پناہ بہت جلد کشمیر جنت نظیر کو روانہ ہو جائیں گے۔ اگر تم چاہو تو میں بھی شرف ہمرکابی حاصل کر لوں!"

اس سال کشمیر میں موسم گرما دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ زعفران کے ارغوانی کھیت مرجھا کر دھانی ہو گئے۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ اردگرد کی پہاڑیوں کو برف نے ڈھانپ لیا اور جھیل ڈل کا پانی آسمان کے رنگ کی طرح گہرا نیلا ہو گیا۔

جہانگیر بارہ دری میں بیٹھ کر گھنٹوں مرغابیوں کا تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے رخسار پژمردہ ہو چکے تھے اور اب وہ افیون بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے تزک بھی لکھوانی چھوڑ دی وہ اس وقت تک بے حس و حرکت پڑا رہتا' جب تک نور محل اس کے پہلو میں نہ آ جاتی۔

شاہی طبیبوں نے جہانگیر کی اسی حالت کو دیکھ کر کہا تھا۔ "اگر نور محل اس کے شعلہ

حیات کو روشن نہ رکھتی' تو یقیناً وہ پرویز سے بھی پہلے مرگیا ہوتا۔"

وہ دیکھتے تھے کہ نور محل جب اس کے پاس سے جاتی' تو جہانگیر کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتیں۔

وادی کشمیر میں بیٹھ کر پوری سلطنت کو چلانا آسان کام نہ تھا تاہم جہانگیر کی تیمارداری کرنے کے علاوہ نور محل اس فرض سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہوتی رہی۔ وہ گھنٹوں وزرائے سلطنت کے ساتھ بیٹھ کر دارالحکومت سے آنے والی خبریں غور سے سنتی اور احکام صادر کرتی تھی۔ اب اسے جہانگیر سے بھی مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی گو شہنشاہ کا نام اب بھی تمام فرامین میں استعمال کیا جاتا تھا۔

جب سردی ذرا چمکی تو طبیبوں نے جہانگیر کو واپسی کا مشورہ دیا۔ اسے ایک پالکی میں بٹھا کر گھوڑے پر سوار کر دیا گیا' جسے پیادہ رفتار سے چلایا جا رہا تھا۔ قافلہ پیر پنجال کے درے سے گزرتا ہوا آہستہ آہستہ اس وادی میں اتر آیا جس میں ہر طرف دیودار کے درخت تھے۔ یہاں جہانگیر کو قدرے افاقہ محسوس ہوا۔ طبیبوں نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اطمینان ظاہر کیا اور نور محل کو یقین دلایا کہ آگرہ پہنچ کر شہنشاہ "جھروکے" میں "درشن" دے سکیں گے۔

وادی میں پہنچ کر جہانگیر نے شکار کا ارادہ کیا۔ وہ زین پر نہ بیٹھ سکتا تھا اس لئے شکاریوں کو "ہانکے" کے لئے قرب و جوار کی پہاڑیوں میں بھیجا گیا اور جہانگیر بندوق لے کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ جوں ہی ہرن دکھائی دیئے' اس نے بندوق داغ دی۔ اچانک چیخوں کی آواز سنائی دی۔ جہانگیر نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ ایک غلام چٹان سے کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح لڑھک کر اس کے سامنے آگرا ہے۔ مغل شہنشاہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے حکم دیا کہ مابدولت کو شاہی خیمے میں پہنچا دیا جائے۔ وہ اپنی مسہری پر لیٹا بمشکل سانس لے رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں پر رعشہ طاری تھا۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ افیون اور شراب نے اس کے اعصابی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔

"اللہ اکبر ـــــ اللہ اکبر ـــــ ہمیں شراب دو!"

اس نے حکم دیا کہ پڑاؤ اٹھا لیا جائے۔ نور محل نے اسے پالکی میں بٹھایا اور اسے لے کر لشکر کے آگے آگے بہ عجلت روانہ ہوئی۔ دو روز کے بعد وہ بھمبر کی منزل گاہ میں پہنچے جہاں میدان کی لمبی گھاس نرم و نازک بلوط کے درختوں سے گلے ملتی ہے۔ نور محل نے

سامنے کے دھندلکوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا :۔

"شیخو بابا ۔۔۔۔ اب راستہ صاف ہے۔"

"ہاں صاف ہے" اس نے سرہلایا۔

لیکن اس میں آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس دن پچھلے پہر لشکر کا اگلا سرا نمودار ہوا اور دیکھتے دیکھتے خیمہ گاہ شاہی کے اردگرد بے شمار خیمے لگ گئے۔ ہاتھیوں کو قطار در قطار بٹھا دیا گیا اور امراء وزراء ذرا فاصلے پر مقیم ہو گئے تاکہ بیمار شہنشاہ گردوغبار سے محفوظ رہے۔ مغرب کی نماز کے بعد الاؤ روشن کر دیا گیا اور نور محل بادشاہ کے پہلو میں بیٹھ کر اس کی تیمارداری کرنے لگی۔

بادشاہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ بڑی مشکل سے منہ کھول کر سانس لیتا تھا۔ دو دن سے اس نے کھانا نہ کھایا تھا اور اب اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے نور محل کی طرف دیکھا اور اس کے ریشمی دوپٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"مہرو! میں نے تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کی۔ تم سے انصاف کیا۔" وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر واضح لفظوں میں بولا۔ "کیا تم بھی خوش رہیں؟"

"میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی زندگی سمجھا ہے۔" نور محل نے سادگی سے جواب دیا لیکن وہ انصاف' کا لفظ سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ کیا جہانگیر نے جو بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا ہے' اسے محض ان زخموں کے اندمال کے لئے ملکہ بنایا تھا جو اس نے ابتدا میں پہنچائے تھے؟ اس کا جسم ایک شدید کرب میں مبتلا تھا اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں نور محل کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس حالت میں بھی وہ ایک ایسا شخص نظر آتا تھا جس کے اندر اپنے آباؤ اجداد کی تمام جراتیں سمٹ آئی ہوں اور اس لمحے نور محل نے ایسا محسوس کیا گویا وہ ابھی تک اجنبی ہے۔ ایک ایسی جذباتی لڑکی' جسے وہ کھلونے دے دے کر بہلاتا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ پنجروں میں بند جانوروں اور پرندوں سے کھیل کھیل کر خوش ہوتا تھا۔

یہ واقعہ آپ ہی آپ تحلیل ہو گیا۔ جہانگیر کے پژمردہ ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی' جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ نور محل نے اندازہ کر لیا کہ وہ شراب طلب کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بلور میں جام بھر کر احتیاط کے ساتھ اس کے لبوں سے لگایا لیکن وہ سر نہ اٹھا سکا۔ اس کی سانس جیسے اکھڑ گئی ہو۔ شراب گر کر چادر پر بہنے لگی۔ نور محل جانتی تھی کہ اس

کے عقب میں ایک سرسراہٹ سی ہو رہی ہے۔ جہاں خدام اور اطباء شمع دان کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ خیمے کے دروازوں پر خواجہ سراؤں کا ہجوم تھا۔ وہ مغل بادشاہ کے آخری لمحات دیکھ رہے تھے۔ پردہ دار خواتین کمرے میں آتیں اور چلی جاتیں۔ نور محل نے بادشاہ کا ہاتھ تھپتھپا کر یہ مصرع گنگنایا۔

قفس سے جب نکلتی ہیں شب تاریک میں روحیں (۱۲)

خیمے کے باہر ملا' عمامے باندھے بادشاہ کی صحت و سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ تمام خیموں میں خاموشی طاری تھی اور ہر شخص آنے والے وقت کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا ..... نور محل' نزع کے وقت بھی اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی رہی۔ علی الصباح جب شاہی طبیب شہنشاہ کی کلائی اور گلے کی نبض دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا' تو نور محل نے خموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"حکم الٰہی پورا ہوا!" طبیب نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون!" دبی آواز میں نور محل کے منہ سے نکلا۔

بادشاہ کے پپوٹے بند کر دیئے گئے لیکن وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ خواجہ سرا تیزی سے باہر نکل گئے۔ کنیزیں بین کرنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے شاہی پڑاؤ ایک ماتم کدہ بن گیا۔ شہنشاہ کی موت کی خبر ہر طرف پھیل گئی اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے! "اب کیا ہو گا؟"

ایک طبیب آصف خاں کے خیمے میں داخل ہوا اور اسے اس الم ناک سانحے سے آگاہ کیا۔ داروغہ توشہ خانہ فوراً اٹھ کر اصطبل میں گیا جہاں ایک ہرکارہ گھوڑے کی زین سے ٹیک لگائے گلوری چبا رہا تھا۔ آصف خاں نے انگلی سے اپنی مہروالی انگوٹھی اتاری۔

"فوراً روانہ ہو جاؤ' کوتاہی مت کرنا' جہاں پناہ وفات پا گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

ہرکارے نے سلام کرنے کے بعد جیسے ہی باگیں سنبھالیں آصف خاں نے کہا:۔

"شہزادہ خرم سے کہنا: بیوہ' بیوی ہی رہے گی۔ میں آپ کا خادم ہوں' میری وفاداری آپ کے لئے چشم براہ ہے۔"

ہرکارے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس سڑک پر بگٹٹ روانہ ہو گیا جو اسے بیس دن کی مسافت کے بعد دور جنوب میں جلاوطن شہزادے تک پہنچا سکتی تھی۔

ہرکارے کو رخصت کرنے کے بعد آصف خاں نے دوسرے احکام جاری کئے۔

طلوع آفتاب کے بعد چار نقاب پوش جہانگیر کی میت کے پاس پہنچے' نور محل ان غسالوں کو دیکھتے ہی وہاں سے نکل کر اپنے خیمے میں چلی آئی۔ جہاں عنبر خدام اور کنیزوں سمیت اس کا منتظر تھا۔ جہاں گیر کی موت کے بعد زندگی کی وہ حرارت بھی ختم ہو چکی تھی' جس نے گزشتہ سولہ برس سے نور محل کی حوصلہ مندیوں کو سہارا دے رکھا تھا' اب وہ بیوہ ہو چکی تھی ---- ایک ایسی عورت' جس کا کوئی سرپرست نہ تھا لیکن جو کچھ عرصہ پہلے تک سلطنت کا تمام کاروبار چلاتی رہی تھی۔ اس نے کنیزوں اور خواصوں کو نوحہ و ماتم سے منع کیا اور آصف خاں کو بلوا بھیجا۔

صبح گزر گئی لیکن آصف خاں نہ آیا۔ اس کے برعکس احدیوں کے ایک دستے نے آکر اس کے پہرے داروں سے بحث و تکرار شروع کر دی۔ عنبر نے بتایا احدیوں کو حکم ملا ہے کہ علیا حضرت کے افغان پہرے داروں کی جگہ لے لیں۔ لیکن پہرے دار اس پر آمادہ نہیں لہٰذا دونوں نے تلواریں سونت لی ہیں۔ نور محل نقاب ڈال کر دروازے پر گئی اور حکم دیا کہ تلواریں میان میں کر لی جائیں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بادشاہ بیگم! یہ آپ کے ملازم نہیں۔" ایک پٹھان بولا۔ "کیا ہم گدھے ہیں کہ جو چاہے ہمیں ہانک لے جائے۔"

احدیوں کا یہ دستہ تعداد میں افغان پہرے داروں سے زیادہ تھا اور اس نے شاہی خیمے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

"تمہیں اس طرح جہاں پناہ کے ماتمی خیمے کے پاس آنے کا حکم کس نے دیا ہے۔" نور محل نے چلا کر پوچھا۔

"علیا حضرت! ہم امیر آصف خاں کے حکم پر یہاں آئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ "ہمیں آپ کی حفاظت مقصود ہے!"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں! تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ!" لیکن افسر بدستور کھڑا رہا۔

"ہمیں حکم مل چکا ہے ---- ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

افغان پہرے دار یہ کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی مالکہ کا حکم ٹالا جائے؟ وہ اس کے وقار کے تحفظ کے لئے جانیں تک لڑانے کو تیار تھے اور بھیڑیوں کی طرح غرا رہے تھے۔ لیکن نور محل نے عنبر کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ اپنے خیموں میں واپس چلے

جائیں اور اپنی جگہ احدیوں کو کھڑا رہنے دیں۔

"وہ میرے بھائی کی خواہش تھی" اس نے کہا "اور اب میں حکم دیتی ہوں کہ تم سب یہاں سے چلے جاؤ!"

جب سارے پہرے دار چلے گئے اور احدیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ تو نور محل بھی اندر جا کر مسہری پر لیٹ گئی۔ اتنے میں ایک خواجہ سرا اس کے پاس آیا اور شکایت کی!

"میں باہر جا رہا تھا۔ لیکن احدی پہرے داروں نے مجھے روک دیا' وہ کہتے ہیں کہ داروغہ توشہ خانہ کے حکم کے بغیر کسی کو آنے جانے کی اجازت نہیں!"

"تو کیا مجھے اتنی جلدی قیدی بنا لیا گیا ہے؟ اس کی سیاہ آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے اور اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ پھر عنبر کو بلا کر جلدی سے لاڈلی اور شہریار کے نام ایک پیغام لکھا کہ وہ جتنے بھی حمایتی ہو سکیں اکٹھے کر کے شہر کے خزانے پر قبضہ کر لیں اور اپنی حفاظت کے انتظامات بھی نظر انداز نہ کریں۔

"یہ رقعہ جس طرح بھی ہو احدیوں کی نظروں سے بچا کر شہزادہ شہریار کو پہنچاؤ۔" اس نے عنبر سے کہا۔ "اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر مجھے قید کر لیا گیا تو شہزادہ اور اس کی بیوی کی زندگی بھی خطرے سے خالی نہیں۔"

بوڑھے خواجہ سرا نے سربمہر رقعہ پیشانی سے لگایا۔

"اپنی جان کی قسم! فدوی یہ ذمہ داری پوری کرے گا۔ ملکہ عالیہ! لیکن یقیناً ----- بے شک اور بھی بہت سے جاں نثار حضور کے ساتھ ہیں۔

بوڑھے خواجہ سرا نے محافظوں کی نگاہیں بچا کر رقعہ ایک قابل اعتماد ہرکارے کے ذریعے لاہور بھجوا دیا اور واپسی میں لشکر کی اندرونی خبریں لے کر شام کو نور محل کے پاس پہنچ گیا' جس نے سارا دن بے چینی سے گزارا تھا۔

آصف خاں نے اپنا منصوبہ پہلے سے تیار کر لیا ہو گا کیونکہ ادھر جہانگیر کی آنکھیں بند ہوئیں ادھر اس نے کارروائی شروع کر دی۔ فراش اور دوسرے گماشتوں نے ایک ایک امیر کے دروازے پر جا کر دستک دی اور انہیں سمجھایا کہ خانہ جنگی سے بچنے کے لئے تخت کے جانشین کا فوری انتخاب ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر یہ انتخاب امرائے دربار کی تائید سے ہوا' تو نیا بادشاہ ان امراء کو عزت و سربلندی عطا کرے گا اور فوج ہمارے ساتھ ہے ہی' جو شمالی ہند کی کلید ہے۔ اس کے بعد آصف خاں نے مجلس مشاورت بلائی' جس نے اس کی

منشاء کے مطابق خسرو کے بیٹے : شہزادہ داوربخت کو جانشینی کے لئے نامزد کر دیا شہزادہ داوربخت ارادے کا کمزور ہونے کے علاوہ معمولی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ مکمل شاہی رسوم ادا کرنے کے بعد اسے تخت پر بٹھا دیا گیا اور عمائد سلطنت نے اس کے حضور حلف وفاداری اٹھا کر اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

جب نور محل کو اس کی خبر پہنچی تو وہ بے حد پریشان ہوئی۔ امرا سے اس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا اس لئے وہ اس فیصلے کے خلاف آواز بھی بلند نہ کر سکی۔ امرائے فوج نے بھی آصف خاں کے حکم کی تعمیل کی اور داوربخت عارضی طور پر بادشاہ بن گیا۔

"لیکن کیوں؟" نور محل نے سوچا۔ "آخر اس کی ضرورت کیا تھی۔"

"جب تک شہریار نہ پہنچے تاج و تخت کسی کے پاس تو ہونا ہی چاہئے" خواجہ سرا نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

"لیکن نور محل مطمئن نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ لشکر کی افواہیں اس تک پہنچیں' اس نے آصف خاں کے دل میں جھانک لیا تھا۔ آصف خاں نے عمائد سلطنت سے ایک سودا کیا تھا۔ جس کے مطابق امرائے دربار کو شہزادہ خرم اور مہابت خاں کی جنوبی ہند سے واپسی تک' ایک عارضی بادشاہ کا انتخاب کرنا تھا۔ عمائد سلطنت کی اکثریت ان تینوں۔ آصف خاں' شہزادہ خرم اور مہابت خاں ---- کی حامی تھی۔ فوج نے بھی ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا اور قرار پایا کہ وہ شاہی خزانے کی مدد سے لاہور' دہلی اور آگرہ پر قابض رہیں گے۔ راجپوت راجہ قدرتی طور پر شہزادہ خرم اور مہابت خاں کا ساتھ دیں گے۔ باقی رہا خان جہاں لودھی جو ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ان کی متحدہ قوت کا مقابلہ کیا کر سکے گا؟ اس دوران میں نور محل کو بے دست و پا کر کے قید تنہائی میں رکھا جائے اور شہریار کو گرفتار کر لیا جائے۔

آصف خاں کے اس منصوبے پر غور کرنے کے بعد نور محل اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ بظاہر شہنشاہ کی دوستی کا دم بھرتا تھا ورنہ اندر سے وہ جہانگیر اور نور محل کے اقتدار کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے درپے تھا۔

"مجھے پہلے ہی بہت کچھ معلوم تھا۔" اس نے سوچا "لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا بھائی مجھے خرم پر بھی قربان کر دے گا۔ مگر اب لاڈلی کا کیا ہو گا؟"

لشکر دو دن تک جنوب کی جانب تیزی سے بڑھتا رہا۔ نور محل اب قیدی تھی اور

جہانگیر کی میت کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی۔ جب وہ میدانوں میں پہنچے تو اس نے اصرار کیا کہ جنازہ کی نماز پڑھ لی جائے اور نعش کو تابوت میں رکھا جائے لیکن اس کے خیمے میں کوئی بھی نہ آیا۔

آصف خاں نے اپنی بہن کا اقتدار ختم کرنے کے لئے جو منصوبہ تیار کیا تھا' اس کو وہ بڑی خوش اسلوبی سے جامہ عمل پہنا رہا تھا۔ اگر نور محل کو امرائے دربار سے بات چیت کا موقع مل جاتا' تو وہ باآسانی لشکر میں پھوٹ ڈال کر شہریار کے کچھ حامی پیدا کر سکتی تھی۔ اس کی نظربندی کے بعد' وہ اپنی قسمت کو آصف خاں سے وابستہ سمجھتے تھے' جس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ خرم ان کی سرپرستی کرے گا۔ وہ نور محل کے غصے سے بے حد ڈرتے تھے۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ شہریار کی فوج کے سوا اس کی حمایت کوئی نہیں کرے گا۔ جہاں تک خرم کا تعلق تھا اس سے نور محل کی مصالحت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

جب قافلہ منزل پر منزل مارتا لاہور کے قریب پہنچا تو شاہی دستوں کی قیادت آصف خاں نے سنبھال لی اور اصل قافلے سے ایک پڑاؤ کی مسافت پر آگے آگے چلنے لگا۔ نور محل کو اول تو اب کوئی خبر ہی نہ ملتی تھی اور ملتی بھی' تو وہ حوصلہ افزا نہ ہوتی تھی۔ شہریار نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی اور شہر کا بیش تر خزانہ امرائے دربار میں بانٹ دیا' جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی اس نے کچھ نئی فوج بھی فراہم کر لی۔ لیکن چونکہ وہ خود قیادت سنبھالنے کا اہل نہ تھا اس لئے اس کی کمان اس نے اپنے چچا زاد بھائی کے سپرد کر دی۔

دونوں فوجیں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ لیکن شہریار کو اس کی ہچکچاہٹ نے لاہور سے زیادہ دور نہ جانے دیا۔

نور محل کو لڑائی کا نتیجہ اسی وقت معلوم ہو گیا جب لشکر نے فاتحانہ نعرے بلند کئے۔ اس کے خیمے کے پاس ہی بڑے بڑے نقارے اور ڈھول پیٹے جا رہے تھے اور "مبارک سلامت" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہریار کو شکست ہو گئی تھی ---- یہ شکست کتنی عبرتناک تھی؟ اس کا علم نور محل کو اس وقت ہوا جب قافلے کے لاہور میں داخل ہوتے ہی اسے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ شہزادے کے حامیوں کی صفیں جنگ آزما اسپ سواروں کے پہلے ہی حملے میں الٹ گئی تھیں اور ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ شہریار بھاگ کر قلعے میں جا چھپا۔ جب امرائے دربار نے اپنے قائد کی یہ حالت دیکھی تو فوراً آصف خاں سے صلح کر

لی۔ غداروں نے اسی رات شہر کے دروازے کھول دیئے اور آصف خاں کی فوجیں فتح کے نقارے بجاتی لاہور میں داخل ہو گئیں۔ قلعے کی مدافعت کے لئے بھی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ شہریار حرم سرا میں گھس گیا۔ جہاں سے خواجہ سراؤں نے گھسیٹ کر اسے قید خانے پہنچا دیا۔

"کاش وہ مرد ہوتا۔" نور محل نے تلخ لہجے میں کہا۔

"بس خان جہان باقی ہے۔" عنبر نے اسے یاد دلایا۔ "جو علیا حضرت کے احکام کا منتظر ہے۔"

نور محل نے سروقد کھڑے ہو کر خاموش نگاہوں سے بوڑھے حبشی کی طرف دیکھا جو سالہا سال اس کا وفادار خادم رہا تھا۔ وہ ہاتھ باندھے بڑے ادب سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ ملکہ کے منہ سے اب بھی ایک فیصلہ کن بات نکلے گی جس سے ساری گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔ نور محل کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی تصویریں ایک ایک کر کے گزر رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ خرم کا مقابلہ کئی سال سے جاری ہے۔ اس کے خلاف دو فوجیں روانہ کی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد اسے جہلم کی لڑائی کا خیال آیا۔ جب اس نے جہاں گیر کو مہابت خاں کے ہاتھ سے رہا کرانے کی کوشش کی تھی ---- مانا کہ خان جہاں لودھی نے دکن کے راجاؤں کو رام کر لیا تھا اور خرم کو وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ مگر اب لاڈلی اور شہریار قیدی تھے۔ انہیں رہائی اسی صورت میں مل سکتی تھی کہ ایک خون ریز معرکہ ہو لیکن اگر مغل شہزادے آپس ہی میں لڑتے رہے تو ملک کا کیا بنے گا؟..... نہیں نہیں' اب اسے قتل و خوں ریزی سے دامن بچانا چاہئے۔

آخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی اور اس نے عنبر کی توقع کے خلاف کہا:

"نہیں نہیں' اب بات ختم ہو گئی ---- میں اب احکام صادر نہیں کروں گی۔"

خواجہ سرا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نور محل نے اسے ہدایت کی کہ وہ ہشیار اور ناظم کو لے کر کہیں چلا جائے۔ اب اسے خدام کی ضرورت نہیں۔ دشمنوں کو چونکہ شبہ ہے کہ نور محل کے خدام بھی اس کی مدد کرتے رہے ہیں اس لئے ممکن ہے ان سے بھی انتقام لیا جائے۔ بوڑھے عنبر نے التجا آمیز لہجے میں کہا:۔

"میں علیا حضرت کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ میرا سر حضور کے سایہ عاطفت میں سفید ہوا ہے۔" میں حضور کو دوسرے خدام پر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ جو شور مچا مچا کے

علیا حضرت کو ناحق پریشان کریں گے۔"

"اچھا تو پھر۔" اس نے مسکرا کر کہا "میرا حکم یہ ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

عنبر اور دوسرے خدام کی روانگی کے کئی ہفتے بعد نور محل سے آخری اپیل کی گئی۔ خرم نے راستے ہی سے آصف خان کو فرمان بھیجا کہ وہ خسرو کے بیٹے داور بخت، شہریار اور اکبر کے دوسرے پوتوں کا قصہ پاک کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے مسجدوں میں بلند آواز خرم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد آصف خاں نے خرم کا راستہ صاف کرنے کے لئے حکم دیا کہ اس کے اپنے بیٹوں کے سوا شہنشاہ اکبر کے تمام پوتوں کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔

اسی رات ایک امیر "حرم" کے پہرے داروں کی نظر بچا کر نور محل کی کنیزوں کے پاس پہنچا اور کنیزوں نے اسے اطلاع دی کہ فدائی خاں دروازے پر کھڑا حضور کے احکام کا منتظر ہے۔

اسی روز، شہزادوں کے قتل کے بعد نور محل کا ایلچی خبر لایا تھا کہ بہت سے آدمی اس کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ لیکن کنیزوں نے دروازے پر واپس آکر فدائی خاں سے کہا: علیا حضرت نے کہلا بھیجا ہے کہ یہاں صف ماتم بچھی ہے اس کے علاوہ وہ فیصلہ فرما چکی ہیں کہ اب وہ پردے سے باہر آکر مردوں سے خطاب نہیں کریں گی!"

دوسرے دن خرم ---- جس نے اب "شاہجہان" کا لقب اختیار کر لیا تھا ---- شاہی ہاتھی پر فاتحانہ شان سے آگرہ میں داخل ہوا۔ جب وہ قلعہ میں پہنچا تو خدام نے سونے اور چاندی کے سکے نچھاور کئے اور شاہجہاں سنگ موشی کے اس تخت پر جلوہ افروز ہو گیا، جس پر خون کا سرخ دھبہ ابھی تک موجود تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔ شاہجہان نے انتہائی شان و شوکت سے حکومت کی۔ وہ بچپن ہی سے شاہانہ عظمت کا طلب گار تھا۔ اس کا دور حکومت بھی اسی کا آئینہ دار رہا۔ ارجمند بانو بیگم سے اس کی شادی ہو چکی تھی جسے وہ دنیا کی عزیز ترین متاع خیال کرتا تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی آصف خاں کو گراں قدر انعامات سے نوازا۔ اسے نہ صرف اٹھارہ ہزاری کا منصب بلکہ "یمین الدولہ" کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ اسی طرح کہن سال مہابت خاں کو سپہ سالار بنایا گیا اور اس کا خطاب "خان خاناں" قرار پایا۔

تخت نشینی کے بعد شاہجہاں نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے نور محل کی یاد کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اور وہ سکے واپس لے لئے گئے جن پر جہانگیر کے ساتھ اس کی شبیہہ بھی کندہ تھی البتہ لاہور کے قریب شاہدرہ باغ میں جہانگیر کا مقبرہ بنوانے کے لئے اسے ایک علیحدہ رقم دی گئی شاہجہاں نے اس بات کا بھی بطور خاص اہتمام کیا کہ اس زمانہ کے وقائع نویس نور محل کی بے جا ستائش نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ نور محل نے اس کے باپ جہانگیر کو اپنے حسن سے مسحور کر رکھا تھا۔ وہ بے حد جاہ پسند تھی اور آخر دم تک اس پر حاوی رہی۔ دراصل شاہجہان کو وہم تھا کہ نور محل ہی نے جہانگیر کو اس کے خلاف کیا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ سلطنت کے جری اور باوقار امیر مہابت خاں کی تباہی میں بھی نور محل کا ہاتھ ہے۔ اس کے پہلے خاوند کو ---- کم سے کم وقائع نگاروں کا بیان یہی ہے ---- جب موت سر پر منڈلاتی نظر آئی تو اس نے نور محل کو قتل کر دینا چاہا تاکہ اس کے حسن جہاں سوز کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ اس نے شہزادہ خرم کو بھی اپنے دام حسن میں اس وقت گرفتار کرنا چاہا جب وہ سن بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا۔ اسی پر بس نہیں۔ شاہجہاں کے نزدیک وہ شہزادہ شہریار کے ذریعے پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن مملکت کے اس وفادار امیر ---- آصف خاں ---- نے اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ ابتداء میں کچھ دن یہ افواہ بھی گردش کرتی رہی کہ ملکہ عالیہ کو شہنشاہ کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ افواہ بے بنیاد ثابت ہوئی!

وہ جہانگیر کی موت کے بعد تقریباً اٹھارہ برس تک بڑی خاموشی سے زندگی کے دن بسر کرتی رہی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی لاڈلی بھی رہتی تھی۔ دونوں نازک اندام عورتیں اپنے شاہانہ وقار کے لئے مشہور تھیں وہ کبھی کبھی نقاب ڈال کر سرو و شمشاد کے اس باغ میں ٹہلتی نظر آتیں جس میں جہانگیر کا مقبرہ مکمل ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس کے جسم اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ چنانچہ اس کے مزار کی چھت پر کوئی گنبد تعمیر نہیں کیا گیا۔ پورہ مقبرہ سنگ سرخ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ وہ درختوں کے جھنڈوں سے گزر کر مقبرے کے دروازے پر پہنچتیں اور وہاں محتاجوں کو خیرات تقسیم کرتیں لیکن اس حالت میں بھی انہوں نے اپنے بوجھل ماتمی نقاب کبھی نہ اتارے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کبھی پرتھوی کی بددعا بھی یاد آئی۔ جس نے کہا تھا کہ

بھگوان کرے آخری عمر میں تمہارے ہاتھ خالی رہیں اور کوئی مرد تمہارے نزدیک بھی نہ پھٹکے۔ جہانگیر کی وفات کے بعد اس نے اپنے افکار و خیالات کی کوئی یادداشت نہیں چھوڑی۔

وہ اس مختلف قوموں کی سرزمین میں ایک سایہ بن کر رہ گئی جہاں مغلوں کا اقتدار اپنی ظاہری شان و شوکت کے باوجود متزلزل ہو رہا تھا اور ایک صدی کے اندر اندر افسانہ پارینہ بن کر رہ جانے والا تھا۔ جب انگریز سات سمندر پار سے آئے گا اور دودمان تیموریہ کے آخری چشم و چراغ کا تخت و تاج چھین لے گا۔

نور محل کی کہانی

ماہ و سال کی گردشوں کے ساتھ ساتھ وقت کے قلم نے اس ایرانی خاتون کے نام کے گرد، جس نے پورے ہندوستان کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، بہت سے افسانے تصنیف کر دیئے اور یہ تھا بھی ناگزیر! وہ حرم کی گمناميوں سے ابھری اور ایک بار پھر انہی تنہائیوں میں تحلیل ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے: اس کی زندگی کے آخری چند برس میں، بہت کم ملنے جلنے والے اس کی ملاقات کو جاتے تھے اور یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ کسی وقائع نگار نے اس کی داستان حیات خود اس کے نقطہ نظر سے نہیں لکھی۔

عہد شاہجہانی کے وقائع نویس، قدرتی طور پر، اس کے مخالف تھے اور متاخرین بھی انہی کے نقش قدم پر چلے۔ ایک ایسی خاتون، جس نے شہنشاہ ---- جہانگیر---- سے حکومت کی باگ ڈور لے کر سنبھال لی تھی، مغلوں کے مسلمان حاشیہ برداروں سے، اپنے حق میں کسی نرم برتاؤ کی توقع نہ رکھ سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے شاندار کارناموں اور اس کی ذاتی دل کشی سے انکار نہیں کیا جا سکا، یہاں تک کہ ایک جذبات سے عاری، ولندیزی تاجر، جو اس وقت ہندوستان میں تھا، اعتراف کرتا ہے کہ مہابت خاں کی بغاوت تک وہ ایک دیوی کی طرح پوجی جاتی تھی، غرض نور محل کے متعلق جو افسانے ڈھلنے اور ترشنے شروع ہوئے، وہ کچھ تو اس لئے تھے کہ اس کی اپنی زندگی بڑی شگفت انگیز رہی۔ کچھ اس لئے کہ جہاں گیر اور شاہ جہاں کی بلند کرداری کے قصیدے الاپنے تھے اور کچھ اس لئے کہ اس کی مقناطیسی شخصیت کی شرح و تفسیر مقصود تھی۔

اس لوک کہانی میں نور محل ایک ایسی ایرانی کنیز کے روپ میں نظر آتی ہے، جسے فطرت نے غیر معمولی حسن اور ناقابل تسخیر حوصلہ مندی سے نوازا تھا، اس کے حالات بھی اچھے خاصے ڈرامائی بنا دیئے گئے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ ایک سفر کے دوران میں، رنج و

افلاس اور غربت و بدبختی کے تھپیڑے کھائی ہوئی' اس دنیا میں آنکھ کھولتی ہے بلکہ اس کے ماں باپ اسے سڑک کے کنارے ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور ایک اژدہا اس کی حفاظت و نگرانی کرتا رہتا ہے۔ تاآں کہ قافلہ سالار کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے۔ وہ ترس کھا کے اسے اٹھا لیتا ہے اور قافلے میں کسی ایسی عورت کو تلاش کرنے لگتا ہے جو اس معصوم بچی اور موت و ہلاکت کے تیروں کے درمیان سپر بن جائے اور یہ خدمت' فطری طور پر' نورمحل کی ماں قبول کر لیتی ہے۔

اس کے بعد اس کی شادی شیرافگن سے ہوئی یا یہ افسانہ بیان کرتا ہے' کہ جہانگیر' جسے نورمحل کی محبت نے اندھا کر دیا تھا' برسوں اس کے تعاقب میں رہا۔ مغل شہنشاہ نے اس تیغ آزما ---- نورمحل کے شوہر ---- پر پہلے تو شیر چھڑوا دیا ---- اس واقعہ کی بازگشت نے اسے شیرافگن کا نیا نام دیا ---- اور اس کے بعد مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اس افسانوی معرکے میں شیرافگن نے بڑے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے اور اپنے تمام دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر فیصلہ کیا کہ گھر واپس جا کر اپنی حسین و خوب رو لیکن ہلاکت آفریں بیوی کے جسم میں تلوار پیوست کر دے۔

آگے چل کر یہ افسانہ بتاتا ہے کہ شیرافگن کا کانٹا نکالنے کے بعد جہانگیر نے نورمحل کو دربار میں طلب کیا لیکن اس مغرور ایرانی خاتون نے ازراہ غضب اسے ٹھکرا دیا' اور مغل شہنشاہ کو شیرافگن کے قتل پر ملامت کرتے ہوئے اس کے حرم میں داخل ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم جہانگیر' بعض نامعلوم تدبیروں سے' اس کی ضد توڑنے میں کامیاب ہو گیا اور نورمحل ایک شمع حیات افروز بن کر اس کے شبستان عشرت میں جگمگانے لگی'

یہ ایک رومانی افسانہ اور جذباتی کہانی ہے' جو ایک ناول کا مواد بن سکتی ہے اور سچ یہ ہے کہ جتنی تاریخیں اب تک لکھی گئی ہیں' ان میں اسی کہانی کو مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اوائل کی فارسی تاریخوں سے کم و بیش یہ پوری کہانی انگریز مورخین : ڈواور انفنسٹن نے اپنے صفحات میں نقل کی اور ان معیاری تصانیف کے ذریعے یہ ہر اس مقالے یا افسانے کا سرمایہ بن گئی جو نورمحل پر لکھا گیا' چنانچہ جس زمانے میں' میں یہ کتاب لکھ رہا تھا۔ ہندوستان کے کسی اخبار میں چھپا ہوا' دو صفحے کا مضمون مجھے بھیجا گیا جو انہی تمام افسانوی واقعات پر مشتمل تھا۔

دور حاضر کے اہل تحقیق اس کہانی کو تسلیم نہیں کرتے' غیاث بیگ کی دختر' کنیز ہونے کی بجائے ایک شریف گھرانے کی چشم و چراغ اور نہایت ذہین خاتون تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ کسی قافلے کے دوران سفر میں' اس کے ماں باپ نے اس کی پیدائش کے وقت کارواں سالار : ملک مسعود کو غربت و افلاس کے مارے ہوئے اس ایرانی خاندان سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور جب یہ لوگ فتح پور پہنچے' تو اس نے غیاث بیگ کو ازخود مغل اعظم : شہنشاہ اکبر کے حضور میں پیش کیا۔ زیرک ایرانی کو شاہی دربار میں کوئی منصب عطا کر دیا گیا اور وہ روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ تاآں کہ جب شہنشاہ جہاں گیر نے اس کی بیٹی سے شادی کی' تو یہ اس کے لئے بڑی نیک فال ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ صحیح ہے کہ غیاث بیگ اور اس کے بیٹے : آصف خاں کے آفتاب اقبال کی تاب ناکیاں' تقریباً شروع ہی سے نور محل کے دم قدم سے تھیں۔

یہ بات بالکل یقینی ہے کہ جہاں گیر نے شیر افگن کے قتل کا کوئی منصوبہ تیار نہ کیا تھا جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یہ کہانی پہلی بار' دو پشتیں گزرنے کے بعد' سننے میں آئی' ہم عصر مورخین اس کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کرتے اور وہ یورپی سیاح بھی ---- ان میں دو انگریز : ہاکنز اور سرٹامس رو شامل ہیں ---- جنہیں مغلیہ دربار کی سازشوں کو بالتفصیل بیان کرنے میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے' اس نقطہ پر بالکل خاموش نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر جہاں گیر نے فی الواقع شیر افگن کے قتل کا کوئی منصوبہ تیار کیا ہوتا' تو وہ اپنی تزک میں ان واقعات پر کبھی روشنی نہ ڈالتا' جو شیر افگن کی موت کا سبب ہوتے' اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد اس نے اپنی تزک میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بجائے خود اپنی تفسیر ہے۔

جہاں گیر بیان کرتا ہے کہ جب شیر افگن کو قطب الدین کی آمد کا حال معلوم ہوا' جو شیر افگن کا جرم ثابت ہونے پر اسے بغاوت کی سزا دینے کے لئے بھیجا گیا تھا' تو وہ صوبیدار سے ملنے گیا' قطب الدین کے خیمے میں داخل ہونے پر اس نے اپنے تئیں مسلح سپاہیوں کے گھیرے میں پایا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا : "یہ کیا ہو رہا ہے؟" قطب الدین نے اپنے آدمیوں کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود تنہا آگے بڑھا۔ شیر افگن نے پے در پے اس کے پیٹ پر تلوار کے دو یا تین وار کئے اور اس سے پہلے کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا' اس شخص کو بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا' جو حملہ کرنے اس کی طرف دوڑا تھا۔ (۱۳)

دو واقعات اس کتاب میں ایسے ہیں' جو کہانی معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ پہلا فتح پور کی حرم سرا میں مہرو اور جہاں گیر کی ملاقات کا واقعہ ہے۔ تاہم ایک وقائع نگار: خافی خاں نے اسے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے' اس نے اس واقعہ کے ایک صدی بعد یہ داستان لکھی اور جس مواد پر اعتبار کر کے لکھی' وہ اب ناپید ہے۔ (۱۴) خافی خان لکھتا ہے :۔

"..... شہنشاہ جہاں گیر اسے ---- نور محل کو ---- چاہتا تھا۔ اس کی محبت روز بہ روز اس کے دل میں بالیدہ ہوتی رہی۔ تاآں کہ وہ ایک دن اسے محل کے کسی گوشہ میں تنہا مل گئی۔ جہاں گیر نے ہنسی ہنسی میں اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ نور محل اس کی آغوش سے تڑپ کر نکلی اور حرم کی بیگمات سے شکایت کی۔" (۱۵)

یہ بیان عام افسانوی انداز سے مختلف ہے اور بہت ممکن ہے کہ جہاں گیر نے' (۱۶) جو اس وقت نوجوان شہزادہ تھا اور شاہی حرم سرا میں بے روک ٹوک آتا جاتا رہتا تھا' مہرو کو وہاں دیکھا ہو۔ محققین اس قسم کی ملاقات کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ پس اگر مہرو کے زمانہ دوشیزگی میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہے' تو کچھ بعید نہیں کہ اس ایرانی خاتون کے غیر معمولی حسن نے جہاں گیر کو اپنا والہ و شیدا بنا لیا ہو۔

دوسری بات' شہنشاہ اکبر کے فرمان کے تحت' مہرو کی شیر افگن سے شادی ہے تاکہ وہ جہانگیر کی دسترس سے دور ہو جائے۔ جہانگیر کا آخری سوانح نگار! بنی پرشاد اسے تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ نور محل جیسی عالی خاندان اور مہذب عورت سے جہانگیر کی شادی پر اکبر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟!

لیکن مشہور ہے کہ ایک اور لڑکی: انارکلی کو اکبر نے محض اس شبہ پر زندہ دیوار میں چنوا دیا تھا کہ وہ جہانگیر سے رسم و راہ رکھتی ہے اور جہاں گیر نے لاہور میں اس کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ اگر اکبر کو مہرو جیسی حیثیت کی عورت سے جہانگیر کی شادی پر کوئی اعتراض نہ بھی ہو' تو بھی سینکڑوں میں سے ایک نہ ایک سبب کی بناء پر ہو سکتا ہے کہ وہ اس خاص شادی کو پسند نہ کرتا ہو۔ یہ باور کر لینا بہت آسان ہے کہ خود اکبر نے نور محل کو رستے سے ہٹانے کے لئے' اس کی شادی ایک عام آدمی سے کرا دی' بمقابلہ اس کے کہ

نور محل کے ماں باپ اپنی بیٹی کی شادی شیر افگن سے کرنے پر تیار ہو گئے' جو اس وقت فوج میں ایک قسمت آزما سپاہی سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

نور محل کی شب سواریاں

قدامت پرست مسلمان آج بھی برسرعام گھر کی عورتوں کا نام لینا یا ان کے متعلق کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جب کوئی ترک اپنی بیوی کی اچھی صحت یا موت کا ذکر کرے گا' تو "اہل خانہ" کہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین حرم کی زندگیاں بالعموم تاریخ کی کتابوں میں بار نہیں پاتیں۔ تاریخ میں ان کے نام کی بجائے فلاں شہزادے کی ماں یا فلاں امیر یا شہزادے کی بیٹی آتا ہے۔ نور محل کے معاملے میں بھی ابتدائی معلومات محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ پردے کی چاردیواری سے باہر آتی اور امور مملکت میں حصہ لیتی ہے۔ اس کا ذکر تحریروں میں آنے لگتا ہے۔ چنانچہ جہانگیر تزک میں اس کے ساتھ اپنی شادی کا ذکر تک نہیں کرتا۔ لیکن تزک کے آخری صفحات نور محل کے کارناموں سے گراں بار ہیں۔

ہمارے پاس ہم عصر تذکرہ نویسوں کے لکھے ہوئے حالات بھی موجود ہیں۔ مثلاً معتمد اور سرٹامس رو کی شہادت اور اس کے ساتھ ولندیزی سائنس دان ڈی لائٹ کا بیان' جو ۱۶۴۱ء میں سپرد قلم کیا گیا۔ لیکن یہ تمام چیزیں اندازاً ۱۶۱۶ء سے ۱۶۲۷ء تک کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں' جو نور محل کے عظمت و اقتدار کا زمانہ تھا۔

چنانچہ اس کتاب کے ابتدائی ابواب بکھری ہوئی شہادتوں کا مجموعہ ہیں اور آخری ابواب ---- خسرو کے قتل کے بعد سے ---- قریب قریب مکمل طور پر تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نور محل اکثر و بیشتر رات کے وقت حرم سے نکل جاتی تھی۔ لیکن یہ تقریباً یقینی ہے کہ وہ ایسا کر لیتی تھی۔ مشہور ہے کہ وہ من چلی تھی اور اپنی ابتدائی زندگی میں سفر کی عادی رہی تھی۔ وہ بخوبی گھوڑے کی سواری کر سکتی تھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر دور دور تک جاتی تھی۔ پردے کے قانون کے متعلق اس کے تصورات' حرم میں پلی بڑھی ہوئی دوسری ہندوستانی خواتین کے تصورات سے مختلف تھے۔ البتہ

"جھروکے" میں وہ ہمیشہ نقاب ڈال کر نمودار ہوتی تھی اور درباریوں سے بات چیت بھی کر لیتی تھی۔ سرٹامس رو کا بیان ہے کہ ایک رات اسے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گھنٹوں ایک خیمے میں انتظار کرنا پڑا۔ اس لئے کہ نور محل' جہاں گیر کو ایک رتھ میں جسے وہ خود چلا رہی تھی' سیر کو لے گئی تھی۔ وہ ہر جگہ لشکر کے ساتھ جاتی' جب کہ قلعہ کانگڑہ اور مرغزار ہائے کشمیر کے' سفر میں! اور کبھی کبھی' جہانگیر کے ہمراہ' گھوڑے پر سوار ہو کر' چھوٹی موٹی تفریحی مسافتوں پر بھی نکل جاتی تھی۔ آخرا" جب مہابت خاں نے جہلم کے مقام پر اچانک حملہ کر کے جہاں گیر کو اپنی حراست میں لے لیا' تو نور محل بھیس بدل کر' ایک خواجہ سرا کے ہمراہ مہابت خاں کے لشکر سے فرار ہو گئی اور بہ حفاظت دریا عبور کر لیا۔ ایک ایسی عورت' جس نے اپنی ساری عمر پردے میں گزاری ہو' وہ یہ ہمت کبھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کے شیر کے شکار کا واقعہ بالکل سچ ہے۔ کم سے کم وہ ایک بار اور جہاں گیر کے ساتھ شکار میں گئی اور جہاں گیر کے بیان کے مطابق اس نے چھ گولیاں چلا کر چار شیر مارے۔ اس زمانے کی بنی ہوئی بندوق کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ واقعہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شکار کے معاملے میں جہاں گیر کی کہی ہوئی باتیں مسلم ہیں۔

یہ فرض کرنا غلط ہو گا کہ حرم سرا کی عورتیں مستقل طور پر کمروں میں بند رکھی جاتی تھیں۔ وہ مسجدوں اور حماموں یا ---- معقول پہرے میں ---- سفر یا اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے جا سکتی تھیں۔ مسلمان ہمیشہ سیر و سیاحت کے شوقین رہے ہیں اور گرم ملکوں میں' جہاں آدھی رات سے پہلے نیند آنی بہت مشکل ہے' خواتین اکثر' خدام کے ساتھ' رات کے وقت ہوا خوری کو نکل جاتی تھیں۔

شعر و شاعری

جہاں گیر کوئی عام پینے والا نہ تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور ترشا ترشایا انسان تھا' جو تین زبانیں بولتا اور دو زبانوں میں لکھ پڑھ سکتا تھا۔ وہ تاریخ اور جغرافیہ کی اچھی معلومات رکھتا تھا اور علم نباتات و حیوانات سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ بعض اوقات اس کے تجربے بڑے حیرت آفریں اور اس کے ساتھ ساتھ نازک اور درست ہوتے تھے۔

قیمتی پتھروں سے شغف کے پہلو بہ پہلو اسے باغات سے دلی محبت تھی اور اس کی تزک پھولوں اور جھیلوں کی فلمی تصویروں سے بھری پڑی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مصوری کا بھی رسیا تھا۔ اس کے اور شاہ جہاں کے عہد حکومت میں مغل فن مصوری اپنی معراج کو پہنچ گیا تھا اور ان کے معماروں نے اس دور میں چند ایسی عمارتیں پایہ تکمیل کو پہنچائیں' جنہیں ہندوستان کے اسلامی عہد کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ان میں تاج محل خاص طور پر گل سر سبد کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندوستان فتح کرنے سے پہلے بھی مغل بڑے ذہین اور تنوع پسند تھے' جن میں شجاعت و فراست کے ساتھ ساتھ مے نوشی کی کمزوری بھی تھی۔ تقریباً ایک صدی تک جہاں گیر کے اسلاف' ہندوستان کی تہذیب اور ایران کے شاعروں اور فن کاروں کے جھرمٹ میں رہے اور یہی مشرق کے دو ملک ہیں' جنہوں نے یونانی تہذیب کا چراغ روشن رکھا۔ جہاں گیر' افلاطون اور ارسطو' دونوں سے آشنا تھا اور اس کا ذاتی مرقع' ڈیوار اور اطالوی مصوروں کے شاہکاروں سے مزین تھا۔

اس کا دربار' فطری طور پر' شعر و ادب کا مرکز بن گیا تھا اور شاید ہی کوئی امیر یا ندیم ہو' جو فی البدیہہ شعر نہ کہہ سکتا ہو' یا برمحل' حافظ کا کوئی شعر نقل نہ کر سکتا ہو۔ جہاں گیر خود بھی شعر کہہ سکتا تھا' لیکن اس کے اشعار میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس کے برعکس' معلوم ہوتا ہے کہ نور محل کو شعر گوئی کا خاص ملکہ حاصل تھا۔

خافی خاں کے تذکرہ میں نور محل کے بعض اشعار منظر عام پر آئے اور ---- غالباً

پہلی بار ۔۔۔۔ اس کتاب کے لئے انگریزی زبان میں ترجمہ کئے گئے ایک دن جہاں گیر ایک ایسے چغے میں نمودار ہوا' جس کے تکمے گراں بہا یاقوتوں سے بنائے گئے تھے۔ جہانگیر نے نور محل کی توجہ ان تکموں کی طرف مبذول کرائی اور نور محل نے ان کے متعلق ارتجالاً یہ شعر کہا :۔

ترا نہ تکمۂ لعل است' بر لباس حریر
شدہ است قطرۂ خون منت گریباں گیر

اس کا ایک یہ شعر بھی نقل ہوا ہے :۔

دل بہ صورت ندہم تاشدہ سیرت معلوم
ہندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم (۱۷)

شعر و شاعری سے جہانگیر کی غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے ایک سنگین تالاب کے ستون پر کسی "نامعلوم الاسم" شاعر کی ایک رباعی کندہ دیکھی' جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ عمر خیام کی بہترین رباعیوں میں سے ایک رباعی ہے۔ اور اس کو بہت پسند آئی۔

نور محل کی حوصلہ مندی

"سیزر جاہ طلب تھا۔" یہ بات نور محل پر بالکل صادق آتی ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے کو' بغیر کسی مزید فکر و تامل کے' نور محل کے کردار کا پیمانہ بنا کر اس کے تمام اعمال اس سے ناپے جا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت اتنی صاف' سیدھی اور روشن ہے کہ اس کے ہمعصر وقائع نگاروں سے لے کر' جو اس کے مخالف تھے' اس کی موت کے بعد آنے والے مورخین تک نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ بنی پرشاد' جس نے جہاں گیر کے سوانح حیات بڑی تحقیق و تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ "وہ بڑی حوصلہ مند اور طبعاً" ہر موقع پر چھا جانا پسند کرتی اور غیرشعوری طور پر تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔"

یہ بات اگرچہ صحیح ہے' لیکن تمام تر صداقت نہیں۔ نور محل' دنیا کی گنی چنی شاہی بیگمات کی طرح' ہمہ گیر صلاحیتوں کی مالک تھی۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ چند سرحدی بستیوں سے قطع نظر' اس کا ایجاد کردہ ملبوساتی فیشن' اس کی موت کے سو برس بعد بھی' آج تک رائج ہے۔ پھر ہر طبقے کی عورتوں سے جو خوش سلوکی اور احسان و خیرات کا اس نے برتاؤ کیا' وہ عہد مغلیہ کی خوشگوار یادگاروں میں سے ہے۔ بنی پرشاد کہتا ہے کہ کوئی یتیم لڑکی نہیں' جس کا ذکر سن کر نور محل نے اس کی شادی کے اہتمام و انصرام میں حصہ نہ لیا ہو اس نے ایک ایسے شاہی محل کی مجلسی زندگی پر فرماں روائی کی' جو تاریخ عالم کی عیش کوشیوں اور عشرت آرائیوں کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس نے کم سے کم دو مقبروں کا ---- ایک آگرہ میں اپنے باپ اعتماد الدولہ کا اور دوسرا لاہور میں اپنے شوہر: جہانگیر کا ---- منصوبہ تیار کیا' جو فن تعمیر کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

نور محل نے جتنے کام کئے' مقصدیت اور اعلیٰ نصب العین کی شدت ان سب میں جھلکتی ہے۔ اس نے' وزارت اور دیوانی کے فرائض میں' اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا اور اس کی

موت پر نور محل کا غم و الم ناقابل انکار ہے۔ وہ اپنے زسرتاپا ضمیر فروش اور جاہ طلب بھائی : آصف خاں پر بھروسا نہ کرتی تھی' جس نے کم سے کم دو دفعہ اس سے دغا کی۔ پہلی دفعہ جہلم میں' جب اس نے نور محل اور جہانگیر کو مہابت خاں کے حوالے کرنا چاہا اور دوسری دفعہ جہانگیر کے انتقال کی رات' جب اس نے اپنی بہن کو قید کر دیا' نور محل چاہتی' تو اپنے بھائی کو دھوکے سے مہابت خاں کے حوالے کر کے' نابود کر سکتی تھی۔ لیکن جہانگیر کو آزاد کرانے کے بعد' اس نے آصف خاں کی رہائی کے لئے پوری کوشش کی اور یہ باور کرنا دشوار ہے کہ اگر وہ لشکر میں خانہ جنگی برداشت کر لیتی' تو جہانگیر کی موت کے بعد قید سے فرار نہ ہو سکتی تھی۔

شہزادہ خسرو کے قتل تک اس نے خرم سے خوشگوار تعلقات برقرار رکھے اور اس کے بعد وہ اسی شدت سے اس کی مخالف بھی ہو گئی۔ جہلم کی لڑائی تک وہ مہابت خاں کی بھی پرخلوص اور ثابت قدم حلیف رہی۔ وہ چاہے جتنی جاہ پسند' سیماب صفت اور خودپرست ہو' لیکن جہاں گیر اور اپنے داماد : شہریار کی موت کے بعد تمام اختیارات سے دست کش ہو گئی۔

موضوع کی حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے بہتر ہے کہ ایک متاخر وقائع نگار کی' نور محل کے متعلق' رائے پر نظر پر ڈال لی جائے۔

> "..... ہزار افسوس! کہ اس تمام تر ذہانت کے باوجود جب اس نے اپنی بیٹی ---- جو شیرافگن کے سلب سے تھی ---- شادی جہانگیر کے بیٹے! شہریار سے کی' تو اس محبت کے پیش نظر' جو ہرماں کو اپنی بیٹیوں کی خاطر اپنے دامادوں سے ہوتی ہے اور اس خود غرضانہ حسد کی بنا پر' جس کے تصور سے' قوی بازو سے قوی بازوئے مرد بھی لرز اٹھتا ہے' اس نے شہریار جیسے سیدھے سادے شہزادے کو ایک طاقتور ولی عہد سے ٹکرا دیا ..... اور بغیر اس کے کہ مستقبل کے متعلق کچھ سوچتی' یا تخت و تاج کی برہم خوردگی کا خیال کرتی یا بدقسمت رعایا پر رحم کھاتی' اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ کر ہندوستان میں ایک عظیم طوفان برپا کر دیا۔ (۱۸)

وقائع نگار کی نگاہ میں نور محل کا جرم یہ تھا کہ اس نے طاقتور خرم کے مقابلے میں جو

خون کی ندی سے گزر کر تخت تک پہنچا تھا' سیدھے سادے شہریار کی مدد کی۔ خرم کی تخت نشینی کے کئی برس بعد ایک غیر جانب دار گواہ ڈی لائٹ لکھتا ہے۔

"یہ پیش گوئی کرنا آسان ہے کہ وہ حکومت' جو اتنے جرائم کے بعد حاصل کی گئی ہو کبھی خوش انجام نہیں ہو سکتی اور جو تخت اتنے معصوموں کا خون بہا کر استوار کیا جائے' وہ کبھی ثابت و دائم نہیں رہ سکتا۔"

واقعہ یہ ہے کہ شاہ جہاں اپنی موت سے آٹھ برس پہلے اپنے بیٹے : اورنگ زیب کے ہاتھوں تخت سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں جو سازشوں اور خانہ جنگیوں کی وبا پھیلی۔ وہ سب جانتے ہیں اور انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

وہ دربار جو نور محل کے حسن و قابلیت کے زیر فرمان تھا' اسی طرح سازشوں اور سیہ کاریوں کی آماج گاہ بن گیا تھا' جس طرح قیاصرہ کے زمانے میں روم یا آخری دمے لوئی کے زمانے میں فرانس' لیکن وقائع نگاروں میں سے جو نور محل کے دشمن تھے' وہ بھی اس پر یہ الزام عائد نہ کر سکے کہ اس نے اپنے کسی مخالف کو زہر دلوایا یا قتل کرایا ہو' جو قلابطرہ اور کیتھیرین ڈی سے ڈی چی کا عام شعار تھا' اور نہ کسی کو جہانگیر کے ساتھ اس کے خلوص میں کبھی شبہ گزرا۔

اس عیش پسند شہنشاہ کے متعلق وہ کیا محسوس کرتی تھی؟ــــ آیا وہ اس کی نفس پرستانہ محبت کا جواب نفس پرستانہ محبت سے دیتی تھی' یا اس کی حفاظت و نگرانی بھی اسی مامتا کے ساتھ کرتی تھی جس مامتا کے ساتھ اپنی بیٹی کی ---- یہ ہم نہیں جانتے! یہ اس کے بہت سے رازوں میں سے ایک راز ہے۔

جہانگیر بیوقوف انسان نہ تھا۔ اسے پیچھے پیچھے تو چلایا جا سکتا تھا ہانکا نہ جا سکتا تھا۔ نور محل کے حرم شاہی میں آنے سے پہلے کوئی اس پر حکومت نہ کر سکا تھا اور خود نور محل بھی محض جہانگیر کے جسمانی تقاضوں کے سہارے اس پر غالب نہ آ سکی۔ جہانگیر نے اس کے وجود میں ایک ایسی دلکش عورت پائی' جو اس کے مزاج کو سمجھتی اور اسے حکومت کے درد سر سے بچاتی تھی۔ جہانگیر میں مختلف دلچسپیوں کی جو شدید لہر پیدا ہوتی اس کی آسودگی کا انتظام کرتی اور اس کی تنوع پسندی کی رعایت سے ماحول کو سازگار بناتی تھی' جب تک جہاں گیر کی جسمانی قوتیں بالکل ہی جواب نہ دے گئیں۔ نور محل نے بظاہر حکومت کی ذمے

داری کلیتہ" اپنے ہاتھ میں نہ لی۔

وہ ایک عورت تھی' جسے آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ایک نصب العین کے لئے کوشاں تھی یا شاید اس کے دل میں یہ خالصتہ" انسانی خواہش چٹکیاں لے رہی ہو کہ وہ مردوں کی دنیا میں اپنی ایک الگ زندگی بسر کرے۔ وہ آخری دم تک کسی مرد کے سامنے سپر انداز نہ ہوئی۔ اس کا سیاسی اقتدار تین آدم کش ہستیوں : ہوش مند خرم' بیباک مہابت خاں اور خیانت کار آصف خاں کے ہاتھوں چھن گیا۔ لیکن ان تینوں کا خمیر عام مٹی سے بنا ہوا تھا۔

شاید اس کے ایک یورپی معاصر نے اس کے متعلق ایک بہت ہی جچی تلی بات کہی ہے:۔

"جب ہم اس کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے سوا ہمیں
اس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا کہ وہ ایک عورت تھی!"

تاخذ و شواہد

کوئی ایسا موضوع شاید ہی کسی لکھنے والے کو میسر آتا ہے' جو نور محل کی طرح اپنے اندر بہت سے پہلو رکھتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مغل ملکہ کی کوئی سوانح موجود نہیں کم سے کم مصنف کے علم میں ایسی کوئی کتاب نہیں' جو نور محل پر لکھی گئی ہو' یا کہیں اور اس کے مکمل حالات ملتے ہوں۔ یہاں تک کہ جن عام قصے کہانیوں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' ان کے سوا' اس کی زندگی کے دوسرے واقعات بھی دستیاب نہیں ہوتے' ہاں! تاریخوں میں چند ٹکڑے ضرور پائے جاتے ہیں' یا ہندوستان کے عام حالات سے متعلق جو تصانیف ہیں' ان میں کچھ مختصر سے خاکے ہیں۔

چند سال کی بات ہے' میں نے ارادہ کیا کہ نور محل کے حالات زندگی معاصرانہ شہادتوں کی بنیاد پر مرتب کروں' چنانچہ وقتاً" فوقتاً" میں اس موضوع پر کام کرتا رہا اور رفتہ رفتہ میں نے تمام شہادتیں اپنے کتب خانے کی الماریوں میں فراہم کر لیں۔ اس وقت یہ سب کی سب' ایک تین سو سال پرانے بادامی چڑے کی کرم خوردہ جلدوں میں' میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نیلے رنگ کے پشتوں والی' قدیم طرز کی' رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی کتابیں اور کچھ بلیو تھیکا انڈیکا کی جلدیں ہیں' جو کارنل یونیورسٹی لائبریری کی عنایت سے مجھے مستعار ملی ہیں۔ اس کے علاوہ خافی خاں کے ترجمے کا مسودہ بھی ہے۔ ان اوراق میں نور محل کی زندگی کے اجزاء دفن ہیں۔

پس منظر:۔

میری سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ مغلیہ دربار اور اس کے امراء کو بالکل اسی طرح پیش کروں' جیسے کہ وہ اس وقت تھے' جب نور محل دربار میں داخل ہوئی تھی۔

اس مقصد کے لئے ابوالفضل گراں قدر رہنما ثابت ہوا۔ وہ اکبر کا وزیر تھا' جسے جہاں گیر نے قتل کرا دیا۔ اس نے حکومت مغلیہ کی تمام جزئیات بیان کرنے کے علاوہ شاہی لشکر

کا پورا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کی تصنیف، جس کا نام "آئین اکبری" ہے۔ بلاغ مان کے قلم سے، فارسی سے انگریزی میں منتقل ہو گئی ہے۔ تحقیق و تلاش سے دلچسپی رکھنے والوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ مرتب نے اکبر کے خاندان کے تمام افراد اور امرائے دربار کے سوانحی ٹکڑے بھی شامل کر دیئے ہیں۔

اس کے بعد ایک مختلف پہلو آتا ہے: جہاں گیر کے پردادا بابر کی بہار آفریں تزک، جو اپنی جگہ ایک شاہکار ہے اور جس میں ۱۵۲۷ء تک ہندوستان کے ایک فاتح کی مہمات درج ہیں۔ اس کے ساتھ میں نے "ہمایوں نامہ" بھی پڑھا، جو بابر کی ایک بیٹی: گل بدن بیگم کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں گل بدن بیگم نے ان عورتوں کی دنیا کا مختصر سا رنگین تذکرہ لکھا ہے، جو بابر کے بیٹے اور ہندوستان کے بادشاہ: ہمایوں کی جہاں گردیوں میں اس کے ساتھ رہیں۔ اس مطالعہ سے نہ صرف عورتوں کی کئی تکلیفوں اور تقریبوں کا انکشاف ہوتا ہے، بلکہ دو تاتاری بیگمات: سلیمہ اور رقیہ بھی سامنے آ جاتی ہیں۔

ہم عصر گواہ:۔

سب سے بڑا گواہ جہاں گیر کو ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ اپنی تزک میں، آخری پانچ سال کے وقائع سے قطع نظر، اپنی بیگم کا ذکر ہی نہیں کرتا اور ایک مسلمان بادشاہ سے یہ بات ہے بھی عجیب کہ وہ اپنی بیوی کے متعلق کچھ لکھے۔ اس کے باوجود تزک جہاں گیری میں شہنشاہ کے ذہن و مزاج کی عدیم المثال جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے بعض حصے مثلاً شیر کا پہلا شکار وغیرہ دراصل تزک سے لے کر اپنی زبان میں نقل کر لئے گئے ہیں۔

دوسرا گواہ معتمد ہے، جو شہنشاہ کا منشی اور بخشی تھا۔ اس کی تصنیف: "اقبال نامہ" میں حکومت کے غیر مرتب واقعات ہیں اور اس نے نور محل کا ذکر بدگوئی کے ساتھ کیا ہے۔ اقبال نامہ میں اس عہد کے بعض فارسی مصنفین کے بیان کئے ہوئے واقعات بھی اضافہ کئے گئے ہیں۔ جن میں ایک خادم کی قیمتی تحریر بھی ہے۔ جس سے جہاں گیر کے روزمرہ کے معمولات پر روشنی پڑتی ہے اور مہابت خاں کے اس خط کا خلاصہ بھی ہے، جو اس نے نور محل کے خلاف بطور احتجاج لکھا تھا۔

یورپی گواہوں میں میرا خاص اور محبوب گواہ سائنو ریپڑو ڈلا ویلے ہے، جو ایک شریف النسب اور مہم پسند انسان تھا اور جس نے خودکشی کرنے کے بجائے مشرق کا سفر کیا اور ترکی

اور ایران کی جنگوں میں بھی شرکت کی۔ دوران سفر میں اس نے دو شادیاں کیں اور اس کی دوسری جارجیائی بیوی کے بطن سے اس کے ہاں چودہ لڑکے ہوئے۔

سب سے اہم گواہ سرٹامس رو ہے' جس کا رسالہ "مغل اعظم کے دربار میں سرٹامس رو کی سفارت" کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ بہترین سفیر تھا' جس نے سب سے پہلے انگلستان سے ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے دربار' لشکر اور جہانگیر سے اپنے معاملات کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد' شہزادہ خرم کے اخلاق و کردار کا ایک نفیس اور عمدہ خاکہ بھی قلم بند کیا ہے۔

دوسرا غیر جانب دار گواہ ایک ولندیزی ہے۔ لیکن وہ عالم زیادہ ہے' جس نے ڈی لائٹ کی تصنیف "مغل اعظم کی سلطنت" کو اس حیثیت سے بیش قیمت پایا کہ اس میں آگرہ کے محلات کی تصویر اور جہاں گیر کے عہد حکومت کے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پلسائرٹ ایک دوسرا ولندیزی ہے' جس نے "ریمانسٹرینٹی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں ہندوستان کی تجارت کا خشک بیان ہے۔ لیکن اچانک وہ حرم کی زندگی کی بڑی حیرت انگیز اور واضح تصویر کشی شروع کر دیتا ہے' جسے اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

پادریوں نے بھی چند چیزیں لکھی ہیں۔ پادری گرلے رو نے اپنی کتاب "روابط" میں جہاں گیر کے حالات اور پادریوں سے اس کی بات چیت کا ذکر کیا ہے۔

اگلا گواہ انگریز سمندر گرد ملاح : ولیم ہاکنز ہے' جو ۱۶۰۷ء سے ۱۶۱۲ء تک ہندوستان میں رہا۔ وہ جہاں گیر کا جلیس و ندیم تھا۔ اس نے دربار کے آداب و مراسم کی بہ حیثیت مجموعی ایک واضح نقشہ کشی کے علاوہ وہ ہوش ربا داستانیں بھی لکھی ہیں' جو اس کے سننے میں آئیں۔

پادری ایڈورڈ میری نے' جو انگریز سفیر سرٹامس رو کے ساتھ ہندوستان آیا تھا' اپنی کتاب "مشرقی ہند کا سفر" میں' جو کچھ اس نے مغلیہ سلطنت میں دیکھا' اس کا مکمل حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ طاعون' اور کوچ کے وقت لشکر کے کوائف بھی سپرد قلم کئے ہیں۔

یہ ساتوں یورپی مصنف ایک دوسرے سے مشابہ ہیں ---- انہوں نے نور محل کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا' وہ محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے (ہاکنز تو شہنشاہ سے نور محل کی شادی ہونے سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ چکا تھا) لیکن اس وقت کی یہ سنی سنائی باتیں بھی بڑی دلکش ہیں اور کبھی کبھی درست بھی ہوتی ہیں۔

دوسرا عہد حکومت :۔

خافی خان کی فارسی تصنیف : "منتخب اللباب" جزوی طور پر اس کتاب کے لئے ترجمہ کی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس وقائع نگار نے بھی نور محل کے متعلق وہی کہانیاں دہرائی ہیں۔ تاہم اس میں جو معلومات ہیں' وہ اور کہیں نہیں ملتیں اور صریحاً درست ہیں۔

یورپی سیاحوں نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔ پیٹرمنڈی نے' جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک اہم عہدہ دار تھا' اورنگ زیب کے عہد حکومت کے شہروں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فرانکوائے برنیر نے' جو ایک فرانسیسی طبیب تھا۔ دنیا کا ایک بہترین سفرنامہ لکھا ہے' جس میں ہندوستان کی شہری زندگی' لشکر اور کشمیر کی تفریح گاہوں کی بڑی رنگین تصویریں کھینچی گئی ہیں۔

موسیودی تھیونیو ایک غیر معمولی ذہن کا مالک ہے۔ اس نے مشرق قریب کے رستے ہندوستان کا سفر کیا اور راستوں کی تمام سراؤں اور رسم و رواج کا بڑی تفصیل سے تعارف کرایا ہے' اس کی ضخیم کتاب میں' جو پرانی چرمی جلد میں مجلد ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کی ان ممالک کی زندگی کا' قریب قریب مکمل پس منظر پیش کیا ہے۔ ایک اطالوی طبیب : نگولاؤ منوچی نے اپنے سفرنامہ : "سٹوریودی موگور" میں حرم کی خواتین کے علاج معالجہ کے متعلق بعض دلچسپ تجربات قلم بند کئے ہیں لیکن اس کی سنی سنائی باتیں ناقابل اعتبار ہیں۔

عہد حاضر کے تین مورخ اہم ہیں۔ جیمز ٹوڈ اپنی مشہور تصنیف : "راجستھان کے واقعات اور آثار سلف" میں وہ تمام معلومات پیش کر دیتا ہے' جو راجپوتوں کے متعلق کسی کو مطلوب ہو سکتی ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ کی "حیات اکبر" اس شہنشاہ کی بہترین سوانح اور بنی پرشاد کی "تاریخ جہانگیر" اس شہنشاہ کی تنہا قابل اعتماد داستان حیات ہے اور راقم سطور کے لئے بے حد مفید و کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ کسی تذکرے اور تاریخ میں ہمیں جہاں گیر کا یہ شعر نہیں ملا۔ اس لئے ناچار ترجمہ پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

۲۔ اس مضمون کا بھی کوئی شعر معاصر تاریخوں میں دستیاب نہیں ہوا۔

۳۔ جہاں گیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ دانیال نے ذیل کا شعر کہہ کر اس بندوق پر کندہ کرایا تھا۔

از شوق شکارے تو سود جہاں تر و تازہ
بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ و جنازہ

۴۔ تاریخ میں ارجمند شہزادی ممتاز محل کے نام سے مشہور ہے جو شاہ جہاں (شہزادہ خرم) کی محبوب بیگم تھی۔ تاج محل کی نادرہ روزگار عمارت اس کے مقبرہ کے طور پر بنائی گئی ہے۔

۵۔ عورتوں میں اس قدر ہنر و قابلیت کم جمع ہوتے ہیں...... ساٹھ سال کی عمر میں رحمت خداوندی سے ہم آغوش ہوئیں۔ اسی دن باغ دھرہ سے کوچ ہوا۔ میں نے اعتمادالدولہ کو تجہیز و تکفین کے لئے روانہ کیا اور فرمایا کہ منڈاکر کے باغ کی عمارت میں 'جو خود انہی کا بنوایا ہوا ہے' انہیں دفن کیا جائے۔

۶۔ مصنف نے شاعر کا نام لکھا 'نہ حوالہ دیا۔ اس لئے مجبوراً شعر کے ترجمے پر قناعت کرنی پڑی۔

۷۔ حوالے کے بغیر اس شعر کی تلاش میں بھی کامیابی نہ ہو سکی۔

۸۔ مصنف نے اس شعر کا جو مفہوم انگریزی زبان میں نقل کیا ہے 'اس کا ترجمہ یہ ہے جس طرح وہ اپنے ہاتھ سے شیر کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے 'اسی طرح مرد بھی اس کی نگاہوں سے زندہ نہیں بچ سکتے 'میرے نزدیک مصنف سے شعر کا مطلب سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ ورنہ نور جہاں کے متعلق اس کے سوا اور کوئی شعر نظر سے نہیں گزرا۔

۹۔ جہانگیر انفلوئنزا میں مبتلا تھا جو عین اسی زمانے میں جب آگرہ میں طاعون کا زور تھا 'پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ اس کے علاوہ جہانگیر کو دمے کی بھی شکایت تھی۔

۱۰۔ اپنی جمع کی ہوئی چیزوں کا مزہ چکھو!

۱۱۔ قیم نے متن میں اسے حافظ کا مصرع بتایا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے اور خود نور جہاں کا مصرع ہے۔

۱۲۔ اس مضمون کا کوئی شعر معاصر تاریخوں میں دستیاب نہیں ہوا۔

۱۳۔ توزک جہاں گیری

۱۴۔ نور محل سے متعلق مواد جمع کرتے وقت مصنف نے خافی خاں کی "منتخب اللباب" کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ 'جو نور محل اور جہاں گیر سے تعلق رکھتا تھا 'پہلی بار براہ راست فارسی سے 'اپنی نگرانی میں 'کیلی فورنیا یونیورسٹی سے کرایا تھا۔ مصنف نے خود بھی فارسی زبان سے مزید ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ صرف فارسی ہی وہ زبان ہے جس میں مغلیہ دور کی تمام دستاویزیں اصلاً" لکھی گئی ہیں۔

۱۵۔ توزک جہاں گیری

۱۶۔ اس زمانے میں وہ بلاشبہ شہزادہ سلیم تھا۔ جہاں گیر کا لقب اس نے اپنی تخت نشینی کے بعد اختیار کیا تھا لیکن اس کتاب کی طرح 'جہاں بہت سے مشرقی ناموں سے واسطہ پڑتا ہو وہاں ان کی تبدیلی مغالطہ و اشتباہ کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ شہنشاہ کو ہم نے شروع سے آخر تک جہانگیر ہی کے نام سے یاد کیا ہے اور شہزادہ خرم کو اس کے لقب شاہجہان سے صرف آخر میں موسوم کیا ہے۔ مہابت خاں اور آصف خاں اپنے ناموں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ البتہ غیاث بیگ کو کہیں کہیں "اعتماد الدولہ" لکھا گیا ہے---- یہ سب کے سب نام تاریخی ں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے معلوم و مانوس ہیں۔

۱۷۔ قیم نے اپنی کتاب میں صرف پہلے مصرع کا ترجمہ دیا ہے:۔

۱۸۔ یہ خافی خاں کی منتخب اللباب کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ ہے۔